احوال و افکار و آثار

شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری

ڈاکٹر محمد عرفان

یہ کتاب
فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اتر پردیش لکھنؤ
کے مالی تعاون سے شائع ہوئی

ساقیا عیب است در شرب مدام آفتاب	از کجا خالی شود لبریز جام آفتاب
در خمارم ماند و مستانه از من بگذرد	آنکه گرداند پی هر ذره جام آفتاب
داغ سودای گلی دارم که از تمکین حسن	شبنم باغش نمیگیرد سلام آفتاب
شیر مست فیض عام او بود ذرات دهر	از کواکب زان بلند افتاد نام آفتاب
مستی موهوم چون کم است [illegible]	رفتن صبح است بیداری سلام آفتاب
برق آهم شستی نگذاشت در گلزار دهر	ملتی شد زیر چمن جا نیست دام آفتاب

چند از چشمش صفای دقت عالی فطرتان
سیر دارد افسرین مهتاب بام آفتاب

با شرم آن نگه زنت بحیا شراب	در دور نرگس تو کجا ما کجا شراب
افیان در رکاب همای سیاره است	بر تنگنای عیش کنه باد منتا شراب
کیفیتی بآن لب میگون نمیرسد	بیقدر گشت چو آب فتاد از بها شراب
خواهد قبول آن لب میگون کو سکند	پیوسته از دعای قدح النجا شراب

دیوان شاہ آفرین (مخطوطہ برٹش میوزیم) کے صفحہ ۱۴۲ کا عکس

پہلا ایڈیشن: ۱۹۸۶ء

کاتب: انصار احمد عمری

مطبع: نکھار پریس، مئو

تعداد کتاب: چھ سو (۶۰۰)

ناشر: ڈاکٹر محمد عرفان

دستیاب • مکتبہ جامعہ لمیٹڈ۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی
• نیو کتاب منزل۔ تاتار پور۔ بھاگل پور
• بک امپوریم، سبزی باغ۔ پٹنہ

تقسیم کار:- نکھار پبلی کیشنز۔ مئو ناتھ بھنجن

Thesis approved for the Degree of Doctor of Philosophy in Persian by the University of Bhagalpur in 1981.

انتساب

▲ حضرت مولانا شہباز محمدؒ دیوری ثم بھاگلپوری

▲ حضرت مولانا فضل رحمٰنؒ گنج مرادآبادی

اور

▲ حضرت مولانا سید محمد علیؒ مونگیری کے نام

معنون کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہوں

بہ نعمت ہای تسلیم و رضا پروردہ ام خود را
بکامم آفریں شربت شود گر زہر ناب آید (شاہ آفریں لاہوری)

محمد عرفان

فہرست

دیباچہ

منم از گلشنِ ہند آفریں رنگین نوا بلبل
اگر شد صائبِ شیریں سخن در اصفہاں پیدا
(شاہ آفریںؔ)

تقریباً آٹھ سال بیشتر استاذی محترم ڈاکٹر عبدالغفار انصاری صدر شعبۂ فارسی، بھاگل پور یونیورسٹی نے مجھے شاہ فقیر اللہ آفریںؔ لاہوری پر مقالہ لکھنے کے لئے مشورہ دیا تھا لیکن میری راہ میں دشواریوں کا پہاڑ حائل تھا اور یہ کام مجھے تقریباً ناممکن نظر آتا تھا۔ اتفاق سے ایک دن میری نگاہ کتب خانہ خدا بخش میں شاہ آفریں کے عزیز ترین شاگرد عبدالحکیم حاکم لاہوری کے تذکرہ 'مردم دیدہ' پر پڑی جس نے میرے جذبۂ شوق کو بیدار کیا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ بیشتر شاگرد ہی اپنے استادوں کے نام کو اُجاگر کرتے ہیں۔ حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ میں اپنے استاد شاہ آفریں لاہوری کے حالات قلمبند کر کے حق شاگردی ادا کیا، ورنہ شاہ آفریں کی زندگی کے بعض اہم گوشے پردۂ خفا میں رہتے۔ لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آفریں کو بھی اپنے استاد گرامی سے متعلق بعض معلومات مہیا نہ ہو سکیں گرچہ وہ اپنے استاد کے یہاں اکثر و بیشتر جاتا تھا اور خود شاہ آفریں ہفتہ میں دو بار اس کے یہاں جاتے تھے۔ راقم حروف کو کسی بھی تذکرہ سے شاہ آفریں کے اہل و عیال کے کچھ حالات نہ مل سکے۔

فارسی کے بیشتر تذکروں میں شاہ آفریں کے حالات بہت مختصر ہیں۔ ایران اور ہند
جو تذکرے لکھے گئے ان میں ان کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ واله داغستانی[1]، آزاد بلگرامی[2]، آرزو[3]
مصحفی[4]، قدرت الله[5]، خوشگو[6] اور بھگوان داس ہندی[7] نے بھی ان کے متعلق تفصیل نہیں
لکھا۔ آتشکدہ جیسے مایۂ ناز تذکرہ میں شاہ آفریں کے ایک ہم زمان ایرانی شاعر کا ذکر
ہے لیکن شاہ آفریں لاہوری کے متعلق اس نے ایک سطر بھی نہیں لکھا۔ راقم حروف کے
سامنے دوسری دشواری یہ تھی کہ ہندوستان کے کسی بھی کتب خانہ میں شاہ آفریں لاہوری کے
دیوان یا کلیات کا نسخہ نہیں مل سکا۔ دنیا کے مختلف نامور کتب خانوں کے کیٹلاگ کے
مطالعہ کے بعد راقم حروف کو اس بات کا علم ہوا کہ ان کے دیوان کا ایک ہی نسخہ دنیا میں
دستیاب ہے (اب تک کی دریافت کے مطابق) جو برٹش میوزیم لندن میں ہے راقم حروف
نے اس نسخے کا زیروکس پرنٹ (xerox Print) کتاب خانہ مذکور سے حاصل کیا
کیونکہ اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ یہ نسخہ اس اعتبار سے بھی بہت اہم ہے کہ اس کی کتابت
۱۱۴۷ھ میں ہوئی تھی جب کہ شاہ آفریں حیات تھے۔ شاہ آفریں لاہوری اپنے دور کے
ایک ممتاز اور باکمال شاعر تھے لیکن فارسی شعر و شاعری سے تعلق رکھنے والے بیشتر
حضرات ان سے بے خبر ہیں۔ سراج الدین علی خان آرزو کو گرچہ ان سے مکاتبت تھی لیکن
اس نے بھی ان کے متعلق تیرہ سطر سے زیادہ نہیں لکھا۔ 'مسرت افزا' شاہ عالم ثانی کے
عہد کا ایک مشہور تذکرہ ہے لیکن ابوالحسن امیرالدین احمد نے ان کے متعلق ایک سطر بھی
نہیں لکھا۔ اس لئے راقم حروف کو شاہ آفریں کے حالات جمع کرنے میں نہایت دشواریوں
سے دوچار ہونا پڑا اور شہر شہر کی خاک چھاننی پڑی تب یہ مقالہ پایۂ تکمیل کو پہنچ سکا۔

شاہ آفریں لاہوری ایک جامع کمالات شخصیت کے حامل تھے۔ اس عالم فانی
میں کبھی کبھی ایسے لوگ جلوہ فرما ہوتے ہیں وہ ایک باکمال اور استاذ ہنر شاعر تو تھے ہی

---

[1] ریاض الشعرا [2] خزانہ عامرہ [3] مجمع النفائس [4] عقد ثریا [5] نتائج الافکار [6] سفینہ خوشگو [7] سفینہ ہندی

لیکن ایک عدیم النظیر مرد عارف بھی تھے ان کا یہ عقیدہ کہ قرب الٰہی عبادات و ریاضات کے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔ صرف اکتساب علم ہی کافی نہیں ہے بلکہ اصل شئی عمل ہے۔ ان کے ذیل کے شعر سے اس خیال کی وضاحت ہوتی ہے۔

بی عبادت کی شود حاصل شناسا قرب دوست   آفرین ماہ نو این عید محراب ست و بس[1]

وہ گرچہ جمع کمالات تھے اس کے باوجود ان کی فطرت میں خاکساری اور فروتنی بہت زیادہ تھی وہ غربا اور مساکین سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے لیکن امرار اور اغنیار سے گریز کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ توکل پیشہ انسان کے لئے اپنے گھر سے ایک قدم بھی باہر نکلنا برہنہ ہونے کے برابر ہے۔

بہ فتویٔ خرد از کشف عورت ہم بتر باشد   توکل پیشہ را یک گام بیرون نہ آستانِ خود[2]

شاہ آفرین کی شخصیت اپنے دور میں ایک مرشدانہ شخصیت تھی۔ انھوں نے اپنے دل کو حرص و ہوا سے پاک رکھا تھا جیسا کہ ان کے ذیل کے شعر سے بھی واضح ہوتا ہے:

بہ نعمت ہای تسلیم و رضا پروردہ ام خود را   بہ کامم آفرین شربت شود گر زہر ناب آید[3]

عشق الٰہی کی آگ مرنے کے بعد بھی سرد نہیں پڑتی۔ اللہ والوں کی قبر کی مٹی پر جو پھول اگتے ہیں اُن سے کباب کی خوشبو آتی ہے یعنی اُن کے عشق الٰہی میں جلے جسم کی خوشبو زمین پہ لگنے والے پھولوں میں پیوست ہو جاتی ہے ان کے ذیل کے شعر سے اس کی وضاحت ہوتی ہے:

بہ مردن ہم نمیرد آتش سوز دل عاشق
گلی گر ز خاک مشتاقان دمد بوی کباب آید[4]

شیخ سعدی کے ذیل کے شعر میں بھی تقریباً اسی طرح کے فلسفہ کو پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] دیوان شاہ آفرین ورق ۱۵۵ [2] مردم دیدہ ص ۲۰ [3،4] دیوان شاہ آفرین ورق ۱۳۴

زخاک سعدی شیراز بوی عشق آید

ہزار سال پس از مرگ او گرش بوئی

شاہ آفرین فارسی شاعری کی دنیا میں ایک درخشاں ستارہ تھے۔ حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ وہ اپنے وقت کے ایک جید اور فاضل عالم تھے۔ علوم عربیہ میں فارغ التحصیل اور علم رمل میں بھی دستگاہ رکھتے تھے۔ ان کو خود اس بات کا احساس تھا کہ ان کے مثل کم ہی لوگ وجود میں آتے ہیں۔ دنیا حضرت آدم علیہ السلام کی ایسی اولاد پر ابد تک فخر و ناز کرتی ہے:

تا ابد ناز بر آدم کند و جا دارد　　　پدری را کہ بود چون تو گرامی پسرش[1]

شاہ آفرین عشق رسول میں گم ہو گئے تھے ان کو سرکار دو عالمؐ سے بے پناہ محبت اور عقیدت تھی اس لئے عرفی شیرازی کے مشہور نعتیہ قصیدہ کے تتبع میں انہوں نے ایک قصیدہ کہا ہے جس کے چند اشعار قلمبند کئے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں ان کے شاعرانہ محاسن واضح طور پر نظر آتے ہیں۔

محمد عربی شاہ انبیا لشکر　　　ازل غلام ابد بندہ لامکان کشور

زحرص مدح تو با مصطفیؐ نہ اندرہ شعر

کنم زعرفی خوش نغمہ مطلعی مذکور

سخن بہ مدح تو گفتن نہ حد انسانست

وگرنہ شوخی طبعم نمی کند تقصیر

سر نیاز من و خاک پای آل تو باد　　　دو کون حلقہ بگوش تو و بلال تو باد[2]

نواب عبد الصمد خاں بہادر دلیر جنگ صوبہ دار لاہور نہایت متقی، پرہیزگار اور تہجد گزار تھے۔ وہ شاہ آفرین جیسے باکمال شاعر اور مرد عارف کی ملاقات کے مشتاق تھے۔ اس مقصد سے انہوں نے دو مرتبہ آدمی بھیجکر ان کو طلب کیا لیکن وہ ان سے

---

(۱) (۲) دیوان شاہ آفرین ورق ۱۶۶، ۲۶۸، ۲۷۱

ملنے نہیں گئے کیونکہ امراء اور اغنیاء سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بالآخر ایک عرصہ
سے جب شاہ آفرین کو یہ معلوم ہوا کہ وہ پابند شرع ہیں تب وہ ان سے ملنے گئے۔
نواب مذکور نے ایک روپیہ یومیہ وظیفہ سے ان کو نوازا[۱]۔ نواب مغفور ہی تنہا ان کے
محسن اور ممدوح تھے لیکن ان کی مدح میں بھی دو شعر سے زیادہ نہیں کہا۔ ذیل میں
وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جو ان کی مدح میں ہیں۔

گزند عاقبت یارب مباد اردمندان را　　سپند چشم زخم درد می سوزند درمان را
زمین و آسمان دست دعا شد آفرین من ہم　　نگہ دارد خدا از چشم بد عبد الصمد خان را[۲]

شاہ آفرین کے ہم عصر شاعر اور تذکرہ نگار بندرابن داس خوشگو نے بھی ان سے
شرف ملاقات حاصل کرنا چاہا تھا لیکن وقت کی تنگی کی وجہ سے وہ ان سے نہیں مل سکا۔
اس لئے اس نے آفرین کی مدح میں ایک غزل لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا تھا۔
ذیل میں اس غزل کا تین شعر نقل کیا جاتا ہے:

بر کمال آفرین باد از دو عالم آفرین
آفرین صد آفرین بل صد ہزاران آفرین
شاہ لاہور سخن ملا کہ بکاب ملک نظم
کز سیاہ لفظ و معنی کوس زد در روم و چین
ای زشاگردان درگاہ تو استادان وقت
کرد استاد جہان شاگرد رب العالمین[۳]

شاہ آفرین نے ۱۱۵۴ھ میں لاہور میں وفات پائی اور اپنے مکان میں مدفون ہوئے[۴]۔
شاہ آفرین کے دیوان میں جو برٹش میوزیم لندن میں ہے تقریباً چھ ہزار اشعار
ہیں اس نسخہ میں غزلیں، قصیدے، مخمس، ترجیع بند، اور رباعیاں بھی ہیں۔ انہوں نے

---

[۱] مردم دیدہ ص ۲۰ [۲] ۲۲ھ [۳] دیوان شاہ آفرین ورق ۲۷ [۴] سفینہ خوشگو ورق ۲۲۷ ب

شاعری میں مرزا صائب، خواجہ حافظ، شیخ سعدی، امیر خسرو، ناصر علی اور بیدل کے تتبع میں اشعار کہے ہیں ان کے ذیل کے شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ اگر صائب اصفہان کے شیرین سخن شاعر تھے تو وہ گلشن ہند کے رنگین نوا بلبل تھے:

منم از گلشن ہند آفرین رنگین نوا بلبل
اگر شد صائب شیرین سخن در اصفہان پیدا[۱]

شاہ آفرین لاہوری کے ہم عصر فارسی شعراء میں خان آرزو، والہ داغستانی، فقیر دہلوی، آزاد بلگرامی، شیخ حزین، عبدالقادر بیدل، قزلباش خان امید، سودا دہلوی، نظام الملک آصف جاہ، نورالعین واقف اور حاکم لاہوری وغیرہم تھے۔

راقم حروف نے نہایت عرق ریزی اور محنت سے اس مقالہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا ہے جس کا اندازہ قارئین کو ہوگا۔ اس کمترین نے زیادہ تر حالات فارسی کے ہم عصر تذکرہ نگاروں کے تذکروں سے یکجا کیے ہیں اور ان کے دیوان سے بھی بعض حالات حاصل کیے ہیں۔ کئی مقالوں سے بھی بعض معلومات ملی ہیں جن میں احوال و افکار و آثار علی قلی خان والہ داغستانی، میر شمس الدین فقیر دہلوی اور عماد الملک نظام اہم ہیں۔ تاریخ ہندوستان مؤلفہ الگزنڈر ڈو (Dow) مطبوعہ لندن ۱۷۹۲ء سے بھی راقم حروف نے بعض تاریخی معلومات فراہم کیں رضا لائبریری رام پور، نیشنل لائبریری کلکتہ، نیشنل میوزیم دہلی، پٹنہ یونیورسٹی لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری، رائل ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال، مولانا آزاد لائبریری اور خدا بخش لائبریری پٹنہ میں اس کمترین نے مہینوں اوقات بسر کیے۔

---

[۱] دیوان شاہ آفرین ورق ۴۲

میں اپنے استاد محترم جناب ڈاکٹر عبدالغفار انصاری، صدر شعبہ فارسی، بھاگلپور یونیورسٹی کا بے حد ممنون ہوں جن کی سرپرستی اور رہنمائی نے اس مشکل کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ میرے کرم فرما استاد گرامی پروفیسر سید حسن بھی مستحق شکریہ ہیں جنھوں نے وقتاً فوقتاً اپنے گرانقدر مشوروں سے میری حوصلہ افزائی کی ڈاکٹر سید امیر حسن عابدی، ڈاکٹر نذیر احمد، ڈاکٹر عطا کریم برق، ڈاکٹر ولی الحق انصاری، ڈاکٹر متین احمد صبا ڈپٹی کیپر برٹش میوزیم شعبۂ مخطوطات، مینجر رینک زیروکس لندن، مولانا سیّد قمرالہدیٰ ہفت قلم ہیڈ مولوی مسلم ہائی اسکول بھاگلپور، حکیم عبدالباقی خوش رقم اور ڈاکٹر محمد شہاب الدین کا بھی شکر گزار ہوں کیونکہ ان حضرات نے اس مقالہ کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے میں میری معاونت کی۔ آخر میں ان صاحبان کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنھوں نے اس کوہ کنی میں میرے عزم کو ڈگمگانے نہ دیا۔ بھاگلپور یونیورسٹی نے راقم حروف کو سنہ ۱۹۸۱ء میں اس مقالہ پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عنایت کیا۔ میں تمام اراکین فخرالدین علی احمد میموریل کمیٹی حکومت اترپردیش کا ممنون ہوں جن کے مالی تعاون سے یہ کتاب طبع ہوئی۔

بروز حشر چہ باک آفرین ز عصیانم
خدا کریم و شفیعم محمد عربی است[1]

محمد عرفان

---

[1] دیوان شاہ آفرین مخطوطہ لندن

باب اوّل

شاہ فقیر اللہ آفرین لاہوری کے عہد میں ہندوستان کے سیاسی اور ادبی حالات

مرا گلگشت پنجاب آفرین آزردہ می دارد
بکام دل نمی گردد میسر سیر باغ اینجا

(شاہ آفرین)

آفریں لاہوری کے عہد میں ہندوستان کے سیاسی اور ادبی حالات

شاہ آفریں لاہوری عالمگیر اورنگ زیب بادشاہ کے عہد میں ۱۰۷۶ھ / ۱۶۶۵ء کی حدود
میں متولد ہوئے ہونگے۔ ان کی ولادت کی صحیح تاریخ کا علم کسی تذکرہ سے نہ ہو سکا۔
عبدالحکیم حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ اسّی سال سے زیادہ کی عمر میں شاہ آفریں نے ۱۱۵۴ھ
میں وفات پائی تھی اس لئے مندرجہ بالا تاریخ ولادت اسی بنیاد پر لکھی گئی ہے بادشاہ
عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوئے اور تقریباً پچاس سال تک حکومت کی۔ شاہ آفریں
کی زندگی کے اوائل کے تقریباً تیس سال اسی بادشاہ کے عہد سلطنت میں گذرے
ہوں گے ان کی ولادت عالمگیر بادشاہ کے عہد میں ہوئی ہوگی اور اسی عہد میں سن شباب
کو پہنچے ہوں گے۔ عالمگیر بادشاہ کو شاعری سے کوئی رغبت نہیں تھی۔ وہ ایک کٹر مذہبی
اور پابند شرع انسان تھے اس لئے ملک الشعراء کا جو عہدہ مدت سے آرہا تھا اس
کو انھوں نے منسوخ کر دیا صرف شاعری ہی کو نہیں بلکہ دیگر فنون لطیفہ کو بھی یک
لخت زوال آگیا تھا۔ ڈاکٹر سرکار کا بیان ہے۔

Music was banished from the Court but it can not be banished from the common soul.

عہد عالمگیری کے اواخر میں شاہ آفریں لاہوری تقریباً تیس سال کے رہے ہوں گے ان
کی شاعری کا آغاز عہد عالمگیری ہی میں ہو گیا تھا اور اسی عہد میں انھوں نے اپنی مشہور
مثنوی ابجد فکر کو منظوم کیا تھا۔ حاکم لاہوری نے شاہ آفریں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ
عہد عالمگیری کے شعراء میں سے تھے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسی عہد میں انھوں
نے اپنی شاعری کا آغاز کیا اور اسی دور میں رحلت کی بلکہ انھوں نے عالمگیر بادشاہ

کے علاوہ چھ بادشاہوں کا زمانہ دیکھا جن کا سلسلہ وار ذکر راقم الحروف قلمبند کرے گا۔
عالمگیر بادشاہ نے پچاس سال، دو ماہ، اور اٹھائیس (۲۸) دن حکومت کرنے کے بعد ۲۸ ذیقعدہ
بروز جمعہ ۱۱۱۸ھ میں احمد نگر میں وفات پائی۔ ان کی وفات کے بعد ان کا بیٹا محمد اعظم شاہ
تخت پر بیٹھا لیکن ان کے بڑے بھائی نے جنگ چھیڑ دی۔ آخر کار محمد اعظم شاہ اس جنگ
میں مقتول ہوئے اور عالمگیر بادشاہ کا منجھلا بیٹا محمد معظم ۱۱۱۹ھ میں بہادر شاہ کے
نام سے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ انھوں نے کل چار سال گیارہ مہینے حکومت کی۔ ۱۱۲۴ھ
میں شاہ آذریں کی عمر تقریباً اکیاون (۵۱) سال تھی کہ اچانک۔ خان آرزو کے بیان کے مطابق
قیامت خیزی رونما ہوئی یعنی بہادر شاہ کے بیٹوں میں تخت و تاج کے لئے زبردست
خونریزی ہوئی اس خانہ جنگی میں بہادر شاہ کے منجھلے بیٹا محمد عظیم الشان اور منجھلے
بیٹا محمد رفیع الشان جہان شاہ مقتول ہوئے۔ انجام کار بہادر شاہ کا بڑا بیٹا معز الدین
جہاندار شاہ کے نام سے ۱۱۲۴ھ میں تخت نشین ہوا لیکن صرف اٹھارہ مہینے تک
بادشاہ رہا اسی درمیان محمد عظیم الشان کے منجھلے بیٹا محمد فرخ سیر بادشاہ اور
جہاندار شاہ کے درمیان خانہ جنگی ہوئی۔ جہاندار شاہ پست ہمت ہو کر جان
بچانے کے لئے دہلی کی طرف بھاگا اور محمد فرخ سیر ۱۱۲۵ھ میں تخت پر بیٹھا
لیکن سید برادران نے فرخ سیر کو چین سے نہیں رہنے دیا اور اس کو اندھا کرا دیا
یہاں تک کہ چھ سال کی حکمرانی کے بعد ۱۲ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ میں اس کو قتل کرا دیا
بعد ازاں سید برادران نے رفیع الدرجات کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا لیکن
دو ماہ بعد ہی اس کو قتل کرا دیا پھر سید برادران نے رفیع الدولہ کو تخت پر بٹھایا
لیکن چند ہی دنوں کے بعد وہ انتقال کر گیا۔ بہت ممکن ہے کہ ان کو زہر دیدیا گیا ہو۔

۱؎ The History of Hindustan ۲؎ مجمع النفائس بحوالہ مرحوم دیدہ ص ۵۲۔۲۰

اورنگ زیب عالمگیر بادشاہ کے بعد اور محمد شاہ رنگیلے کے عہد حکومت کے قبل
بارہ سال کی مدت میں چھ بادشاہ یکے بعد دیگرے ہندوستان کے تخت پر بیٹھے
اور ایک یا دو کے علاوہ سبھی مقتول ہوئے۔ خان آرزو، شاہ آفریں کے ہمعصر شاعر اور
تذکرہ نگار تھے۔ انھوں نے مجمع النفائس میں اپنے عہد کے ان سارے بادشاہوں
کا ذکر کیا ہے جن کے متعلق راقم حروف نے سطور بالا میں لکھا۔ خان آرزو چونکہ اسی
عہد کے تذکرہ نگار تھے اس لئے ان کے بیان کی بڑی اہمیت ہے۔ انھوں نے (خان
آرزو) تخت و تاج کے لئے قتل و خون و غارتگری خود دیکھی تھی۔ شاہ آفریں لاہوری
بھی ان کے ہم عصر تھے اس لئے انھوں نے اگر اس خونریزی کو دیکھا نہیں ہے تو ضرور
اس سے باخبر ہوں گے۔ قتل و خون اور غارتگری کو عام طور پر لوگ برا سمجھتے ہیں ا[ور]
نرم و نازک طبیعت کے لوگ اور بھی زیادہ متاثر ہوتے ہیں اس لئے اس میں
شبہ نہیں ہے کہ ۱۱۱۹ھ سے ۱۱۳۰ھ تک کا زمانہ ہندوستان کی تاریخ [کا]
ایک ایسا دور تھا کہ بیشتر لوگ اس سے متاثر ہوئے۔ دہلی اور اس کے قرب [و جوار]
کے لوگ خصوصاً معاشی پریشانیوں میں مبتلا ہوئے یہ ایک [مسلمہ] امر ہے [کہ]
ملک کے اندر خانہ جنگی ہوتی ہے تو ملک کی معیشت کو بڑا نقصان پہنچتا ہے [اس]
کی خانہ جنگی اور خونریزی نے بہت سے شعراء اور اہل قلم کو ترک دہلی کے لئے مجبور
کیا اور بیشتر شعراء اور اہل قلم اس زمانہ میں ترک دہلی کرکے اودھ، دکن، فر[خ]
آباد، اور مرشد آباد چلے گئے۔ عہد عالمگیری میں جیسا کہ قبل لکھا گیا کہ شعر و شاعری
کو زوال ہی رہا لیکن ان کی وفات کے بعد بھی بارہ سال تک یعنی عہد رفیع الدولہ
تک ادب اور شعر و شاعری کس مپرسی کی حالت میں رہی۔ غلام حسین[1] کا بیان [ہے]

۱؎ سیر المتاخرین ص ۳۸۷

کہ اس عہد کے بادشاہان خانہ جنگیوں کے سلجھانے میں مبتلا رہے۔ اس لئے شاعری اور فنون لطیفہ کو ترقی کیسے ملتی۔ نواب سید نصیر حسین خاں خیالؔ کا بیان اس سلسلے میں قابل قدر ہے۔

"یہاں جانوں کے لالے پڑے ہیں، زبان، ادب اور شاعری تو دلجمعی اور سکون کی نشانیاں ہیں اور وہ خواب میں بھی نایاب"[56]

ظاہر ہے جب حکمران وقت اور ارکان سلطنت خانہ جنگیوں کو فرو کرنے میں مبتلا ہوں، ایسی صورت میں شاعری اور فنون لطیفہ کو کیا فروغ مل سکتا ہے؟

بہادر شاہ کا پوتا اور جہان شاہ کا بیٹا محمد شاہ رنگیلا، رفیع الدولت کے بعد ۱۱۳۱ھ میں ہندوستان کا بادشاہ ہوا اور اس نے اکتیس[31] سال تک حکومت کی اس کی تعریف میں مؤلف تاریخ محمد شاہی رقمطراز ہے۔

شمع شش طاق و شمع نہ خرگاہ
پرتو نور حق محمد شاہ

روشن اختر خدیو عدل سرشت
کہ بجز عدل تخم ظلم نہ کشت[57]

محمد شاہ کی تخت نشینی کے وقت ۱۱۳۰ھ میں شاہ آفریں کی عمر تقریباً ستتاون سال تھی اس عہد میں مغلیہ سلطنت روبہ زوال تھی۔ ملک کے ایک ایک صوبے آزاد ہو رہے تھے۔ علاوہ ازیں مرہٹوں کی طاقت روز بروز بڑھ رہی تھی۔ اسی عہد میں ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ کا ہندوستان پر حملہ اور قتل عام ہوا۔ ارکان سلطنت کے مابین آپس میں زبردست نفاق اور دشمنی تھی ان وجوہات کی بنا پر کسی بیرونی دشمن کا مقابلہ آسان کام نہیں تھا۔ جب ملک خود برباد ہو رہا ہو تو شعر و شاعری کو کیا

---

[56] ... مثنوی اور اردو صفحہ ۶۵

فروغ مل سکتا ہے۔ لیکن محمد شاہ رنگیلے نے اپنی تیس سال کی سلطنت کی مدت
میں نئے سرے سے ملک میں امن و امان اور خوشحالی قائم کرنے کی کوشش کی چونکہ
وہ خود شاعر تھا اس لیے اس نے شعر و شاعری کی سرپرستی کی اور اپنے دربار
میں شعراء کو مناصب و جاگیروں سے نوازا۔ اس طرح اس کے عہد میں شاعری کے
مروجہ قالب میں کچھ ایک بار رجحان پیدا ہو گیا۔

نواب نصیر حسین خاں خیال کے حوالہ سے ڈاکٹر عبدالغفار انصاری نے لکھا
ہے کہ مغل حکمران اس عہد میں گرچہ بہت کمزور ہو گئے تھے لیکن اس سے انکار
نہیں کیا جا سکتا کہ ہر حال میں ان لوگوں نے علوم و فنون کی سرپرستی کی۔ محمد شاہ نے
بھی علوم و فنون کو فروغ دینے میں اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کی۔ محمد شاہ نہ یہ کہ صرف
شعراء کا سرپرست اور مربی تھا بلکہ وہ اردو میں اشعار بھی کہتا تھا۔ بھگوان داس
ہندی نے لکھا ہے کہ اکثر فنون و مصنوعات میں وہ دستگاہ رکھتا تھا۔ اس نے اپنے
تذکرہ میں محمد شاہ کے چند اشعار بھی نقل کیے ہیں جو فارسی میں ہیں۔[1]
راقم حروف چار شعر پر اکتفا کرتا ہے۔

ہر روز گرچہ خود را می سازم آشنایت
خود را چو روز اول بیگانہ می نمائی

یار در بر، صبح بر سر فکر جالش کنید
دوستاں شب می رود زنجیر در پایش کنید

شد پری در جلوہ و محو تماشایم ہنوز   آں قدر از خویشتن رفتم کہ می آیم ہنوز

شعلہ در کعبہ و بتخانہ یکساں دیدہ ام
من نمی دانم کہ کافر یا مسلمانست شمع

---

[1] سفینۂ ہندی صفحہ ۱۸۰

بھی شفیق نے اپنے تذکرہ چمنستان شعراء[1] میں اس کے اردو اشعار نقل کیے ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اردو میں بھی شعر کہتا تھا۔ ذیل میں چند شعر ملاحظہ ہوں۔

خوف سے مار کے یاران اسے لرزاں نہ کرو
زلف کا نام نہ لیو دل کو پریشاں نہ کرو

نین بیں دل کی چکری اجر کے بھیجا ہوں تیری خاطر
اگر پہنچے تمہارے ہات لکھیو کہ پہنچی ہے

اکھڑی ہے چونڑ غم کی مو سر سے تاکوں پا
تم کو نہ چاہتا ہے ہم سے بھٹک مت جانا

ڈاکٹر نور الحسن ہاشمی کا بیان ہے کہ ہندوستان میں بہادر شاہ سے محمد شاہ کے دور سلطنت تک فارسی زبان کا بول بالا رہا۔ خان آرزو، عبد الجلیل بلگرامی، بیدل، سلیمان قلی خاں آرزو اور مرتضیٰ قلی خاں فراق وغیرہم فارسی زبان کے سخنوروں کا بازار گرم رہا۔ اگرچہ فارسی شعراء کبھی کبھی اردو میں بھی شعر کہتے تھے مگر وہ لوگ اس کی طرف زیادہ راغب نہ تھے البتہ محمد شاہ کے بعد ہندوستان میں فارسی شاعری کو بتدریج زوال کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس [illegible] قمر تروف کا خیال ہے کہ عہد محمد شاہی ہندوستان میں فارسی شعر و شاعری کا آخری دور تھا۔ آزاد بلگرامی، میر شمس الدین فقیر دہلوی، نظام الملک آصف جاہ، والہ داغستانی، شیخ محمد علی حزیں، ثبات الہ آبادی، خان آرزو، عمدۃ الملک امیر خاں انجام، حکیم حسین شہرت، قزلباش خان امید، جوگل کشور ثروت، ملا علی اکبر سودا، خوشگو اور اسد علی خاں ایمن وغیرہم جیسے باکمال شعراء اس عہد میں حیات تھے مگر اسی دور میں شعراء اردو شاعری کی جانب رجوع ہو رہے تھے اس عہد میں

1۔ چمنستان شعراء مطبوعہ [illegible]

ایران میں عاشق اصفہانی، داؤد لطف علی بیگ، آذر، مشتاق اصفہانی اور حبیب اصفہانی
وغیرہم مایۂ ناز سخنور تھے۔ مگر جو عزت افزائی ملک ہندوستان میں ایران سے ہجرت
کردہ سخنوروں کی ہوئی وہ ان حضرات کی نہ ہو سکی۔ اس دور کے ایک نامور ایرانی
شاعر آقا محمد کاظم والہ اصفہانی نے پچاس سال تک شاعری کی لیکن حسب خواہ قدردانی
ان کو میسر نہ ہوئی اس لئے وہ ہمیشہ ہندوستان آنے کی سوچتے رہے مگر نہ آسکے۔ انھوں
نے اپنے دیوان کا ایک نسخہ میر نظام علی خاں صوبہ دار دکن کو انعام و اکرام کی امید پر
بھیجا تھا اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ اسکو خاطر خواہ انعام بھی میر نظام علی خاں نے
بھیجا تھا۔

چونکہ در بازار ایران بود قحط مشتری [۱]
ما بہ ہندوستان فرستادیم درّ شاہوار

پنجاہ سال تجربہ کردیم شاعری [۲]
نخلی است بی ثمر ثمر از شاعری مخواہ

محمد شاہ نے شعر و شاعری کی محفل کو گرم رکھا اور اس کی داد و دہش کا یہ عالم تھا کہ نہ
صرف ہندوستان کے مختلف شہروں سے لوگ دہلی پہنچے بلکہ ایران سے بھی بہت
سارے شعراء و سخنور ہندوستان آئے اور بلند مقام پر فائز ہوئے اس عہد کا نامور
شاعر شیخ علی حزیں بھی ترک وطن کرکے ہندوستان آیا۔ گرچہ تذکروں میں یہ بات
درج ہے کہ شیخ حزیں نادر شاہ کے خوف سے ہندوستان آیا تھا لیکن اس میں کوئی
مبالغہ نہیں ہے کہ اس نے ترک وطن کرکے ہندوستان ہی آنا اس لئے مناسب سمجھا
تھا کیونکہ اسے یہ امید تھی کہ ہندوستان کے فیاض بادشاہ اور امراء اس کی خاطر خواہ پذیرائی

۱،۲،۳،۔ دیباچہ دیوان آقا محمد کاظم والہ اصفہانی مطبوعہ ص ۲۰، ۲۷، ۱۱۵

کریں گے۔

تذکروں میں درج ہے کہ شیخ حزیں کو محمد شاہ نے چالیس ہزار روپیہ سالانہ کا وظیفہ عنایت کیا تھا[1]۔ یہ بھی مشہور ہے کہ محمد شاہ نے کسی موقع پر پانچ لاکھ روپیہ کا انعام دیا تھا۔ سید محمد کا بیان ہے کہ محمد شاہ اہل سماع کو عزیز رکھتا تھا۔ منشی غلام حسین[2] خاں کا بیان ہے کہ شیخ حزیں کو محمد شاہ نے قلمدان وزارت دینا چاہا تھا لیکن اس نے انکار کیا۔ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری صوبہ دار اودھ گرچہ[3] میدان جنگ کا دلاور تھا لیکن کبھی کبھی شعر بھی اس کی زبان پر ہوتے تھے۔ حکیم علوی خاں بھی کبھی کبھی شعر کہتا تھا اور محمد شاہ نے اس کو شش ہزاری منصب عطا کیا تھا وہ اپنے وقت کا ایک باکمال حکیم تھا۔ مشہور ہے کہ نادر شاہ اس کو اپنے ساتھ لیتا گیا تھا لیکن تین سال کے بعد وہ پھر ہندوستان چلا آیا۔ فن طب میں جامع الجوامع اور خلاصۃ التجارب اس کی مایۂ ناز کتابیں ہیں۔ اس عہد کا ایک باکمال شاعر میر شمس الدین فقیر عباسی بھی تھا۔ کتبخانہ خدا بخش میں اس کا دیوان اور اس کی مثنویاں ہیں۔ سراج الدین علی خاں آرزو بھی اس دور کا ایک ممتاز شاعر اور تذکرہ نگار تھا۔ اس نے کئی کتابیں تصنیف کی ہیں۔ نظام الملک آصف جاہ صوبہ دار دکن بھی اس دور کا ایک باکمال شاعر تھا۔ محمد شاہ نے اس کو وزارت کا عہدہ بھی دیا تھا۔ اس کے دیوان کا ایک نسخہ کتب خانہ خدا بخش میں ہے۔ گلشن علی جونپوری اس عہد کا ایک نامور خطاط اور شاعر تھا۔ اس کے ہاتھ کا لکھا ہوا نسخہ ریاض الشعراء خدا بخش کتب خانہ میں موجود ہے۔ اس نے ایک مثنوی بنام "صورت حال" لکھی تھی جس کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے۔ البتہ اس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں ہے۔ شاہ آفریں کا عزیز ترین شاگرد عبدالحکیم حاکم لاہوری بھی اس عہد کا ایک ممتاز شاعر

---

[1] تذکرۂ حزیں صفحہ ۲۷۔ [2] گلشن گفتار صفحہ ۲۲۔ [3] سیر المتاخرین صفحہ ۲۱۵

اور تذکرہ نگار تھا۔ شجاع الدولہ نے ایک منصب پر اس کو سرفراز کیا تھا۔ قزلباش خاں
امید بھی اس دور کا ایک نامور شاعر تھا اور اسے علم موسیقی میں بھی مہارت حاصل
تھی۔ اس عہد کا ایک مایۂ ناز شاعر عمدۃ الملک امیر خاں انجام بھی تھا اور اس کو فن
موسیقی میں کمال حاصل تھا۔ محمد شاہ کی قدردانی اور سرپرستی نے ان دونوں باکمال شعراء
کو ممتاز منصبوں پر فائز کیا تھا۔ ملا علی اکبر سودا ایران سے ہندوستان آیا تھا اور ایرانی
موسیقی میں وہ درجۂ کمال پر تھا۔ علاوہ ازیں ہندوستانی موسیقی میں بھی اس نے
دسترس حاصل کیا تھا۔ محمد شاہ بادشاہ نے سودا کو بھی ایک بلند عہدہ سے نوازا تھا اس
کی طبیعت شاعری کی طرف بھی مائل تھی۔ بیغیرت خاں بہادر بھی شاعرانہ مذاق رکھتا تھا
عہد محمد شاہی میں وہ پنج ہزاری منصب پر فائز تھا۔ سرہند، سہارنپور اور کول کا وہ حاکم
بھی تھا۔ حکیم حسین شہرت شیرازی ترک وطن کرکے ہندوستان آیا تھا۔ محمد شاہ کے
عہد میں اس کو حکیم الممالک کا خطاب ملا تھا۔

مرشد قلی خاں ایک برہمن زادہ تھا اور محمد شاہ نے اس کو اڑیسہ کی نظامت
کا منصب دیا تھا کبھی کبھی وہ شعر بھی کہتا تھا اس کو اولیاء اللہ سے بڑی عقیدت تھی
اس نے اپنے دست خاص سے کلام پاک کئی پارے لکھا تھا اور ہندوستان کی کئی معروف
درگاہوں میں اپنے دستخط کے ساتھ روزانہ تلاوت کے لئے ان پاروں کو بھیجا۔ حفاظ
کرام ان پاروں کی تلاوت کے لئے مقرر کئے گئے تھے اور ان کے وظیفے اس نے مقرر کیا
تھا۔ راقم حروف کو استاذ محترم ڈاکٹر عبد الغفار الغفاری کی زبانی یہ معلوم ہوا کہ مرشد قلی
خاں کے ہاتھ کا لکھا ہوا ایک پارہ حضرت مخدوم اشرف سمنانی علیہ الرحمۃ کی درگاہ
کچھوچھہ شریف میں اور ایک پارہ حضرت مولانا شہباز محمد علیہ الرحمۃ بھاگلپوری کے

لہ [illegible] ایک قرآن کا عکس جو حضرت مولانا شہباز رح بھاگلپوری
کے [illegible] عبد الغفار الغفاری کی ملکیت میں ہے۔

کتب خانہ میں ابھی ایک نسخہ موجود ہے۔

محمد شاہ نے احمد یار خاں یکتا کو بھی ایک لائق منصب سے نوازا تھا۔ وہ اپنے عہد کا ایک ماہر خطاط اور مثنوی گو تھا۔ محمد شاہ کے دورِ حکومت میں یکتا خاں اقتدار اور اس میں میر منشی گری کے منصب پر فائز تھا بعد ازاں خالصہ کی دیوانی کا عہدہ بھی اس کو ملا۔ اس عہد میں میرزا لطف اللہ شاکر کو قور خانہ کے داروغہ کا منصب ملا تھا قور خانہ کے معنی اسلحہ خانہ کے ہیں اس کو مختلف اسلحوں کا واقف علم تھا اور اتفاق سے وہ سخنور بھی تھا سفینۂ ہندی میں اس کے اشعار درج ہیں۔

نعمت اللہ خاں کو اس دور میں قراول بیگی کا عہدہ ملا تھا۔ [illegible] اس کے ماجیت تھا فارسی شاعری سے بھی دلچسپی تھی جب نادر شاہ نے دلی [illegible] اس عہد میں مدار ف بیوتات (داروغہ مسٹری) کا مہتمم تھا عربی اور فارسی میں مہارت حاصل تھی اور اس کے اشعار بھی ملتے ہیں۔ احمد علی خاں یکتا اس عہد میں ایک ممتاز منصب پر فائز تھا۔ وہ نادر شاہ کے سپاہیوں سے کرنال کے میدان میں جاں بحق ہوا۔ وہ ایک با مذاق شاعر بھی تھا۔ اسحاق خاں کو اس عہد میں خالصہ کی دیوان گری کا عہدہ ملا تھا۔ وہ بھی شاعر تھا۔ محمد شاہ نے شیر افگن باسطی کو پنج ہزاری منصب اور جاگیر بھی دیا تھا۔ وہ فارسی میں شعر بھی کہتا تھا۔ بندرابن داس خوشگو اس عہد کا ایک ممتاز شاعر اور تذکرہ نویس تھا اس نے مرزا عبد القادر بیدل اور سرخوش سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ مرزا امام قلی حشمت اصفہانی کو اس عہد میں عماد الدین خاں کا خطاب مرحمت ہوا تھا اور وہ ازدیاد جاگیر اور شاہی خلعت سے بھی سرفراز ہوا تھا فارسی میں اس کے اشعار دستیاب ہیں۔ خواجہ محمد عاصم خاں دوران اس عہد میں میر بخشی گری کے عہدہ پر فائز تھا اس کو امیر الامراء

لہ روز روشن صہ ۱۸۷

شخص کیونکہ وہ تردد میں الجھے رہنے کے بعد انسان علم و فن کو پایۂ کمال پر نہیں پہنچا
سکتا ہے۔ عہد محمد شاہی کا ایک بہترین دور شاعر، ادیب اور فنکار نظر آتا ہے۔ عہد محمد شاہی
کے بعد ہندوستان کے تخت پر جو بادشاہ بیٹھے وہ خانہ جنگیوں میں الجھے رہے۔ اور انکی
مدت حکومت بھی بہت کم رہی اس لئے ان کے عہد میں فارسی شاعری اور ادب کو خاطر
خواہ فروغ حاصل نہ ہو سکا۔ محمد شاہ کے بعد احمد شاہ اور عالمگیر ثانی ہندوستان کے تخت
پر بیٹھے لیکن ان دونوں بادشاہوں کی حکمرانی کا زمانہ صرف ساڑھے بارہ سال ہے۔
احمد شاہ اور اس کی والدہ قید کی گئیں۔ اور بحالت قید ہی دونوں کو بینائی سے محروم
کر دیا گیا۔ عالمگیر ثانی مقتول ہوئے۔ ان دونوں بادشاہوں کو برباد کرنے والا عماد الملک
غازی الدین خاں نظام تھا جو نظام الملک آصف جاہ کا پوتا تھا۔ چونکہ یہ دونوں بادشاہ
عماد الملک کی وجہ سے پریشان رہے اس لئے ان کے عہد سلطنت میں شاعری اور فنون
لطیفہ پر زوال ہی رہا۔ ان وجوہات کی بنا پر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ہندوستان
کی تاریخ میں عہد محمد شاہی فارسی شاعری اور ادب کا زرین دور تھا۔

عہد محمد شاہی میں علم نجوم کو بھی بہت فروغ حاصل ہوا۔[1] جے سنگھ کی نگرانی میں
محمد شاہ نے شہر دہلی سے باہر ایک رصد خانہ بنوایا تھا جس کی شہرت ساری دنیا میں تھی
نامور منجم و ماہر بھی اس رصد خانہ سے استفادہ کرنے کے لئے دہلی پہنچا تھا یہ رصد خانہ
ابھی تک دہلی میں جنتر منتر کے نام سے ہے اور سیاحوں کو اپنی طرف کھینچتا ہے۔ بھگوان
داس ہندی کا بیان ہے کہ عہد محمد شاہی میں مخلوق آرام اور آسائش کی نیند سوتی تھی۔

"در عہدش خلائق بہ مہد آسائش راحت می کردند بعد رحلت، او دہلی مصدر
آفات گردید"[2]

۱؎ مغل اور اردو ص ۶۵ ۲؎ سفینۂ ہندی

جے سنگھ کے مشورے سے اس نے باجی راؤ کو مالوہ کا گورنر بنا دیا تاکہ لوٹ مار بند ہو جائے
ادھر ابھے سنگھ گجرات میں گورنر کے عہدہ پر تھا مگر نہایت ناکارہ تھا اس لئے اس کو
برطرف کر دیا گیا۔ اس عہد میں ملک کے ہر گوشہ میں خلفشار تھا الٰہ آباد کے زمیندار بھگونت
رائے نے وہاں کے کمانڈر کو مار ڈالا اور ہر طرف لوٹ کھسوٹ برپا کیا چند مرتبہ کے بعد
اس کی بیگم کو بھی اٹھا لیا اور فرار ہوا۔ کمانڈر مذکور قمر الدین خاں وزیر اعظم کا سالا تھا۔
اس لئے اس کو سزا دینے کے لئے اس نے ایک بہادر شخص کو الٰہ آباد بھیجا لیکن بھگونت
رائے روپوش رہا چند مہینے کے بعد وہ آیا اور نئے کمانڈر کو بھی قتل کیا آخر کار برہان الملک
سعادت خاں نیشاپوری صوبیدار اودھ نے راجہ درجن سنگھ کی مدد سے بھگونت
رائے کو مار ڈالا۔ اور اس کے جسم کی کھال میں بھوسا ڈال کے قمر الدین خاں وزیر اعظم
کی خدمت میں بھیج دیا۔ بعدہٗ بھگونت رائے کا سر محمد شاہ کو بھیجا گیا۔ باجی راؤ گرچہ مالوہ کا
گورنر تھا لیکن اس نے ناک میں دم کر دیا تھا وہ مالی طور پر پریشان تھا کیونکہ
زمینداروں اور سپاہیوں کی تنخواہ بھی باقی تھی اس لئے باجی راؤ نے مالوہ کی آزادی
طلب کی آخر کار ۱۷۳۶ء میں ایک راضی نامہ ہوا جس کے تحت پانچ ملین روپے سالانہ
باجی راؤ کو ملتا تھا۔ محمد شاہ اپنے داخلی دشمنوں سے تو پریشان تھا ہی لیکن نادر شاہ
کی آمد کی خبر نے اس کو اور بھی پریشان کر دیا تھا۔ بار بار دہلی میں نادر شاہ کے آنے کی خبر
مل رہی تھی مگر ہندوستانی امراء آرام کی نیند سوئے ہوئے تھے یہ خبر بھی ملی کہ نادر شاہ
نے کابل کو اپنے قبضہ میں کر لیا ہے اور دہلی کی طرف آ رہا ہے اس کے باوجود امراء آپس
میں لڑتے رہے کسی کو یہ فکر نہ تھی کہ کس طرح نادر شاہ کا مقابلہ کیا جائے بلکہ وہ لوگ
اپنے عہدوں کے بارے میں غور و فکر کرتے تھے کہ کس طرح بڑے سے بڑا عہدہ ملے۔
۱۷۳۹ء میں نادر شاہ اپنے سپاہیوں کے ہمراہ کرنال کے میدان میں پہنچا اور خیمے نصب
کئے گئے۔ محمد شاہ بھی اپنی فوجوں کے ساتھ کرنال پہنچا نہایت خونریز جنگ ہوئی لیکن

ہندوستانی سپاہیوں کو شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ اس جنگ میں صمصام الدولہ
روز اول ہی بہت بری طرح گھائل ہوا اور پانچویں دن اس نے وفات پائی۔ برہان الملک
سعادت خاں نیشاپوری صوبہ دار اودھ گرفتار ہوا اور نادر شاہ کے روبرو
حاضر کیا گیا۔ آخرکار نادر شاہ نے دو کروڑ روپئے پر صلح کرلی۔

منشی غلام حسین خاںؒ کا بیان ہے کہ صمصام الدولہ کی وفات کے بعد امیر الامراء
کا عہدہ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری کو نہیں دیا گیا بلکہ نظام الملک آصف
جاہ کو ملا۔ اس وجہ سے برہان الملک کو بہت رنج ہوا اور اس نے نادر شاہ کو اکسایا
کہ دو کروڑ کیا ہے اتنے روپئے تو وہ تنہا دے سکتا ہے اس کو دہلی جانا چاہیئے اور
ہندوستان کی دولت سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ نادر شاہ لالچی تو تھا ہی اس کے بہکاوے
میں آگیا اور اپنے وعدہ سے مکر گیا۔ محمد شاہ نے اس کو ہر طرح سے سمجھایا کہ وہ دو کروڑ
کی رقم لے کر واپس چلا جائے لیکن وہ آمادہ نہ ہوا۔ محمد شاہ کو کرنال ہی کے میدان
میں لال قلعہ، دیوان، کارخانوں اور خزانوں کی کنجیاں نادر شاہ کو دینی پڑیں۔ اس کے
بعد نادر شاہ ایک فاتح کی حیثیت سے ۹ ذی الحجہ کو جمعہ کے دن ۱۱۵۱ھ میں لال قلعہ
میں داخل ہوا اور وہیں اس نے اقامت کی۔ محمد شاہ بھی لال قلعہ کے ایک حصہ میں تھا۔
۱۰ ذی الحجہ کو عید الاضحیٰ کا تیوہار تھا اور اتفاق سے اس دن نوروز بھی تھا۔ دہلی کی شاہجہانی
مسجد اور دوسری مسجدوں میں خطبہ کے درمیان نادر شاہ کا نام لیا گیا جیسا کہ
عام طور سے بادشاہوں کا نام لیا جاتا ہے۔ عید الاضحیٰ کے دوسرے دن تقریباً عصر کے
وقت شہر میں یہ خبر پھیل گئی کہ نادر شاہ مارا گیا۔ اس خبر کا مشتہر ہونا تھا کہ ہندوستانی
سپاہیوں نے ایرانی سپاہیوں کو مارنا شروع کیا۔ نادر شاہ کو اس واقعہ کی خبر

لہ سیر المتاخرین صفحہ ۴۸۴-۴۸۵

تھا اس نے اپنے سپاہیوں کو فقط اپنی حفاظت کا فرمان جاری کیا۔ ایرانی فوجوں کا
قتلِ عام ہوتا رہا اور رات بھر میں تقریباً سات سو ایرانی فوجیں ماری گئیں۔

لیکن محمد شاہ کے امراء اور خود محمد شاہ کو یہ سوچنے کی توفیق نہ ہوئی کہ کس طرح
ایرانی فوجیوں کے قتلِ عام کو روکا جائے۔ نادر شاہ صبح میں سنہری مسجد کے صحن میں
آیا (یہ مسجد چاندنی چوک، دہلی میں پولیس تھانہ سے متصل ہے) اور ہندوستانیوں
کے قتلِ عام کا حکم جاری کر دیا۔ اب کیا تھا ہندوستانی بیدردی سے اس قتلِ عام میں مارے
گئے کہا جاتا ہے کہ مقتولوں کی تعداد آدھے دن گزرنے کے بعد گنی نہیں جا سکتی تھی آخر
کار نظام الملک آصف جاہ ننگے پاؤں ننگے سر نادر شاہ کے پاس گیا اور کسی طرح سمجھا
بجھا کر اس کو قتلِ عام سے روکا۔ یہ بات مشہور ہے کہ نظام الملک آصف جاہ نے نہایت
عاجزی کے ساتھ نادر شاہ سے کہا تھا کہ جب ساری آبادی اس قتلِ عام میں ختم ہو جائے
گی تو آپ کس پر حکومت کریں گے۔ اس کا جواب نادر شاہ نے یہ دیا تھا کہ تب
وہ (ایرانی سپاہیوں) کو یہ حکم دے گا کہ قبروں کے مردوں کو قتل کریں۔ بہت ممکن
ہے کہ اس میں مبالغہ بھی ہو لیکن اتنا صحیح ہے کہ نادر شاہ کا دہلی کا قتل ہندوستان
کی تاریخ سے فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس قتلِ عام میں لاکھوں جانیں تلف ہوئیں۔
لاشوں کے تعفن سے دہلی کی آب و ہوا مسموم ہو گئی آخر کار لاشوں کو اکٹھا کروا کے
جمع کیا گیا اور گرے ہوئے مکانوں کی لکڑیوں کو جلا کر ان کو جلایا گیا۔[1]

برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری نے دو کروڑ کی رقم نادر شاہ کو بطور
عطیہ دینے کا وعدہ کیا تھا مگر اس نے اسی اثناء میں رحلت کی اس لئے صفدر جنگ
صوبہ دار اودھ سے یہ رقم حاصل کی گئی۔ نادر شاہ نے ہندوستان کے شاہی خزانہ کو خالی

---

[1] سیر المتاخرین صفحہ ۵۸

کر دیا تھا۔ ہیرے جواہرات اور بیش قیمت چیزیں وہ اپنے ساتھ ایران لیتا گیا۔ یہ بات مشہور ہے کہ سونے اور چاندی کو پگھلا کر چکی کی طرح گول گول پتھر جیسے بنوائے گئے اور نادر شاہ ان سب کو اونٹوں اور خچروں پہ لاد کر لے گیا۔ مشہور زمانہ تخت طاؤس جس کو شاہجہاں نے نہایت شوق سے بنوایا تھا اسے بھی نادر شاہ اپنے ساتھ لیتا گیا۔[1]

محمد تقی فخر داور گیلانی نے لکھا ہے کہ آباؤ اجداد نے جو مال و دولت اور نفیس اشیاء جمع کی تھیں، اس نے اسے نادر شاہ کے حوالہ کیا اور تخت طاؤس بھی نادر شاہ کو مال غنیمت میں ہاتھ لگا۔ (محمد شاہ نے)

"اموال و نفائس و نقودی را کہ اجدادش اندوختہ بودند بہ او واگذار کرد در میان غنائم جنگی تخت طاؤس مشہور و معروف بود"[2]

ڈاکٹر عبدالغفار انصاری نے راقم حروف کو بتایا کہ اس نے تہران کے کاخ گلستان میں ایک تخت طاؤس ۱۹۶۶ء میں دیکھا تھا جس کے متعلق ماہ نامہ تہران مصور کے ایڈیٹر نے ۱۳۴۶ھ شمسی شمارۂ اردو زمیں لکھا ہے کہ سر جان ملکم کی رائے ہے کہ نادر شاہ نے ہندوستان کے جواہرات سے ایران میں ایک تخت طاؤس بنوایا تھا جو شاید یہی تخت طاؤس ہے جو تہران میں ہے اور شاید ہندوستان کے تخت طاؤس کے جواہرات بھی اس تخت طاؤس میں لگائے گئے۔

بعض ایرانی مورخ لکھتے ہیں کہ فتح علی قاچار نے اس موجودہ ایرانی تخت طاؤس کو اپنی بیگم طاؤس کے نام پر بنوایا تھا اور یہ ممکن ہے کہ اس تخت طاؤس میں شاہجہاں کے تخت طاؤس کے جواہرات کام میں لائے گئے ہوں۔ لیکن عبدالغفار انصاری کا خیال ہے کہ یہ سب ایرانیوں کی بہانہ سازی ہے۔ ایران کا موجودہ تخت طاؤس نہ تو نادر شاہ

---

[1] دی کیمبرج ہسٹری آف انڈیا [2] تاریخ ایران جلد دوم صفحہ ۵۰۷

کا بنوایا ہوا ہے اور نہ فتح علی قاچار کا بنوایا ہوا ہے۔ بلکہ یہ وہی تخت طاؤس ہے جو نادر شاہ ہندوستان سے اپنے ساتھ لیتا گیا مگر ایرانی مورخین اس بات کا کیسے اعتراف کریں کہ یہ تخت طاؤس ہندوستان ہی کا ہے کیونکہ ان کو اس بات کا خوف ہے کہ اہل ہند اپنے تخت طاؤس کو واپس لینے کا مطالبہ نہ کریں۔ اسی لئے ایرانی مؤرخوں نے یہ سب بہانے تراشے ہیں۔

شاہ آفریں لاہوری کی ولادت عہد عالمگیری میں اور وفات عہد محمد شاہی میں ۱۱۵۴ھ میں ہوئی تھی اس لئے راقم حروف نے عہد عالمگیری سے عہد محمد شاہی تک کے سیاسی اور ادبی حالات پر تبصرہ کیا۔

دیگراں را چہ غم از شورش ملک[1]
ہمہ در فکر شراب اند و کباب
سعی کن سعی در اصلاح جہاں
کہ فتادہ اند خلایق بہ عذاب

(والہ داغستانی)

---

[1] دیوان والہ داغستانی مخطوطہ رامپور

بابِ دُوم

شاہ فقیر اللہ آفرینؔ لاہوری تواریخ، تذکروں اور سوانح کی روشنی میں

چون خضر چرا زندۂ جاوید نہ باشم
قاتل چو تو ئی آبِ حیات است کفن ہم

(شاہ آفرینؔ)

شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری تواریخ تذکرے اور سوانح کی روشنی میں

(۱) علی قلی خاں واله داغستانی ـــــ ریاض الشعراء (سال تکمیل سنہ ۱۱۶۱ھ)

"دریں شہر بہ سخن سرای مشہور بود۔ در سنہ ۱۱۴۷ھ که راقم حروف وارد بلدۂ مزبور گردید او را طلبیدم چوں ترک آمیزش خلق خصوص اغنیاء و ارباب دنیا کرده عزلت گزیں مضائقہ نمود .... الحق بایں دردمندی کم کسی دیده شده۔ غرض تا در لاہور بودم اکثر قدم رنجہ می نموده واثر صحبتش بر ولوله و شورم می افزود"

(۲) میر غلام علی آزاد بلگرامی ــــ سرو آزاد

"راقم الحروف وقتی که از ہند جانب سندھ رفت به بست و نہم محرم سنہ ثلث و اربعین ومائتہ والف (سنہ ۱۱۴۳ھ) در لاہور باو برخورد۔ وچوں از بلاد سندھ عطف عنان نمودم و ہفتم رجب سنہ سبع و اربعین ومائتہ والف (سنہ ۱۱۴۷ھ) وارد لاہور شدم وتا دواز دہم ماه مذکور در آنجا اقامت اتفاق افتاد۔ ملاقات مشارٌالیہ بہ مرات واقع شد۔

(۳) میر غلام علی آزاد بلگرامی ــــ خزانہ عامره (سنہ ۱۱۷۶ھ)

نام او فقیر الله است۔ شاعری بود معنی آفریں و شایستہ صد ہزار آفریں از مردم قناجبہ است مولد و منشاء او لاہور و اصلش از قبیلۂ جوبیہ

...... شعبہ ایست از قوم گوجر ...... نکہت خلقش دماغ زرا
بشگفتگی آورد دراں ایام قصۂ ہیر رانجھا نظم می کرد .... از
منظومات خود مثنوی انبان معرفت بخط خودش بطریق یادگار تسلیم
فقیر نمود عنوانش ایں است۔

ای مغنی بوضوی تجرید
صبح شد صبح نماز توحید

(۴) میر غلام علی آزاد بلگرامی ـــــ ید بیضا
درلاہور در محلہ بخارا سکونت دارد .... از شعرا خوش حال و سخنوران
خوش مقال است اقسام نظم خوب گفتہ۔

(۵) حسین دوست ابن سید ابوطالب ـــــ تذکرۂ حسینی (۱۱۶۳ھ)
شاعر متین شاہ فقیر اللہ آفرین لاہوری بودہ اقسام شعر خوب می گفتہ۔

(۶) لچھمی نرائن شفیق اورنگ آبادی ـــــ گل رعنا (۸۲-۱۱۸۱ھ)
شاعر معنی آفرین ست و سخن ہزاراں آفریں۔ مولد و منشاء او لاہور
است و اصلش از قبیلۂ جویا۔

(۷) علی احمد خان ہاشمی سندیلوی ـــــ مخزن الغرائب جلد اول (۱۲۱۸ھ)
عزلت گزیں و گوشہ نشیں بودہ .... دایم بجای خود متمکن بودہ
...... صاحب دیوان دوازدہ ہزار بیت است ...... بہ امر نواب
عزلی بدیہہ انشاء کرد بعرض رسانید ...... نواب بسیار محظوظ
گشت و بر پیشانیش بوسہ داد و مبلغ پنج ہزار روپیہ صلۂ آن غزل
بہ شاہ عطا نمودہ وو بدیہہ سیر حاصل بہ او بخشید۔

(۸) سراج الدین علی خان آرزو ـــــ مجمع النفائس (۱۱۶۴ھ)

"شاہ فقیر اللہ آفرین از لاہور است وطن اصلش معلوم نیست۔ غرض بسیار مرد خوش مشرب و آزاد و متوکل بود۔ صوبہ داران لاہور خصوصاً سیف الدولہ عبدالصمد خاں بہادر دلیر جنگ مرحوم و زکریا خاں بہادر پسر او بسیار تعظیم و تکریم و توقیر او می نمودند سرشس بہ اہل دنیا کم فرود می آمد۔ لهذا مدح اغنیاء کم کردہ با فقیر آرزو خیلی ربط غائبانہ بہم رسانیدہ مکالمہ روحانی کہ عبارت است از نامہ و پیغام، درمیان داشت و مرا امام سخنوران می نوشت بہ آنکہ بہ پایۂ مقتدای این فن نہ رسیدہ ام۔ کلیات ضخیمی دارد مشتمل بر قصائد و مثنویات و غزل، بسیار خوش زبان و تازہ خیال بود۔ طور و طرز بیان ناصر علی منظور او بود گاہی استفسار بعضی از مصطلحات تازہ گویان فارسی ازین عاجز می فرمود۔ در لاہور شاگردان بسیار دارد۔ ازان جملہ است حکیم بیگ خاں حاکم تخلص کہ بسیار مرد عزیز و خوش فکر است و بعد از وفات شاہ آفرین دیوان خود را از نظر فقیر از گذرانید"۔

(۹) عبدالحکیم حاکم لاہوری ——— مرزم دہلی (سنہ ۱۱۷۵ھ)

مخدومی شاہ آفرین لاہوری الاصل است۔ از شعرای عہد عالمگیر بادشاہ عمر دراز یافتہ تا سنہ بست و سوم جلوس بادشاہ در عرصۂ حیات بود۔ اکثر بہ طرز میرزا صائب علیہ الرحمۃ و گاہ بہ طور میان ناصر علی مشق می کرد سہ مثنوی دارد یکی مسمی بہ ابجد فکر، در عہد عالمگیر، دوم زبان معرفت در عہد بہادر شاہ و سوم ہیر رانجھا در عہد فرخ سیر، و دیوان ضخیمی در غزلیات و قصائد قریب بہ پنج شش ہزار بیت ایست۔ در عنفوان شباب تحصیل علم و فضل کردہ فاضل و عالم جید بود۔

در رمل نیز دستی داشت و آنچه خان آرزو نوشته که استفسار بعضی از مصطلحات تازہ گویان ازین عاجز می فرمود ایں سخن خالی از تکلف نیست........ با میر احمد فائق و خواجه عبد اللہ سامی و میر محمد علی رائج هم مشق و هم طرح بود و ناصر علی را همراه والد خود که در خط، استاد معزّ الیہ بود در صغر سن دریافته و ناصر علی مثنوی خود به شاه مذکور مغفور تبرکاً عنایت فرمود و گفت هرگاه چشم هوشت وا شود مطالعه خواهی نمود و میرزا بیدل غائبانه تعریف و توصیف ایشان می کرد و ایں بیتش اکثر می خواند۔

حجاب عشقم نه داد رخصت سوال بوس از دہان تنگش
از و نمی آید ایں مروت ز من نمی آید ایں تقاضا

و ناصر علی ایں شعرش پسند نمود :-

تبسمی می کند نیلوفری صبح بنا گوشت
فغاں های شب هجراں شنیدن ها چه می دانی

"باآنکه در علوم عربیه فارغ التحصیل بود به شعر و شاعری میلی تمامی داشت، در کتاب دانی ماهر بی نظیر در افاده مثنوی معنوی یگانه و بی همتا بود و اشعار انتخابی اساتذه از و بسیار شنیده می شد با ایں همه کمال بر خود اصلاً نظر نه داشت با فقراء و غرباء به تواضع و انکسار و با امراء با استغنا و کبریا پیش آمد۔ و بر شعر کسی انگشت اعتراض نمی نهاد و سلف را به خوبی یاد می فرمود و همه را استاد و مرشد خود می دانست و در قناعت و توکل چه گویم که به چه درجه بود! پیش از ملاقات از اکثر مردم شنیده می شد که در گوشهٔ انزوا فاقه ها می کشید و از خانہ

در می آمد .... نواب عبدالصمد خان سیف الدوله مرحوم مکرر خواهش

دیدنش کرده کس به طلبش فرستاد، ابا نمود، آخر به تحریک عزیز عمده

که از مخلصان حمیمش بود بنا بر پاس خاطرش با نواب مرحوم ملاقات

کرد نواب مذکور خیلی تعظیم و توقیرش بجاآورده نزدیک به مسند خود

جا داد و یک روپیه یومیه مقرر کرد. مدت ها این فقیر بخدمت او آمد و

رفت داشته ام و در هفته دو بار به غریب خانه تشریف می آورد و صحبت ها

می شد .... بریں ہیچمدان خیلی مهربان بود و نهایت شفقت

می فرمود. با آنکه مدح کس نه کرد از فرط محبت غزلی در مبارکباد کد

خدای احقر گفته بود .... او سبحانه تعالی اغریق رحمت کند سن

سریفش هشتاد و چند بود که در ۱۱۵۴ھ یک هزار و یکصد و پنجاه و

چهار در لاهور رفت ازیں جهان فانی کشید و به جنت خرامید و بخانه

خود مدفون گردید. فقیر قطعه تاریخ وفاتش گفته بود م. مصرع تاریخ

که همیں یاد بود نوشتم "

رفت نقاد معنی از عالم

(۱۰) مرزا محمد بیرنگ ــــــــ (از تذکره مردم دیده نقل می شود)

.... بعد آں ذکر شاه آفریں به میان آمد، خیلی به تعظیم شاه

مرحوم را یاد کرد و گفت شاه آفریں و میر محمد علی رائج دریں وقت

یا استادند و بس غنیمت اند. مانو مشق بودیم که ایں دو عزیز سخن

را به نهایت رسانیده بودند۔

(۱۱) ملا نتھو فصاحت شا ــــــــ از تذکره مردم دیده نقل می شود

شاگرد شاه آفریں .... از دست

کردم فراموش از دل شعر اسیر و صائب
تا خوانده ام فصاحت دیوان آفرین را

(۱۲) میر محمد معصوم وجدان ـــــ از تذکرہ مردم دیدہ نقل میشود)

.......بادشاہ آفرین و میر محمد علی رائج ہم طرح بودہ........
یک دو دفتر مثنوی معنوی، نزد شاہ آفرین گذرانیدہ قدری اصلاح شعر ہم گرفتہ چنانچہ خود او نزد این فقیر اظہار این معنی نمودہ کہ من ہم شاگرد استادِ شمایم۔

(۱۳) غلام ہمدانی مصحفی ـــــــ عقد ثریا (۱۱۹۹ھ)

در معاصرین خویش شاعر شیرین زبان و قائل فصاحت بیان گذشتہ۔

(۱۴) بندرابن داس خوشگو ـــــ سفینۂ خوشگو ۱۱۳۱ھ (۱۱۶۱ھ)

بر کمال آفرین باد از دو عالم آفرین ... آفرین صد آفرین بل صد ہزاراں آفرین
شاہ لاہور سخن مالک رکاب ملک نظم ... کز سپاہ لفظ و معنی کوس زد در روم و چین
قہرمان طبع او بر فکر شد ہر گہ سوار ... ہمچو نام خود جہاں آورد در زیر نگین
نکتہ ہای طبع او پیچیدہ تر از زلف یار ... .
بکر فکرش ہر کجا بہ رقع انداز در رخ ... . در ثمین
در ریاض خاطر او دانہ خسپی می کند ... خیل معنی ہمچو طاؤس ساں لعز دوس بریں
ای ز شاگردان درگاہ تو استادان وقت ... کرد استاد جہاں شاگرد رب العالمین
بندہ خوشگو کا آرزو از مدت سی سال داشت ... آمدہ در خدمتت شاید کہ گردد بہ ازیں
سایہ ات بر خاکساران زمین شعر باد ... مستظل چوں سایۂ افلاک بر فرق زمین

امابعد۔ ازاں فقیر دیوان ملا آفرین را در بٹالہ بخدمت میاں نورالعین واقف دیدم خطی بر ند اشتم اکثر یا نغز نمایاں دارد بنا بر آنست کہ صحبت

به از در بنا خنه شاعر خانه نشین است. چنانچه ازیں قسم اشعار وی قریب پنجاه شصت از مطلع الف تا تا بر آورده که غلط عروض و قافیه و عبارت بند و بست بسیار داشت. فقیر بسیار نامعتقد شد۔

(۱۵) قدرت اللہ ________ نتائج الافکار (سنہ ۱۲۵۸ھ)

صاحب طبع متین فقیر اللہ آفریں که لاہوری است به نظم پردازی شائستۂ تحسین بوده و بنغز گوئی قابل آفریں دیوانی ضخیم دارد۔

(۱۶) ڈاکٹر ریو کٹلاگر برٹش میوزیم لندن ___ کٹلاگ برٹش میوزیم جلد دوم

Valih, who met him (Afrin) in his native city A.H. 1147 was much struck with his genius, and says that had he only been born in Persia, he would have been the greatest poet of the age.

(۱۷) ڈاکٹر ایتھے کٹلاگر انڈیا آفس لائبریری لندن جلد دوم کٹلاگ

An epopee on the Loves of Hir and Ranjhan (or Ranjha) by Shah Fakr (or rather Fakir)-allah Afarin of Lahur, who, according to fol. 11B, dedicated this poem to the emperor Farrukh Siyar (A.H. 1124-1131)....

....It is somtimes styled. نازونیاز

(۱۸) بھگوان داس ہندی ________ سفینۂ ہندی (سنہ ۱۲۱۹ھ)

"از متوطن لاہور است، مردی درویش از اہل تصوف و صاحب درد

بوده۔ اوقات خود را مصروف عزلت و انزوا می داشت۔ عبد الصمد خان وزکریا خاں صوبہ داران آن شہر پاس تحریم و تکریمش می نمودند۔

(۱۹) غلام حسین شاگرد عبد الرحمن کاتب نسخۂ دیوان شاہ آفریں نسخہ برٹش میوزیم لندن

سنہ کتابت ۱۱۷۵ھ۔ تمام شد نسخہ معتبر کہ تصنیف سلطان العاشقین قدوۃ المحققین ہادی ضالین برہان دین یعنی حضرت محمد آفریں۔

(۲۰) خود شاہ آفرین اپنے متعلق رقمطراز ہے۔ دیوان شاہ آفریں برٹش میوزیم

خیال لعل نوشینی کہ دارد آفریں در دل

کہ ہر مصراعش از معنی شیریں نیشکر باشد

آگہہ نۂ ز سوز دل آفریں ہنوز

فریاد ایں سپند بہر انجمن رسید

ہزاراں مصرعۂ برجستہ ام چوں تیر پیدا شد

شود از قدرداں نام ہنرور آفریں روشن

کند زاہل حسد کلکم آفریں فریاد

فغاں زاغ بایں کبک هم نشیمن شد

ز ہر مصرع چو برقم آفریں از فیض سوز دل

دو صد برجستہ معنی چوں شرر در گوش می آید

(۲۱) حسین قلی خان عظیم آبادی ـــــ نشتر عشق (۱۲۲۴-۱۲۳۳ھ)

از مردم لاہور است۔ ریختہ کلک گوہر سلک او سزاوار صد ہزار تحسین بود و طبع معنی آرای او قابل الالف آفریں....... مولد و منشا او لاہور محلہ نجار است و اصلش از قبیلہ جویہ...... کہ شعبہ ایست از قوم گوجر..... مردی بود درویش مزاج رو از ارباب دول و ابنای دنیا برتافتہ و در گوشۂ انزوا بہ فقر و فاقہ و توکل و قناعت در ساختہ۔

بابِ سوم

شرحِ احوال شاہ فقیر اللہ آفریںؔ لاہوری

دردِ سرِ جہان را ما صندلیم صندل
ما شاعریم عارف ما حکمت خدائیم
(شاہ آفریں)

شرح احوال شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری

تذکروں[1] میں ان کا نام فقیر اللہ اور تخلص آفریں مرقوم ہے وہ چونکہ صوفی تھے اس لئے ان کے نام کے ساتھ شاہ بھی ہے۔ ان کے خاندانی حالات نہیں ملتے۔ راقم حروف کو نہایت تلاش و جستجو کے بعد بھی ناکامی ہوئی۔ فارسی تذکروں میں یہ بڑا عیب ہے کہ کسی کے متعلق ایک ہی طرح کے حالات ملتے ہیں اور تذکرہ نگار کسی کے خاندانی حالات لکھنے کی بہت کم سعی کرتے ہیں۔ خان آرزو، والہ داغستانی، بھگوان داس ہندی، قدرت اللہ اور اس کے عزیز ترین شاگرد حاکم لاہوری نے بھی ان کے خاندانی حالات قلمبند نہیں کیا آزاد بلگرامی نے لاہور میں ان سے کئی بار ملاقات کی تھی اس لئے ان کے بیان کی بڑی اہمیت ہے صرف انہی نے یہ بات لکھی ہے کہ شاہ آفریں کا تعلق قبیلہ جویا سے تھا راقم حروف کو قبیلہ جویا کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا اس لئے اس خاندان کے اسلاف کے حالات قلمبند کرنے سے معذور ہے۔ ان کی جائے پیدائش کا ذکر تذکروں میں ملتا ہے۔ اس عہد کے نامور تذکرہ نگار اور شاعر خان آرزو کو شاہ آفریں کے وطن کا علم نہیں تھا۔

"وطن اصلش معلوم نیست"[2]

لیکن شاہ آفریں کے شاگرد عبدالحکیم حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ شاہ آفریں کا وطن لاہور تھا۔

"مخدومی شاہ آفریں لاہوری الاصل است"[3]

---

[1] مجمع النفائس، مردم دیدہ، ریاض الشعراء، خزانہ عامرہ، عقد ثریا، سفینہ خوشگو، سفینہ ہندی، نتائج الافکار وغیرہ [2] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ صفحہ ۱۷ [3] مردم دیدہ صفحہ ۱۸

آزاد بلگرامی[1]، مصحفی[2]، اور قدرت اللہ[3] متفق ہیں کہ شاہ آفریں کی پیدائش لاہور میں ہوئی تھی۔ کسی تذکرہ سے یہ بات روشن نہ ہو سکی کہ ان کی ولادت کس سال ہوئی تھی اس لئے اس کے متعلق کچھ کہنا بہت مشکل ہے۔ لیکن ان کے شاگرد حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ وفات کے وقت ان کی عمر اسّی سال سے زیادہ تھی اور یہ بات تحقیق شدہ ہے کہ انھوں نے[4] سنہ ۱۱۵۴ھ میں رحلت کی تھی اس بنیاد پر یہ بات قرین قیاس ہے کہ ان کی ولادت سنہ ۱۰۷۲ھ اور سنہ ۱۰۷۶ھ کے درمیان ہوئی ہوگی۔ ذیل میں حاکم لاہوری کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"وسن شریفش ہشتاد و چند بود کہ در سنہ ۱۱۵۴ھ یک ہزار و یک صد و پنجاہ و چہار در لاہور رخت ازیں جہان فانی کشید و بہ جنت خرامید[5]۔

قدرت اللہ کا بیان ذیل میں لکھا جاتا ہے۔

"صاحب طبع متین فقیر اللہ آفریں کہ لاہور است...... در سنہ ۱۱۵۴ھ[5] اربع وخمسین و مائتہ و الف رہ نورد عالم جاوداں گشت"

بھگوان داس ہندی رقمطراز ہے۔

"شاہ فقیر اللہ آفریں تخلص از متوطن لاہور است[6]"

کسی تذکرہ سے یہ بات واضح نہیں ہوتی کہ شاہ آفریں لاہوری کا مسلک کیا تھا۔ ان کے عزیز ترین شاگرد حاکم لاہوری نے بھی اس پر روشنی نہیں ڈالی ہے۔ راقم حروف شاہ آفریں کے دیوان کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ وہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے ان کے دیوان میں جا بجا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں اشعار ہیں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

رنگ باطل زدا علی رضا[7] — مرشد حق نما علی رضا

---

[1] خزانہ عامرہ صفحہ ۲۸ [2] عقد ثریا صفحہ ۸ [3] نتائج الافکار صفحہ ۵۹ [4] مردم دیدہ صفحہ ۲۲
[5] نتائج الافکار صفحہ ۵۹ [6] سفینۂ ہندی صفحہ ۱۱ [7] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۶، ۲۷ برٹش میوزیم لندن

مشکلات دو کون آسان کن	پیر مشکل کشا علی رضا
در گہش فتح باب عرفان است	قفل باطل کشا علی رضا
عاشقم عاشق آفریں دارم	درد دل را شفا علی رضا

تا چند آہ شعلہ کشد یا علیؓ مدد

ریزد زنم چو شمع جسد یا علیؓ مدد[1]

موقوف یک بہار کرم ہمچو عنبر است

شد نامہ ام سیاہ مدد یا علیؓ مدد

حسرت تمام چشم بدار الشفای تست

درد دلم یکی شدہ صد یا علیؓ مدد

بر تست پیش من نفسی آرمیدہ

بیتابیم رسا ست مدد یا علیؓ مدد

می نالد از ستمگری چرخ آفریں

جز تو بگو کہ داد دہد یا علیؓ مدد

حضرت امام حسنؓ و حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی مدح میں شاہ آفریں کے دیوان میں کئی جگہ اشعار ملتے ہیں ذیل میں ان کی ایک غزل مسلسل نقل کی جاتی ہے جس میں ان دونوں حضرات کی مدح کی گئی ہے سنی مسلمان بھی اصحاب اہل بیت سے محبت رکھتے ہیں لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ وہ اصحاب کرام سے بھی محبت رکھتے ہیں۔

چراغ انجمن مرتضا حسینؓ و حسنؓ	سرور سینہ خیر النساء حسینؓ و حسنؓ
صفای باطن ایماں ضیای دیدہ دین	صفای وقت رسول خدا حسینؓ و حسنؓ
بہار فیض و دم صبح ہستی کونین	خمیر مایہ نشو و نما حسینؓ و حسنؓ

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۸۰ برٹش میوزیم۔

جدای عشق که نقد آزمای ما باست [1] — نه زیره آن است کم از انبیا حسین رض و حسن رض

نفس به آئینہ باد صبا به گل نه کند — کشید آئینه زدو نان به وفا حسین رض و حسن رض

هوای آل نبی آفرین دوای تو است — تو درد مند دوا الفنی حسین رض و حسن رض

شاہ آفریں کے دیوان میں ذیل کا شعر بھی ہے جس سے یہ واضح ہوتا ہے کہ زمین مکہ کو وہ شرف حاصل نہ ہو سکا جو خاک کربلا کو حاصل ہوا۔ یہ بات قابل اعتراض ہے کیونکہ مکہ کو سرزمین کربلا پر ہی فوقیت حاصل نہیں ہے بلکہ اس کو مدینہ پر بھی برتری حاصل ہے۔ مدینہ وہ مقام ہے جہاں سرور کائنات صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم آرام فرما ہیں اور مکہ وہ جگہ ہے جہاں خدا کا پہلا گھر یعنی خانہ کعبہ ہے۔

ظاہر ہے خانہ کعبہ کو آرام گاہ رسول صلعم پر برتری حاصل ہے کیونکہ۔

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

جب مدینہ منورہ، مکہ معظمہ سے افضل نہیں ہے تو پھر شاہ آفریں کا مندرجہ ذیل شعر میں یہ کہنا کہ خاک کربلا کو زمین مکہ پر شرف حاصل ہے کیسے درست ہو سکتا ہے۔

با سرزمین مکہ نہ دانند ایں شرف
سازند سبحہ خاک شہیدان کربلا [2]

شاہ آفریں کے دیوان میں آٹھ اوراق پر مشتمل نہایت طویل ایک ترجیع بند بھی حضرت امام حسین و حسن اور شہدائے کربلا کی مدح میں مرقوم ہے جس میں درد و جانگدازی اپنے بلند مقام پر ہے ذیل میں اس کا مطلع قلمبند کیا جاتا ہے۔

دل سوخت در ہوای حسین رض و حسن رض مرا
جان نیز از برای حسین رض و حسن رض مرا [3]

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۱۶ [2] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۷۲۔ مخطوط لندن
[3] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۷۲

اوائل زندگی اور تعلیم | شاہ آفریں ایک معزز اور شریف خانوادہ کے چشم و چراغ تھے۔ آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق ان کا نسب بارہ خاندان ... تک پہنچتا ہے۔ جو لوگ یہ جانتے ہیں کہ عام طور پر پست خانوادے کے افراد علم و فضل اور دانشوری کے مقام بلند پر نہیں پہنچتے ہیں۔ جس شخص کو بچپن اور کم سنی ہی سے اچھا ماحول ملتا ہے وہ ضرور درجہ کمال پر پہنچتا ہے اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ ان کی پرورش اور تعلیم و تربیت بہت اچھے ماحول میں ہوئی ہوگی مگر معتبر طور پر یہ بات نہیں کہی جا سکتی ہے کہ ان کے ایام اور شباب فارغ البالی کے ساتھ بسر ہوا ہوگا بہت ممکن ہے کہ یہ دن بھی تنگدستی میں گزرے ہوں کیونکہ کسی تذکرہ سے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ ان کے خانوادہ میں کوئی ایسا شخص رہا ہو جس نے ان کی کفالت کی ہو۔ کسی تذکرہ نگار نے ان کے کسی رشتہ دار کا ذکر نہیں کیا ہے اور یہ بھی نہیں لکھا ہے کہ ان کے والد محترم کا پیشہ کیا تھا۔ حتی کہ راقم حروف کو یہ بھی علم نہ ہو سکا کہ شاہ آفریں جیسے مجمع کمالات انسان کے پدر بزرگوار کون تھے[1] ان کے کسی رشتہ دار کے بارے میں بھی کچھ معلوم نہ ہو سکا جس سے یہ قیاس کیا جاتا کہ کسی نے ان کو کسی وقت مالی مدد پہنچایا ہوگا۔ اگر شاہ آفریں کو کوئی جائداد یا آمدنی کا کوئی مناسب ذریعہ ہوتا تو ان کا شاگرد حاکم لاہوری اپنے تذکرہ میں یہ نہیں لکھتا کہ وہ گوشہ نشینی کی زندگی گذارتے اور اکثر فاقے کرتے تھے۔

"پیش[2] از ملاقات از اکثر مردم شنیدہ می شد کہ در گوشہ انزوا فاقہ ہا می کشید و از خانہ بر نمی آمد چنانچہ خود می فرماید"

بفتوای خرد از کشف صورت ہم بتر باشد
توکل پیشہ را یک گام بیرون از استان نبود

---

[1] خزانہ عامرہ صفحہ ۲۸ — [2] مردم دیدہ صفحہ ۳۰

شاہ آفریں لاہوری کی ولادت بہ عہد عالمگیر بادشاہ ۱۰۷۲ھ/۱۶۶۲ء کے حدود میں ہوئی ہوگی۔ بادشاہ عالمگیر ۱۰۶۹ھ میں تخت نشین ہوا تھا اور اس نے پچاس سال تک حکومت کی۔ اس کے عہد سلطنت میں ہندوستان پر کسی بیرونی حملہ آور نے چڑھائی نہیں کی اس لیے سیاسی طور پر اس دور میں بڑا سکون اور اطمینان لوگوں کو نصیب تھا ہر طرف خوشحالی و فارغ البالی تھی مگر جو شخص گوشہ نشینی اور فقر کو سن رشد ہی سے پسند کرتا ہو بھلا اس کے لیے عافیت اور خوشحالی کہاں ہے؟ شاہ آفریں کی زندگی کے تقریباً تیس سال عالمگیر بادشاہ کے عہد سلطنت میں گزرے گویا وہ عالمگیر بادشاہ ہی کے عہد سلطنت میں پیدا ہوئے اور جوان بھی ہوئے۔ ان کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وہ عہد عالمگیر بادشاہ کے شعرا میں سے تھے۔

"از شعرای عہد عالمگیر بادشاہ"[1]

بادشاہ عالمگیر کو شعر و شاعری سے دلچسپی نہیں تھی۔ اس لئے اس کے زمانہ میں دربار سے ملک الشعرا کا رواج ختم ہو گیا۔ ویسے بھی شاہ آفریں ایک گوشہ نشین تھے بھلا وہ اورنگ زیب کے دربار میں جانا کیسے پسند کرتے ان کے ذیل کے شعر سے ان کے قناعت پیشہ ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔

قناعت پیشہ ام از بسکہ دارم پاس آب خود
چو یاقوت است دایم سرخ از موج شراب خود[2]

شاہ آفریں لاہوری نے کن استادوں سے درس لیا تھا یہ بھی باوجود تلاش معلوم نہ ہو سکا ان کے دیوان میں بھی کہیں پر ان کے استاد کا نام نہیں آیا ہے۔ اس لئے یہ بات کہنی مشکل ہے کہ ان کے استاد کون تھے ان کے شاگرد حاکم لاہوری کے

---

[1] مردم دیدہ صفحہ ۱۸ [2] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۲۷

بیانات سے اتنا معلوم ہو سکا کہ وہ علوم عربیہ میں فارغ التحصیل تھے اور کتاب دانی میں ماہر اور بے نظیر تھے۔ مثنوی معنوی کا انھوں نے نہایت دقیق مطالعہ کیا تھا اور اس مثنوی معروف کے اشعار سے خود بھی فیضیاب ہوئے تھے اور عوام کو بھی فیض پہنچایا تھا یہاں پر یہ ذکر کرنا بیجا نہ ہوگا کہ مثنوی معنوی فارسی میں قرآن کریم کی تفسیر ہے کسی شاعر نے تو اس کو قرآن کریم ہی کہا ہے۔

مثنوی مولوی معنوی　　　ہست قرآن در زبان پہلوی

مولانا روم نے خود کہا ہے کہ جو شخص مثنوی معنوی پر عمل کرتا ہے وہ آسمان علم و فضل و روحانیت پر پہنچ جاتا ہے۔ ذیل میں شعر ملاحظہ ہو۔

نردبان آسمان ست این کلام
ہر کہ زیں برمی رود آید بہ بام

قیاس کیا جاتا ہے کہ جب وہ علوم عربیہ میں فارغ التحصیل اور شعر و شاعری میں درجۂ کمال پر تھے تو انھوں نے ضرور اپنے وقت کے باکمال استادوں سے درس لیا ہو گا اگر یہ فرض کیا جائے کہ انھوں نے اس دور کے جلیل القدر استادوں سے کسب علم نہیں کیا تو ایسی حالت میں ان کا باکمال ہونا نہایت تعجب کی بات ہے۔ ان کے عہد کے وہ تذکرہ نگار جنھوں نے ان سے شرف ملاقات بھی حاصل کیا تھا ان حضرات نے اپنے تذکروں میں شاہ آفریں کے علم و فضل کی بڑی ستائش کی ہے۔ خود ان کے شاگرد حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ شاہ آفریں نے اپنی جوانی کے آغاز ہی میں علم و فضل حاصل کرکے فاضل اور جید عالم ہو گئے تھے۔ علم رمل میں بھی ان کو دستگاہ تھی۔ علم رمل وہ علم ہے جس سے احوال گذشتہ و آئندہ بشرطیکہ وہ شخص اس علم میں کامل ہو معلوم ہو جاتا ہے۔ خان آرزوؔ نے اپنے تذکرہ میں

---

۵ مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ صفحہ ۱۸

لکھا ہے کہ شاہ آفریں کبھی کبھی اس سے زبان فارسی کے نئے مصطلحات دریافت کرتے تھے لیکن شاہ آفریں کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ یہ بات تکلف سے خالی نہیں ہے یعنی حاکم لاہوری، خان آرزو کی اس بات سے متفق نہیں ہے کہ شاہ آفریں نے کبھی خان آرزو سے فارسی کے نئے مصطلحات دریافت کئے تھے۔ حاکم لاہوری کی اس تردید سے یہ بات روشن ہوتی ہے کہ شاہ آفریں خان آرزو سے کمتر نہیں تھے ذیل میں حاکم لاہوری کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"در عنفوان شباب تحصیل علم و فضل کردہ فاضل و عالم جید بود و در رمل نیز دستی داشت. و آنچہ خان آرزو نوشتہ کہ استفسار بعضی از مصطلحات تازہ گویان ازیں عاجزی فرمود ایں سخن خالی از تکلف نیست"[1]

حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ مرزا بیدل بھی غائبانہ طور پر شاہ آفریں کی تعریف اور توصیف کرتے تھے اور اکثر ان کے ذیل کے شعر کو پڑھتے تھے۔

حجاب عشقم نہ داد رخصت سوال بوس از دہان تنگش
از ونمی آید ایں مروت زمن نمی آید ایں تقاضا[2]

مرزا بیدل اپنے وقت کے ایک نہایت باکمال شاعر تھے اور انہوں نے ترک دنیا اختیار کیا تھا۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجای خویشتن
من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش

ان کا (بیدل) شاہ آفریں کی تعریف کرنا قابل صد آفریں ہے۔ ذیل میں حاکم لاہوری کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"میرزا بیدل غائبانہ تعریف و توصیف ایشان می کرد و ایں بیتش اکثر می خواند"[3]

---

[1] [2] مردم دیدہ صفحہ ۱۹، ۱۸

حجاب شستم نہ داد رخصت سوال بوس از دہانش
از دو می آید ایں مروت ز من نمی آید ایں تقاضا

حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ جب شاہ آفریں صغر سنی ہی میں تھے کہ ناصر علی اپنے والد کے ساتھ شاہ آفریں سے ملنے آئے تھے اور ان کو اپنی مثنوی تبرکاً عنایت کرتے ہوئے کہا تھا کہ جب آپ کو شعور آجائے اُس کا مطالعہ کریں گے۔ ناصر علی کی شاہ آفریں سے یہ ملاقات شاہ آفریں کے صغر سنی میں ہوئی تھی یعنی شاہ آفریں تقریباً پندرہ بیس سال کے ہوں گے چونکہ آفریں کی ولادت ۱۰۶۲ھ اور ۱۰۷۶ھ کے درمیان ہوئی ہوگی اس لئے قیاس ہے کہ ناصر علی ۱۰۹۶ھ یا ۱۱۰۰ھ کی حدود میں شاہ آفریں سے ملے ہونگے اور اس میں شبہ نہیں کہ ۱۱۰۸ھ یا ۱۱۰۹ھ میں ناصر علی نے وفات پائی تھی۔ اسلئے حاکم لاہوری کا یہ بیان صحیح ہو سکتا ہے کہ اس کے استاد شاہ آفریں سے ناصر علی ملنے آئے تھے۔

مرزا بیدل شاہ آفریں کے ایک شعر کو اکثر پڑھتے تھے جسے راقم حروف قبل لکھ چکا ہے۔ وہ غائبانہ طور پر شاہ آفریں کی تعریف بھی کرتے تھے لیکن دونوں کی ملاقات کا ذکر کہیں نہیں ملتا ہے مرزا بیدل ۲ر صفر ۱۱۳۳ھ تک بقید حیات تھے اور شاہ آفریں بھی زندہ تھے اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ بیدل نے شاہ آفریں کی تعریف کی ہوگی واللہ اعلم بالصواب۔

شاہ آفریں کی فطرت میں خاکساری، انکساری، اور تواضع درجۂ کمال پر تھا۔ انھوں نے کبھی بھی اپنے آپ پر فخر نہیں کیا علاوہ ازیں وہ غریبوں اور فقیروں سے نہایت عاجزی سے ملتے تھے البتہ امراء اور ارکان دولت سے ملنا پسند نہیں فرماتے تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ فقیروں کو اہل دنیا سے کیا کام شاید وہ عرفاء کے ذیل کے مقولوں پر عمل کرتے تھے۔

صحبۃ الاغنیا تحزن الفقرا ۶

ترجمہ: (امیروں کی صحبت فقراء کو غمگین کرتی ہے)

قرب السلطان کقرب النیران

ترجمہ: (شاہ کی قربت آگ کی قربت کے مثل ہے)

من ارتفع نفسہ ثبت حمقہ

ترجمہ: (جو اپنے نفس کو بلند سمجھے اس کی حماقت پختہ ہے)

شاہ آفریں سبھوں کو اپنے سے بڑا سمجھتے تھے اور استاد و مرشد کی طرح سبھوں کا احترام کرتے تھے۔

"بااین ہمہ کمال بر خود اصلاً نظر نہ داشت با فقراء و عزباء بہ تواضع و انکسار و با امراء با استغناء و کبریا پیش می آمد و بر شعر کسی انگشت اعتراض نمی نہاد و سلف را بہ خوبی یادمی فرمود و ہمہ را استاد و مرشد خود می دانست"[1]

بھگوان داس ہندی[2] کا بیان ہے کہ شاہ آفریں ایک مرد درویش اور اہل تصوف میں سے تھے ان کا سینہ درد کا مخزن تھا اور وہ اپنی زندگی کے اوائل حصے میں بھی گوشہ نشین رہتے تھے۔ عبدالصمد خاں بہادر صوبہ دار لاہور اور ان کے بیٹا زکریا خاں، جو بعد میں لاہور کے صوبہ دار ہوئے ان کی نہایت تحریم و تکریم کرتے تھے۔ یہ بات قابل غور ہے کہ نواب عبدالصمد خاں بہادر نے دو بار شاہ آفریں کی خدمت میں نذر بھیجکر ان کو اپنے یہاں طلب کیا تھا مگر دونوں بار انھوں نے ان کے یہاں جانے سے انکار کیا آخر شاہ آفریں کے کسی مقرب عزیز نے شاہ آفریں کو سمجھایا کہ نواب مذکور بہت نیک اور مخلص ہیں تب شاہ آفریں ان سے ملاقات کرنے گئے حاکم لاہور کا بیان

---

[1] مردم دیدہ صفحہ ۲۰ [2] سفینہ ہندی صفحہ ۱۱

ہے کہ نواب مذکور نے ان کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اپنے مسند کے نزدیک ان کو بٹھایا ہی نہیں بلکہ ایک روپیہ روزانہ کے حساب سے ان کا وظیفہ بھی مقرر کیا۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ چونکہ خود عبدالصمد خاں اہل دل اور فقراء میں سے تھے اس لئے وہ شاہ آفریں کے مقام کو اچھی طرح پہچانتے تھے ورنہ شہر لاہور میں شعراء علماء اور فضلا کی کمی نہیں تھی۔ گرچہ نواب مذکور شعراء اور فضلا کے زبردست سرپرست اور مربی تھے لیکن ان کو جو خلوص اور محبت شاہ آفریں سے تھی وہ شاید ہی کسی سے ہو اس سے پتہ چلتا ہے کہ شاہ آفریں اپنے معاصرین میں ایک بلند مقام کے حامل تھے۔ مشک آنست کہ خود بوید نہ کہ عطار بگوید۔ ذیل میں بھگوان داس ہندی کا بیان ملاحظہ ہو۔

"مردی درویش از اہل تصوف و صاحب درد بودہ، اوقات خود را مصروف عزلت و انزوامی داشت، عبدالصمد خاں و زکریا خاں صوبہ داران آں شہر پاس و تحریم و تکریمش می نمود"[1]

اب شاہ آفریں کے شاگرد عزیز حاکم لاہوری کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"نواب عبدالصمد خاں سیف الدولہ مرحوم مکرر خواہش دیدنش کرد و کس بہ طلبش فرستاد ابا نمود ـــــ آخر بہ تحریک عزیز عمدہ کہ از مخلصانہ ہمیشہ بود بنا بر پاس خاطرش با نواب مرحوم ملاقات کرد نواب مذکور خیلی تعظیم و توقیرش بجا آورد نزدیک بہ مسند خود جا داد و یک روپیہ یومیہ مقرر کرد"[2]

علی قلی والہ داغستانی کو مرزا صائب اصفہانی سے بڑی عقیدت تھی کیونکہ

---

[1] سفینۂ ہندی صفحہ ۱۱ [2] مردم دیدہ صفحہ ۲۰
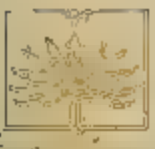
مرزا صائب اپنے عہد میں بلند ترین مقام کے حامل تھے۔ شاہ آفریں کو بھی مرزا صائب سے بیحد عقیدت تھی اور انھوں نے بھی صائب کی روش کو پسند کیا تھا۔ اس سے ان کے باکمال ہونے کا پتہ چلتا ہے کیونکہ انھوں نے مرزا صائب جیسے باکمال شاعر کی روش کو اختیار کیا تھا۔ ذیل کے شعر میں انھوں نے خود کہا ہے کہ میں گلشن ہند کا ایک رنگین نوا بلبل ہوں اور صائب اصفہان کے شیریں سخنور تھے۔

منم از گلشن ہند آفریں رنگین نوا بلبل
اگر شد صائب شیریں سخن از اصفہان پیدا[1]

حاکم لاہوری بھی رقمطراز ہے کہ شاہ آفریں اکثر بہ طرز مرزا صائب اور کبھی کبھی ناصر علی کے رنگ میں شعر کہتے تھے۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ شاہ آفریں نے سن شعور ہی سے شعر کہنا شروع کیا ہوگا کیونکہ ایسے باکمال استاد اور سخنور سن شعور ہی سے شاعری کرتے ہیں جیسا کہ شیخ سعدی، مولانا جامی، امیر خسرو، حافظ شیرازی اور دیگر بہت سارے شعراء کے متعلق ہم لوگ جانتے ہیں کہ انھوں نے کم عمری ہی سے شعر گوئی کا آغاز کیا تھا۔

"اکثر بہ طرز میرزا صائب علیہ رحمتہ وگاہ بطور میاں ناصر علی مشق می کرد"[2]

خان آرزو رقمطراز ہے کہ شاہ آفریں خوش مشرب، آزاد خیال، اور متوکل تھے وہ نہایت شیریں زبان تھے اور نئے خیالات کو شاعری کے لباس میں جلوہ دیتے تھے۔

"بسیار خوش زبان و تازہ خیال بود"[3]

نظامی عروضی نے لکھا ہے کہ اگر کوئی شخص بڑا شاعر بننا چاہتا ہے تو اس کو نامور استادوں کے دواوین کا مطالعہ کرنا ضروری ہے اور ان کے اشعار کو اپنے ذہن میں

---

[1] دیوان آفریں لاہوری ورق ۲۲ [2] مردم دیدہ صفحہ ۱ [3] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ صفحہ ۱

محفوظ رکھے۔ شاہ آفریں کے متعلق ان کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ انھوں نے اساتذہ کے اشعار کا نہایت عمدہ انتخاب کیا تھا اور ان سے بہت سارے اشعار اس نے سنا تھا کیونکہ وہ ایک مدت تک ان کے یہاں جاتا رہا اور ہفتہ میں دو بار خود شاہ آفریں اس کے غریب خانہ پر تشریف لاتے تھے اور صحبتیں ہوتی تھیں اس لئے حاکم کے بیان کی بڑی اہمیت ہے اور چونکہ وہ ایک مذہبی آدمی تھا اور حج بیت اللہ سے بھی بہرہ ور ہوا تھا اس لئے یقین کیا جاتا ہے کہ اس کا بیان صحیح ہے۔

"............اشعار انتخابی اساتذہ ازو بسیار شنیدہ می شد.....

....مدت ہا ایں فقیر بخدمت او آمد و رفتہ داشتہ ام و در ہفتہ دو بار بہ غریب خانہ تشریف می آورد و صحبت ہا می شد"[1]

شاہ آفریں مجمع کمالات تھے وہ ایک صوفی تو تھے ہی ایک ممتاز شاعر بھی تھے جس کا ثبوت یہ ہے کہ حاکم لاہوری، عنقا، مفتون، لا تخلص فصاحت و اقف، ہنر اور وہدان جیسے شعرا نے ان سے شرف تلمذ حاصل کیا تھا۔ شاہ آفریں کی بزرگی فضل و کمال کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ ان کا دل حسد سے خالی تھا۔ جس شخص کے دل میں حسد نہیں ہوتا ہے وہ کسی پر اعتراض نہیں کرتا ہے وہ شعرائے سلف کو بھی احترام کے ساتھ یاد کرتے تھے اور ہمعصر شعرا پر نکتہ چینی نہیں کرتے تھے بلکہ یہ سمجھتے تھے کہ ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق شعر کہتا ہے اگر ان کے اشعار بھی قابل تحسین نہیں ہیں تو کوئی بات نہیں اس عقیدہ کے ثبوت میں ذیل میں ان کا شعر نقل کیا جاتا ہے:

خوب می گوید بقدر فہم ہر کس آفریں
نیست بی جا شعر ما گر قابل تحسیں نہ شد[2]

---

[1] مردم دیدہ صفہ ۲۰ [2] دیوان شاہ آفریں ورق ۹۳ ب

آفریں اس بات کو سوچ کر روتے تھے کہ لوگ کیوں کسی بیوفا کے پیچھے وفاداری میں اپنی عمر برباد کرتے ہیں۔ اس خیال کو انھوں نے ذیل کے شعر میں پرو دیا ہے:

آیدم ای آفریں گریہ بہ حال خودم عمر بہ بی وفا صرف وفا می شود[1]

شاہ آفریں عشق حقیقی اور معرفت سے سرشار تھے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک جلیل القدر صوفی تھے کیونکہ وہ اکثر گوشہ نشیں رہتے تھے اور فاقے کرتے تھے تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا ان کو پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم سے بیحد عقیدت اور محبت تھی جس کا اظہار انھوں نے بہت سارے اشعار میں کیا ہے ذیل میں چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ہر ذرہ آفتابیست از طینت محمدؐ زاں سایہ نہ دارد در حضرت محمدؐ
بی فیض و بی عنایت مگذار آفریں را ہم بندۂ تو یارب ہم امت محمدؐ[2]

غم نیست مصطفیٰ مددی تست آفریں
آں را کہ برتو از دل خود رایۂ تو باشد[2]

فخر دو عالم نام محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم
عزت آدم نام محمدؐ صلی اللہ علیہ وسلم[3]

شاہ آفریں نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ انھوں نے اپنے آپ کو تسلیم و رضا کی نعمتوں سے پالا ہے۔ اگر زہر بھی ان کو پینے کے لیے ملتا ہے تو ان کے حلق میں جا کر وہ شربت بن جاتا ہے اللہ والوں کی شان ہی نرالی ہوتی ہے ان کو کسی بات کا غم نہیں ہوتا ایسے ہی حضرات کے متعلق قرآن کریم میں آیا ہے۔

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۹۵ [2] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۲۰ [3] دیوان آفریں ۱۲۸، ۲۰۱

اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ ۝

ذیل میں ثبوت کے لئے شاہ آفریں کا شعر پیش کیا جاتا ہے۔

بہ نعمت ہای تسلیم و رضا پروردہ ام خود را

بہ کامم آفریں شربت شود گر زہر ناب آید

ایسے ہی اللہ والوں کے متعلق علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے۔

ھر کہ اندر دست او شمشیر لاست[1]

جملہ موجودات را فرمانرواست

بندرابن داس خوشگو نے لکھا ہے کہ اس نے لاہور میں شاہ آفریں سے شرف ملاقات حاصل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن اسکو مختصر مدت اقامت کی وجہ سے شاہ آفریں سے ملنے کا موقع نہیں مل سکا اس لئے اس نے ایک غزل ان کی مدح میں لکھ کر ان کی خدمت میں بھیج دیا وہ اس غزل کو پڑھ کر بہت مسرور ہوئے۔ اس غزل میں اس نے آفریں کی بہت تعریف کی ہے اور ان کی ذات کو قابل صد ہزار آفریں کہا ہے ان کو لاہور کے سخنوروں کا شہنشاہ اور ملک شاعری کا مالک کہا ہے[2] ان کی شاعری کی شہرت روم اور چین میں تھی ان کے شاگردان اپنے زمانہ کے استاد تھے جب شاگردان کا یہ مقام ہو کہ وہ استاد وقت ہوں تو پھر استاد آفریں کا کیا مقام ہوگا۔ غرضکہ خوشگو نے جو ان کے معاصرین میں سے تھا انکی بڑی تعریف کی ہے۔ ذیل میں خوشگو کی اس غزل سے تین شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

بر کمال آفریں باد از دو عالم آفریں

آفریں صد آفریں بل صد ہزاراں آفریں

---

[2] سفینۂ خوشگو صہ ۲۳۹-۲۴۰

شاہ لاہور سخن مالک رکاب ملک نظم
کز سیاہ لفظ و معنی کوس زد دار دم و چین
ای ز شاگردان درگاہ تو استادان وقت
کرد استاد جہاں شاگرد رب العالمین[۱]

والہ داغستانی ایرانی نژاد اور اہل زبان تھا اس نے کئی مرتبہ لاہور میں شاہ آفریں سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ ڈاکٹر ریو نے ریاض الشعراء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ والہ داغستانی شاہ آفریں کی شخصیت سے نہایت متاثر تھا اور ۱۱۴۷ھ میں لاہور میں ان سے ملاقات کی تھی اس کا بیان ہے کہ اگر شاہ آفریں ملک ایران میں پیدا ہوتے تو اپنے عہد کے سب سے بڑے شاعر ہوتے ذیل میں ڈاکٹر ریو کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

Valih, who met him (Afrin) in native city A.H. 1147 was much struck with his genius, and says that had he only been born in Persia, he would have been the greatest poet of the age.

۱؎ سفینۂ خوشگو ص ۲۲۹--۲۳۰ ۲؎ کٹلاگ برٹش میوزیم جلد دوم

باب چہارم

شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری کے اواخر زندگی کے حالات، سال وفات اور مدفن

ذکر کن آن قدر کہ بانگ زند
مو بہ مو لا الٰہ الا اللہ
(شاہ آفریں)

شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری کے اواخر زندگی کے حالات

شاہ آفریں لاہوری کے احوال تذکروں میں تفصیل سے نہیں ملتے ہیں اس لیے راقم حروف کو بہت دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ خان آرزو، آزاد بلگرامی اور واله داغستانی نے بھی ان کے حالات مکمل طور پر قلمبند نہیں کیے۔ حالانکہ آزاد بلگرامی اور واله داغستانی نے ان سے ملاقاتیں کی تھیں اگر یہ حضرات خیال میں رکھتے تو ان سے بہت کچھ دریافت کر سکتے تھے۔ لیکن فارسی کے کسی تذکرہ نگار کو اس سے کیا مطلب کہ وہ ہر شخص کے بارے میں تفصیل سے لکھے۔ بیشتر تذکرہ نگاروں نے تذکرہ لکھتے وقت اس اصول پر عمل کیا ہے کہ جن شعراء سے ان کے دوستانہ تعلقات تھے ان کے متعلق نہایت تفصیل سے لکھا ہے لیکن جن سے تعلقات نہیں تھے یا کم تھے ان کے متعلق کم ہی لکھا ہے۔ اس عہد کے نامور تذکرہ نگار خان آرزو نے بھی شاہ آفریں کے حالات کو داخل کرنے کی کوشش نہیں کی جبکہ شاہ آفریں سے اس کی خط و کتابت تھی مگر صرف تیرہ ۱۳ سطور میں ان کے حالات کو قلمبند کیا ہے۔ اللہ کا شکر ہے کہ شاہ حاکم لاہوری نے اپنے استاد گرامی شاہ آفریں لاہوری کے حالات قدرے واضح طور پہ لکھا ہے گرچہ تشنہ ہے اس نے اپنے تذکرہ میں ان کے احوال کو قلمبند کر کے حق شاگردی ادا کیا۔ ورنہ شاہ آفریں کی زندگی کے بعض اہم پہلو پردۂ خفا میں رہ جاتے۔

راقم حروف نے جیسا کہ اس سے قبل کے باب میں ذکر کیا کہ شاہ آفریں کی زندگی کے تقریباً تیس سال عالمگیر بادشاہ کے عہد سلطنت میں گذرے وہ اسی عہد میں

متولد ہونے اور شباب کو بھی پہنچے ۔ ان کی زندگی کے چار سال اور گیارہ مہینے بہادر شاہ (محمد معظم پسر دوم اورنگ زیب) کے دور سلطنت میں گزرے اٹھارہ مہینے کی مدت جہاندار شاہ (معز الدین پسر بہادر شاہ) کے عہد سلطنت میں انھوں نے گزاری۔ شاہ آفریں نے بادشاہ فرخ سیر کا زمانہ بھی دیکھا جو چھ سال کا عرصہ ہے۔

انھوں نے اپنی حیات کے تین مہینے رفیع الدرجات بادشاہ کے دور سلطنت میں بسر کئے اور پھر رفیع الدولت ہندوستان کا بادشاہ ہوا لیکن بدقسمتی سے چند ہی دنوں میں اس نے انتقال کیا۔ شاہ آفریں نے اپنی حیات میں حضرت امیر خسرو کی طرح سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا۔ شاہ آفریں کے لئے ساتواں بادشاہ محمد شاہ رنگیلے تھا جس کے عہد سلطنت میں شاہ آفریں نے اپنی زندگی کے تقریباً چوبیس سال گزارے امیر خسرو نے جن سات بادشاہوں کا زمانہ دیکھا تھا ان کے نام ذیل میں تحریر کرنا بے مناسب نہ ہوگا۔

(۱) سلطان غیاث الدین بلبن (۲) معز الدین کیقباد
(۳) سلطان محمد (۴) سلطان جلال الدین خلجی
(۵) سلطان علاء الدین خلجی (۶) قطب الدین مبارک
اور (۷) سلطان غیاث الدین تغلق

حضرت امیر خسرو کو اللہ نے لمبی عمر عطا کی تھی۔ شاہ آفریں کو بھی اسّی سال سے زیادہ کی عمر ملی تھی بلکہ نوشگونے تو نوے سال بتایا ہے۔

راقم حروف کئی وجہ سے شاہ آفریں اور امیر خسرو میں مماثلت پاتا ہے۔ اول یہ کہ ان دونوں صوفی شعراء کو طویل عمر ملی۔ دوم یہ کہ یہ دونوں میدان غزل کے پہلوان تھے سوم یہ کہ امیر خسرو نے جہاں عشقیہ مثنویاں لیلی مجنوں اور شیریں خسرو لکھی ہیں وہاں شاہ آفریں نے بھی ہیر رانجھا کو منظوم کیا ہے صوفیانہ مثنوی خسرو کی مطلع الانوار

ہے اور شاہ آفریں نے رمنانِ معرفت کے نام سے ایک صوفیانہ مثنوی لکھی ہے آفریں کی مثنوی ہیر رانجھا کا دوسرا نام مثنوی ناز و نیاز بھی ہے۔ آفریں کی تیسری مثنوی ابجد فکر ہے۔ چہارم یہ کہ امیر خسرو اور شاہ آفریں دونوں عشق الٰہی اور معرفت سے لبریز تھے۔

فارسی اور اردو کے بیشتر شعراء عشق مجازی سے عشق حقیقی تک پہنچے۔ والٓہ داغستانی نے اس عہد کے باکمال صوفی شاعر فقیرؔ دہلوی کے متعلق لکھا ہے کہ اوائل میں وہ عشق مجازی میں ایسے گرفتار تھے کہ بعض اوقات پانچ چھ معشوقوں سے سروکار رکھتے تھے لیکن جب عشق مجازی میں اس کو شکست ہوئی تو وہ عشق حقیقی کی طرف بے تابانہ لپکا اور دنیائے معرفت میں ایک مقام حاصل کیا ذیل میں والٓہ داغستانی کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"میر عالی مذبور ہرگز بی شور محبتی و جذبۂ عشقی نمی باشد گاہ ہست کہ با پنج شش معشوق سروکار دارد و گاہ تخفیف دارد بہ یک کس قناعت می فرمایند"[1]

قانون قدرت ہے کہ عشق مجازی میں ناکامی کے بعد ہر ذی روح کے دل مجروح ہوتے ہیں اور انسان یہ سوچتا ہے کہ خواہ مخواہ اس نے اپنے قیمتی اوقات، مال و دولت کو فانی و بیوفا معشوق کے پیچھے برباد کیا۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچنے کے بعد ہر عاشق کے لئے عشق حقیقی کی راہیں آسان ہو جاتی ہیں۔ فارسی کے مشہور رباعی گو شاعر سرمد شہید علیہ رحمہ نے بھی عشق مجازی سے عشق حقیقی کو حاصل کیا۔ تواریخ اور تذکروں میں بہت ساری ایسی شخصیتوں کا ذکر ملتا ہے جنھوں نے عشق مجازی کے بعد عشق حقیقی کا راستہ اختیار کیا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ عشق انسان کا پیدائشی اور فطری حق ہے۔ نامور قصیدہ گو شاعر عرفی شیرازی

---

[1] ریاض الشعراء ص ۳۱۴

کا بھی یہی عقیدہ تھا کہ انسان عشق مجازی کا مزہ چکھنے کے بعد ہی عشق حقیقی کی طرف مائل ہوتا ہے۔ ذیل میں عرفی کا شعر ملاحظہ ہو۔

میدہ دل را بہر آگاہی زصیاد ازل
درکمند طرۂ عنبر فشاں انداختہ [1]

لیکن شاہ آفریں کے احوال کے گہرے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ انھوں نے کبھی عشق مجازی کی چوٹ نہیں کھائی تھی کیونکہ کوئی تذکرہ اس بات کی طرف اشارہ نہیں کرتا ہے۔ والہ داغستانی جیسے صاف گو تذکرہ نگار نے فقیر دہلوی کے عشق مجازی کا ذکر کیا لیکن گرچہ شاہ آفریں سے اسکی پیہم ملاقات ہوئی تھی۔ اس کے باوجود اس نے ان کی زندگی کے اس گوشہ کی طرف اشارہ نہیں کیا شاہ آفریں کے عزیز ترین شاگرد حاکم لاہوری اور اس دور کے تذکرہ نگار خان آرزو آزاد بلگرامی اور خوشگو نے بھی اس بات کو نہیں لکھا کہ وہ عاشق مزاج تھا۔ اس بنیاد پر یہ بات قرین قیاس ہے کہ صغر سنی ہی سے زہد و ورع ان کی فطرت میں تھی۔ انھوں نے اپنے ذیل کے شعر میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ ان کی پرورش تسلیم و رضا کے ماحول میں ہوئی ہے۔

بہ نعمت ہای تسلیم و رضا پروردہ ام خود را
بہ کامم آفریں شربت شود گر زہر ناب آید [2]

انھوں نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کو حضرت خضرؑ کی طرح زندہ جاوید ہونا چاہیئے کیونکہ ان کو کسی اور معشوق نے قتل نہیں کیا ہے بلکہ اسی معشوق ازلی کے عشق میں مقتول ہوا ہے۔

---

[1] قصائد عرفی [2] دیوان آفریں ورق ۱۲۷

چوں خضرؑ چرا زندہ جاوید نہ باشم
قاتل چو تو ئی آب حیات است کفن ہم[1]

ڈاکٹر رضا زادہ شفق رقمطراز ہے کہ ایرانی تصوف کی دو قسمیں ہیں۔

(۱) منفی:۔ ترک دنیا، ترک لباس، ترک شہوت اور فارغ ہونا۔ یہ تصوف ہندوستانی تصوف سے قریب تر ہے۔

(۲) مثبت:۔ خدائے تعالیٰ کے حکم کے مطابق زندگی بسر کرنا، خدمت خلق، عشق الٰہی، ایثار، عبادت، خلوص، محبت وغیرہ۔

صوفی کامل وہی ہے جو قرآن کریم کے قوانین سے باخبر ہو علاوہ ازیں علم منطق اور دلیل سے بھی بہرہ ور ہو عبادات اور ذکر حق سے مقام صوفیت حاصل کرے اور اپنے دل و دماغ میں اللہ کی مخلوق کی محبت رکھے دل مثل آئینہ روشن ہو اور یہ عقیدہ رکھے کہ ذرہ ذرہ میں نور الٰہی پوشیدہ ہے۔ ڈاکٹر رضا زادہ شفق مغفور کا بیان ہے کہ صوفیا کا مسلک فروتنی، خاکساری، اور درویشی ہے۔ راقم حروف یہ بات واضح کرنا چاہتا ہے کہ سارے صوفیائے کرام بے ریائی، عاجزی، تواضع اور خدمت خلق کے محاسن سے آراستہ تھے۔ اور وہ حضرات خود تکلیفیں اٹھانا پسند کرتے تھے مگر دوسروں کو تکلیفیں نہیں دیتے تھے۔ حضرت خواجہ غریب نوازؒ علیہ رحمہ کے سلسلے میں مرقوم ہے کہ ایک بار آپ اپنے خلیفہ حضرت قطب الدین بختیار کاکی علیہ رحمہ سے ملنے کے لئے خود دہلی تشریف لے گئے تھے۔ آپ کو اچانک دیکھ کر حضرت کاکی علیہ رحمہ بہت حیرت زدہ ہوئے اور انھوں نے فرمایا کہ آپ نے کیوں زحمت کی مجھے بلا لیا ہوتا۔ حضرت خواجہ غریب نواز علیہ رحمہ یہ سن کر

---

[1] دیوان آخریں ورق ۲۰۲ [2] ہندالولی غریب نواز ص۸۵

مسکرائے اس واقعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ گرچہ حضرت غریب نواز علیہ رحمہ حضرت کاکی علیہ رحمہ کے پیر و مرشد تھے۔ لیکن آپ نے اپنے عزیز ترین خلیفہ اور مرید حضرت کاکی علیہ رحمہ کو اجمیر آنے کی زحمت دینا مناسب نہیں سمجھا۔ اس لئے آپ خود پا پیادہ دہلی تشریف لے گئے۔ صوفیائے کرام ناموری اور شہرت سے مدام بھاگتے رہے اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور طاقت کے سامنے دنیا کی بڑی سے بڑی طاقتوں کو کمزور سمجھا ان حضرات نے کبھی اپنے فضل وکمال کو خیال میں نہیں لایا یہی نہیں دولت اور ثروت سے حتی المقدور دور رہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ آفریں اپنے عصر کے ایک بلند مقام صوفی اور اہل معرفت تھے۔ ان کا دل عشق الٰہی اور حب رسول سے لبریز تھا جیسا کہ ان کے ذیل کے اشعار سے بھی روشن ہوتا ہے۔

دردسر جہاں را ما صندلیم صندل
ما شاعریم عارف ما حکمت خدا ایم
با شہ بہ یک قبائیم ہرچند ما گدائیم
در چشم مردم دید تشریف توتیائیم
در جزو ما کتابی در ہر کتاب علمی
ما نکتۂ دقیقم ما سرّ کبریائیم

ذیل کے چند اشعار بھی ملاحظہ ہوں۔

خوش بگو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ	گو بگو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
من و تو مدعت غلط بینی ست	ہمہ او لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
بزم توحید و بادہ عرفانم	ہای ہو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ
ذکر کن آں قدر کہ بانگ زند	مو بمو لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ

عــزت دین احمد مرسل　　آبرو لاالٰہ الا اللہ

چند ناپاک از خودی تا چند　　بی وضو لاالٰہ الا اللہ

نتواں یافت آفریں اور ا　　جز باد لاالٰہ الا اللہ[1]

امام غزالیؒ علیہ رحمہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کرنا چاہیئے تاکہ فلاح ملے حدیث نبوی میں مذکور ہے کہ اللہ کا ذکر، صدقات، خیرات اور جہاد سے عمدہ عمل ہے۔

شاہ آفریںؒ لاہوری ایک مرد عارف اور ممتاز صوفی تھے کیونکہ صوفیا کے جو عادات واطوار ہوتے ہیں وہ سب ان میں پائے جاتے تھے مثلاً خان آرزو نے لکھا ہے کہ وہ متوکل تھے اور اہل دنیا سے بہت کم ملتے تھے علاوہ ازیں امرار و اغنیا کی مدح سے انھوں نے حتی المقدور پرہیز کیا ان کے شاگرد حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ وہ فاضل اور جید عالم تھے ظاہر ہے کہ علم کے بغیر عشق حقیقی کی راہیں طے کرنے میں دشواریاں درپیش ہوتی ہیں۔ کسی اہل دل کے لئے یہ لازم ہے کہ وہ علم کلام اور احادیث نبوی سے واقف ہو ورنہ دوسری صورت میں اس کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے ایسے صوفیائے کرام جو علم کلام اور احادیث نبوی سے بے خبر ہوتے ہیں راہ معرفت میں ان کی پرواز بلند نہیں ہوتی ہے حضرت بختیار کاکی علیہ رحمۃ اپنے مریدوں سے اکثر فرماتے تھے کہ جاہل فقیر شیطان کا مسخرہ ہے۔ عاجزی وخاکساری، تصوف کی روح ہے۔ یہ صفت ہم لوگ شاہ آفریں لاہوری کی زندگی میں دیکھتے ہیں مثلاً باوجود جامع کمالات ہونے کے انھوں نے کبھی اپنے آپ کو بڑا نہیں سمجھا۔ حاکم لاہوری نے مزید لکھا ہے کہ وہ فقرا اور غربا سے عاجزی اور انکساری کے ساتھ

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۳۶ [2] تبلیغ دین اردو ترجمہ اربعین اخصر والیسر ص ۲۰، ۲۲

ملتے تھے البتہ امرا سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے شاعروں کی عام طور پر یہ فطرت ہوتی ہے کہ وہ اپنے ہمعصر شعرا کو اپنے آپ سے کمتر سمجھتے ہیں لیکن شاہ آفریں لاہوری کے اخلاق حمیدہ کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ انھوں نے کبھی کسی شاعر کے شعر پر نکتہ چینی نہیں کی یہی نہیں وہ اپنے اسلاف کا بھی بہت احترام کرتے تھے اور سبھوں کو اپنا مرشد واستاد سمجھتے تھے حاکم لاہوری نے جو ان کے شاگرد تھے اور بار بار ان کی صحبتوں سے فیضیاب ہوئے تھے لکھا ہے کہ شاہ آفریں کے قناعت اور توکل کا کیا ذکر کیا جائے کہ ان دونوں صفات میں وہ کس مقام پر تھے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اکثر لوگ یہی کہتے تھے کہ وہ گوشہ نشین رہتے ہیں اور فاقے کرتے ہیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور نے ایک روپیہ روزانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا تھا جو آج کل کے حساب سے کم سے کم سو روپئے کے برابر ہوگا لیکن اس رقم کو شاہ آفریں کیا کرتے تھے۔ اس کا ذکر کسی تذکرہ میں نہیں ملتا۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ اس رقم کو وہ غربا اور مساکین میں پوشیدہ طور پر خرچ کرتے ہونگے کیونکہ بیشتر صوفیا کا یہی طریقہ رہا ہے۔ حضرت خواجہ نظام الدین اولیا علیہ رحمۃ کے متعلق مشہور ہے کہ آپ کا لنگر خانہ دن رات کھانا تقسیم کرتا تھا مگر خود بہت کم کھاتے تھے ایک دن آپ کے کسی چہیتے مرید نے آپ سے کہا کہ حضرت آپ اتنا کم کیوں کھاتے ہیں اس طرح آپ کمزور ہوجائیں گے آپ نے فرمایا کہ بھائی بہت سے لوگ بھوکے ہیں تو نظام کیسے بھر پیٹ کھائے گا اپنی وفات کے قبل آپ نے کسی سے فرمایا کہ جاؤ لوگوں سے کہدو کہ جہاں کھانے پینے کا سامان اور غلہ رہتا ہے اس کا تالا توڑ کر لوٹ لیں اور صرف ایک روز کا چھوڑ دیں تاکہ کل قیامت کے دن مجھے حساب نہ دینا پڑے یہ ہیں صوفیا کے طور طریقے جن کا ذکر راقم حروف نے ابھی کیا۔ تذکروں کی روشنی میں بغیر کسی شبہ کے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ شاہ آفریں کو اِدھر اُدھر

سے جو کچھ ملتا تھا اس رقم کو وہ ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیتے ہوں گے ورنہ ان کے شاگرد حاکم لاہوری کی یہ بات غلط ہو جائے گی کہ ایک روپیہ روزانہ صوبہ دار لاہور کی طرف سے ملتا تھا (آج یہ رقم سو روپیوں کے برابر ہے) تو پھر اتنی بڑی رقم روزانہ ملنے کے باوجود شاہ آفریں فاقے کیوں کرتے تھے وہ اکثر ذیل کا شعر پڑھا کرتے تھے جس سے ان کے عزم راسخ کا پتہ چلتا ہے۔

به فتوائے خرد از کشف عورت هم بتر باشد[1]
توکل پیشه را یک گام بیرون ز آستان خود

"با این همه کمال بر خود اصلاً نظر نداشت با فقرا و غربا بتواضع و انکسار و با امرا استغنا و کبریا پیش می آمد و بر شعر کسی انگشت اعتراض نمی نهاد و سلف را بخوبی یاد می فرمود و همه را استاد و مرشد خود می دانست و در قناعت و توکل چه گویم که به چه درجه بود! پیش از ملاقات از اکثر مردم شنیده می شد که در گوشهٔ انزوا فاقه ها می کشید و از خانه بر نمی آمد....... و یک روپیه یومیه مقرر کرد"[2]

راقم حروف کو کسی تذکرہ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ شاہ آفریں نے کس عمر میں گوشہ نشینی اختیار کیا تھا لیکن عام طور سے لوگ ساٹھ برس کے بعد ہی گوشہ نشین ہوتے ہیں اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ وہ تقریباً بیس سال سے زیادہ مدت تک گوشہ انزوا میں رہے ہونگے کیونکہ ان کی عمر اسّی سال سے زیادہ تھی۔

والہ داغستانی کا بیان ہے کہ ایسی شخصیت جس کے دل میں شاہ آفریں کی طرح درد عشق الٰہی ہو کم دیکھی گئی۔

[1، 2] مردم دیدہ صفحہ ۲۰

"دریں شہر بہ سخن سرائی مشہور بود۔ در ۱۱۴۰ھ کہ راقم حروف وارد بلدۂ مزبور گردید او را طلبیدم چون ترک آمیزش خلق خصوص اغنیاء و ارباب دنیا کردہ عزلت گزیں مضائقہ نمود ...... الحق بہ ایں دردمندی کم کسی دیدہ شدہ۔ غرض تا در لاہور بودم اکثر قدم رنجہ می نمودہ و اثر صحبتش بر ولولہ و شورم می افزود۔"[1]

آزاد بلگرامی رقمطراز ہے۔

"شاعرے بود معنی آفریں و شائستۂ صد ہزار آفریں از مردم فناجبۂ است"[2]

خان آرزو کا بیان ملاحظہ ہو۔

"...... بسیار مرد خوش مشرب و آزاد و متوکل بود .... سرش بہ اہل دنیا کم فرود می آمد۔ لہذا مدح اغنیا کم کردہ"[3]

شاہ آفریں کا یہ عقیدہ تھا کہ اللہ تعالی ہی خالق کل موجودات ہے اور اسی کو ہر شئی میں تغیر و تبدل کا اختیار ہے۔ بندہ اپنی لاکھ طاقت اور صلاحیت کے باوجود یہ قدرت نہیں رکھتا کہ اللہ تعالی کی مرضی کے خلاف کچھ کر سکے۔

ان کے شاگرد حاکم لاہوری[4] نے ایک روز ان کی خدمت میں خواجہ منور قدرت[5] کا ذیل کا شعر پڑھا وہ سنکر متبسم ہوئے اور فرمایا معلوم ہوتا ہے کہ اس عزیز نے خلاقی کا دعوی کیا ہے شعر ملاحظہ ہو۔

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۴۴ [2] خزانہ عامرہ ورق ۲۸

[3] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص ۱۷ [4] مردم دیدہ ص ۱۸۲

نشیبی بر لب بالای جاناں کردہ ام پیدا
شریک غالب چاہ زنخداں کردہ ام پیدا

شاہ آفریں نے امیر خسرو کی طرح ہندوستان کے موسم وغیرہ پر اشعار کہے ہیں۔ ان کو اپنے وطن ہندوستان سے بڑی محبت تھی جس کا یہ ثبوت ہے کہ انھوں نے ایک غزل بسنت رُت سے متعلق بھی کہی ہے جسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

زبسکہ طبل طرب زد بہر دیار بسنت ‏‏ بود مقدمۃ الجیش نو بہار بسنت
بنوش ندیماں و نغمہ گل و مل ‏‏ کند تلافی یک سالہ انتظار بسنت
گرفت روی زمیں موج زعفران النشاط ‏‏ کشودہ است ز کشمیر عنبر بار بسنت
بکام جان چہ کہن عیشہا کہ تازہ کند ‏‏ بگونہ گونہ تنعم دریں بہار بسنت
چنیں کہ خون تماشائیاں بجوش آرد ‏‏ مگر ز داغ جنونست لالہ کار بسنت
بایں تفرج و ایں انبساط جا دارد ‏‏ کند ز نسبت نوروز عید عار بسنت
شگفتہ بخت تماشائیاں کہ می آرد ‏‏ درست زر زگل خوشی نثار بسنت
تمام دل ہمہ تن جان بہشت کہ ترزدوق ‏‏ کزو گرفت خوشی نسخہ یادگار بسنت
تمام شوم رد آفریں بوجد آیم ‏‏ مراز شاہ حسین است یادگار بسنت[1]

شاہ آفریں کی حیات میں ہندوستان کی تاریخ میں کئی اہم واقعات وقوع پذیر ہوئے۔ عالمگیر بادشاہ نے تقریباً پچاس سال ہندوستان پر حکومت کرنے کے بعد رحلت کی۔

بعد ازاں ان کا بیٹا محمد اعظم شاہ تخت سلطنت پر جلوہ افروز ہوا لیکن اس

---

[1] دیوان آفریں ورق ۸۰ لندن

کے بڑے بھائی نے آپس میں ایک بڑی جنگ چھیڑ دی۔ محمد اعظم شاہ اس جنگ میں مقتول ہوئے اور محمد معظم پسر دوم عالمگیر بادشاہ بہادر شاہ کے نام سے ۱۱۱۹ھ میں تخت پر بیٹھا۔ شاہ آفریں نے اپنی زندگی میں وہ دن بھی دیکھا کہ ۱۱۲۴ھ میں جہاں دار شاہ تخت نشین ہوا اور اس وقت شاہ آفریں کی عمر تقریباً اکاون (۵۱) سال تھی۔ ان کو اس سانحۂ عظیم سے نہایت روحی تکلیف پہنچی ہوگی کہ بہادر شاہ کے بیٹوں میں تخت حاصل کرنے کے لئے زبردست خونریزی ہوئی جس کو خان آرزو نے قیامت صغری کہا ہے[1]۔ انجام کار بہادر شاہ کے پسر دوم محمد عظیم الشان، پسر سوم محمد رفیع الشان جہاں شاہ مقتول ہوئے اور بڑا بیٹا معز الدین جہاں دار شاہ کے نام سے تخت نشین ہوا جہاں دار شاہ صرف اٹھارہ مہینے تک ہندوستان کا بادشاہ رہا کیونکہ محمد فرخ سیر پسر دوم محمد عظیم الشان اور جہاں دار شاہ کے درمیان جنگ چھڑ گئی جہاں دار شاہ اپنی جان بچانے کے لئے دہلی کی طرف بھاگا اور محمد فرخ سیر ۱۱۲۵ھ میں ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ لیکن خونریزی و قتل و غارت سرزمین ہندوستان میں یہیں پر نہیں رکی بلکہ فرخ سیر کو بھی سید برادرس نے اندھا کر دیا اور بعدہٗ ۱۲ جمادی الثانی ۱۱۳۱ھ میں اس کو قتل کرا دیا۔ سید برادرس نے بعد ازاں رفیع الدرجات کو ہندوستان کے تخت پر بٹھایا لیکن کسی بات پر ناچاقی ہوگئی اس لئے سید برادرس نے تین ماہ کے بعد ہی اس کو قتل کرا دیا۔ اور رفیع الدرجات کے بھائی رفیع الدولت کو تخت پر بٹھایا۔ لیکن چند دنوں کے بعد ہی اس نے انتقال کیا[2]۔ بہت ممکن ہے کہ اس کو زہر دیکر مار ڈالا ہو۔ بعد ازاں بہادر شاہ کا پوتا اور جہاں شاہ کا بیٹا محمد شاہ ہندوستان کا بادشاہ ۱۱۳۱ھ میں ہوا جو تاریخ میں محمد شاہ رنگیلے کے نام سے

---

[1] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص ۵۲ [2] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص ۵۳

مشہور ہے اسی بادشاہ کے عہد سلطنت میں شاہ آفریں نے رحلت کی۔

صوفیا اور اہل اللہ کا دل نہایت نرم و نازک ہوتا ہے اور وہ حضرات کسی کی معمولی تکلیف پر بھی تڑپ اٹھتے ہیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے متعلق یہ بات مشہور ہے کہ آپ کسی کی تھوڑی سی بھی تکلیف دیکھ کر آبدیدہ ہو جاتے تھے۔ دیگر صحابہ دل کے اتنے نرم و نازک تھے کہ کسی کو ذرا بھی تکلیف نہیں پہنچانا چاہتے تھے انھوں نے اپنی زندگی غرباء اور فقراء کے لیے وقف کر دیا تھا اور دوست اور دشمن سبھوں کی تکلیف سے متاثر ہوتے تھے۔ ان کی حیات میں ہندوستان کی سرزمین پر بادشاہوں کے عزیزوں اور حقداروں کے درمیان کئی بار قتل و خونریزی ہوئی اور بہت سارے شہزادے اور بادشاہان وقت مقتول ہوئے ایسی صورت میں بھلا شاہ آفریں جیسے حساس دل انسان کیسے متاثر نہ ہوئے ہونگے۔ ان کو گرچہ دربار اور امراء سے کوئی مطلب نہیں تھا مگر مغل شاہزادوں اور بادشاہوں کے خون جس طرح بہے اس سانحہ سے شاہ آفریں جیسے صوفی تو کیا عام انسان بھی کانپ اٹھتے ہیں۔

شاہ آفریں لاہوری کی زندگی کا ایک اہم واقعہ ہندوستان پر نادر شاہ کا حملہ ہے۔ انھوں نے نادر شاہ کے اس قتل عام کو اپنی آنکھوں سے تو نہیں دیکھا تھا مگر وہ اس وقت بقید حیات تھے اس لئے انھوں نے ضرور نادر شاہ کے حملہ اور قتل عام کے متعلق لوگوں سے چشم دید واقعات سنے ہوں گے سنہ ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ نے کرنال کے میدان میں اپنی فوجوں کو اکٹھا کیا۔ بادشاہ محمد شاہ اور نادر شاہ کی فوجوں میں گھمسان کی لڑائی ہوئی۔ اس جنگ میں صمصام الدولہ کو ایسا زخم لگا کہ جانبر نہ ہو سکے۔ برہان الملک سعادت خاں نیشاپوری کو نادر شاہ کے سپاہیوں نے پکڑ کر قیدی بنا لیا۔ آخر کار ہندوستانی فوجوں کو شکست کا منھ دیکھنا پڑا۔

کسی طرح محمد شاہ اور نادر شاہ کے مابین صلح اس بات پر ہوئی کہ نادر شاہ کو دو کروڑ روپیہ کا نذرانہ دیا جائے۔ تاریخ میں مذکور ہے کہ نادر شاہ کو اور زیادہ لالچ ہوگئی اور وہ اس صلح سے مکر گیا۔ بادشاہ محمد شاہ نے اس کو بہت سمجھایا کہ وہ دو کروڑ کی رقم لے کر کرنال ہی کے میدان سے واپس ایران چلا جائے مگر وہ رضامند نہ ہوا۔ محمد شاہ کو سارے خزانوں اور لال قلعہ کی کنجیاں بھی اس کو دینی پڑیں۔ بتاریخ ۹ ذی الحجہ جمعہ کے دن ۱۱۵۱ھ میں نادر شاہ لال قلعہ میں داخل ہوا۔ دوسرے ہی دن عید الاضحیٰ کا متبرک تیوہار تھا۔ جامع مسجد دہلی میں خطبہ میں نادر کا نام لیا گیا۔ بقر عید کے دوسرے دن بوقت عصر یہ بات پھیل گئی کہ نادر شاہ مارا گیا۔ نادر شاہ کو یہ بات معلوم ہوئی اس لیے وہ بہت غصہ ہوا اور اس نے صرف مدافعت کا حکم جاری کیا تھا۔ لیکن ہندوستانی سپاہیوں نے ایرانیوں کو مارنا شروع کیا۔ تذکروں میں مذکور ہے کہ اس رات تقریباً سات سو سپاہی مقتول ہوئے۔ نادر شاہ کو جب یہ خبر ملی تو اس نے قتل عام کا حکم دیدیا دوپہر تک مقتول ہندوستانیوں کی تعداد شمار سے باہر تھی۔ لاشوں کے تعفن سے دہلی کی ہوا خراب ہوئی۔ کوتوال نے گرے ہوئے مکانوں کی لکڑیاں جلا کر لاشوں کو خاک کر دیا۔ تذکروں میں لکھا ہے اتنے لوگ مقتول ہوئے کہ شہر دہلی لاشوں سے پٹ گیا۔[1] انجام کار نادر شاہ نے دو کروڑ روپئے نقد محمد شاہ سے لیا علاوہ ازیں ہیرے، جواہرات، اور تخت طاؤس کو بھی اپنے ساتھ لیتا گیا۔ نادر شاہ کا خوف ایسا غالب ہوا کہ روتے بچے بھی اس کا نام سن کر چپ ہو جاتے تھے۔ شاہ آفریں لاہوری اس سانحۂ عظیم سے بیحد متاثر ہوئے ہونگے اور مخلوق کے قتل عام پر خون کے آنسو روئے ہوں گے۔

---

[1] سیر المتاخرین ص ۸۵

شاہ آفریں نے اسّی سال سے زیادہ کی عمر پائی لیکن کسی تذکرے سے یہ پتہ نہ چل
[illegible] ذریعہ معاش کیا تھا۔ انھوں نے شاعری کو رزق کا ذریعہ نہیں بنایا تھا
[illegible] بادشاہ وقت یا امرائے زماں کی مدح میں ان کے قصیدے یا اشعار نہیں ملتے
[illegible]) سے انھوں نے صرف نواب عبد الصمد خاں بہادر صوبہ دار لاہور کی
[illegible]) چند اشعار ایک غزل میں کہے ہیں۔ تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے
[illegible] مذکور نے ایک روپیہ روزانہ کا وظیفہ ان کے لئے مقرر کیا تھا۔ لیکن نواب
[illegible] میں انتقال کیا اور شاہ آفریں اس کی وفات کے بعد چار سال تک
[illegible] اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ نواب مذکور کی رحلت کے بعد شاہ آفریں
[illegible] بند ہو گیا ہو گا کیونکہ نواب مذکور کے صاحبزادہ نواب زکریا خاں بہادر کو شعراء
[illegible] دلچسپی نہ تھی اس لئے زیادہ امکان اسی بات کا ہے کہ نواب عبد الصمد
[illegible] بہادر کی رحلت کے بعد شاہ آفریں کو مالی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا ہو گا۔ لیکن
[illegible] کہ انھوں نے کبھی کسی کے سامنے دست سوال نہیں پھیلایا۔ جیسا
[illegible] شاگرد حاکم لاہوری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے۔

"در قناعت و توکل چہ گویم کہ بہ چہ درجہ بود! پیش از ملاقات
از اکثر مردم شنیدہ می شد کہ در گوشۂ انزوا فاقہ ہای کشید[1]"

شاہ آفریں فارسی شاعری میں ایک باکمال اور مسلم الثبوت استاد تھے
[illegible] اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ شاہ آفریں کبھی کبھی فارسی زبان کے نئے
[illegible] دریافت کرتے تھے۔

"[illegible] استفسار بعضی از مصطلحات تازہ گویان فارسی ازیں عاجز می فرمود[2]"

[illegible] سے مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص ۱۷

شاہ آفریں کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ خان آرزو ... شاہ
آفریں کبھی کبھی فارسی کے نئے مصطلحات اس سے دریافت کرتے تھے ...
خالی نہیں ہے۔ گویا حاکم لاہوری نے خان آرزو کے مندرجہ بالا دعویٰ کو غلط قرار دیا
اس لئے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ شاہ آفریں فارسی کے نئے معنی
سے بھی باخبر تھے۔ اور زبان پر ان کو قدرت حاصل تھی۔ راقم حروف حاکم لاہوری
کے مندرجہ بالا بیان کو صحیح سمجھتا ہے لیکن والہ داغستانی کا بیان ہے کہ شاہ آفریں
کی شاعری میں بعض جگہ غلط لغات و مصطلحات استعمال ہوتے ہیں۔ راقم حروف
والہ داغستانی کے اس بیان سے متفق ہے کیونکہ وہ ایک ایرانی الاصل اور اہل زبان
شاعر و نثار تھا مگر مجھ کمترین کا یہ خیال ہے کہ شاہ آفریں نے مولانا روم کی طرح مطالب
کو الفاظ اصطلاحات، فرہنگ، اور قواعد شاعری پر ترجیح دی ہے۔ شاعری کو شاہ آفریں
نے ناموری اور شہرت کا ذریعہ نہیں سمجھا تھا۔ مولانا روم نے فرمایا کہ میں شاعری نہیں
کرتا بلکہ میرے سینے میں جب خون جوش کھاتا ہے تو میں اس کو شعر کے قالب میں
ڈھال دیتا ہوں۔

"خون چوں می جوشد منش از شعر رنگی می دہم[1]"

بالکل یہی حال شاہ آفریں کا تھا کیونکہ انھوں نے شاعری کو اسلئے نہیں اختیار
کیا تھا کہ اس فن کے ذریعہ مال و دولت اور شہرت حاصل کی جائے۔
خوشگو رقمطراز ہے کہ یہ بات لوگوں میں مشہور تھی کہ شاہ آفریں نوّے سال
کی عمر میں بھی خضاب لگاتے تھے۔ کسی شخص نے ان سے یہ بات دریافت کی اس
میں کیا حکمت ہے۔ انھوں نے فی البدیہہ ذیل کا شعر پڑھا۔

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۸ ب

دشمن زندگی ست موئے سفید
روئے دشمن سیاہ باید کرد[1]

خوشگو نے جہاں خضاب کا ذکر چھیڑا ہے وہاں مناسب ہے کہ شاہ آفریں کی زندگی کے بعض اہم پہلو پر روشنی ڈالی جائے تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شاہ آفریں بڑے اصول اور ضابطہ کے آدمی تھے ان کی زندگی کے ہر شعبے میں صفائی اور نظافت تھی اس لئے وہ اپنے سفید بالوں کا اپنی اصلی حالت پر رہنا پسند نہیں کرتے تھے یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے بالوں میں خضاب استعمال کرتے تھے مندرجہ بالا شعر کتنا لطیف اور منطق پر مبنی ہے۔ انسان کے بال جیسے ہی سفید ہونے لگتے ہیں ان کو یہ احساس ہونے لگتا ہے کہ ان کی عمر گھٹ رہی ہے اس خیال کے آتے ہی انسان پر ایک جمود اور مایوسی کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے اور کارخانۂ قدرت کے جس کام میں انسان شریک ہے اس میں سستی آجاتی ہے اسی لئے شاہ آفریں نے سفید بال کو دشمن سے تشبیہہ دی ہے اور جب دشمن کا منھ کالا ہوتا ہے تو انسان کو خوشی ہوتی ہے۔

تذکروں میں یہ بات مرقوم ہے کہ شاہ آفریں امراء سے ملنے میں بہت پرہیز کرتے تھے۔ نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور نے دو بار آدمی بھیج کر ان کو بلایا لیکن وہ نہیں گئے۔ والہ داغستانی نے بھی ان کو بلایا لیکن وہ ان کے یہاں نہیں گئے یہ اس وقت کی بات ہے (۱۱۴۷ھ) جب والہ داغستانی لاہور میں اقامت پذیر تھا والہ داغستانی کو ان سے ملنے کا بڑا اشتیاق تھا۔ کیونکہ اس نے ان کی بڑی تعریف سنی تھی اس لئے اس نے ایک رقعہ شاہ آفریں کے نام لکھا اور ساتھ ہی ساتھ اپنا

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۲۳۹

ایک قصیدہ، کچھ غزلیں اور ذیل کا شعر بھی لکھ کر ان کی خدمت میں بھیجا۔

دیدن من وحشت افزاید بیا بین بہار

نکتۂ تسبیع سعدی خبرداں من آید بیرا

شاہ آفریں والہ داغستانی کے رقعہ کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور والہ داغستانی کی اقامت گاہ پر گئے اس سے معذرت چاہی اور چند دنوں تک والہ داغستانی کے یہاں وہ مقیم رہے اس واقعہ سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ عام طور گرچہ امراء سے ملنے میں گریز کرتے تھے لیکن اگر کوئی لائق اور مخلص شخصیت ان کو اپنے یہاں بلاتی تھی تو وہ ضرور ان سے ملنے تشریف لے جاتے تھے وہ یہ جانتے تھے کہ اگر کوئی مخلص اور فاضل انسان ان سے ملنا چاہے تو ان کو ضرور ملنا چاہیئے۔ البتہ مغرور امراء سے وہ ملنے میں بالکل گریز کرتے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ کسی کے دل کو خوش کرنا حج اکبر سے کم نہیں ہے جیسا کہ شیخ سعدی نے بھی کہا ہے۔

دل بدست آور کہ حج اکبر است

راقم حروف نے جیسا کہ قبل ذکر کیا کہ شاہ آفریں امراء سے ملنے میں گریز کرتے تھے لیکن مخلص اور منکسر المزاج امراء سے ملتے تھے جب وہ ان کو بلاتے تھے۔ نواب عبدالصمد خاں بہادر صوبہ دار لاہور نے ان کو دو بار بلایا لیکن وہ نہیں گئے مگر جب ان کو اس بات کا علم ہوا کہ نواب مذکور نہایت مخلص اور خاکسار ہیں تو وہ ان سے ملنے گئے اور وظیفہ بھی پایا۔ یہاں پر یہ بات واضح کر دینا مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شاہ آفریں نے نواب مذکور سے ایک روپیہ روزانہ کا وظیفہ اس لئے قبول کیا کیونکہ نواب مذکور نہایت مخلص اور پابند شرع صوبہ دار تھا۔ حاکم لاہوری نے یہاں تک ان کے متعلق لکھ دیا ہے کہ انھوں نے کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں کی تھی۔

"ختم احزاب و نماز تہجد گاہے از ایشاں ناغہ نہ شدہ وہر روز

دوصد اکسی بلکہ زیادہ طعام نوشش جاں می فرستد

نہ ہمت [illegible] شریف صفت انسان تھے اور

ان کے اعمال گھاتے تھے ایسی حالت میں اگر شاہ آفریں نے ان کا عطا کیا ہوا وظیفہ قبول

کیا تو کوئی عیب کی بات نہیں۔ اہلِ دل کی طرف سے دیا ہوا تحفہ ٹھکرانا گناہ کی

بات ہے۔ حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ جب ان کے استاد شاہ آفریں کی رحلت

کا دن قریب آیا تو ایک دن اس نے حضرت امام الشہداء شاہ کربلا علیہ التحیۃ

والسلام کی منقبت میں ایک قصیدہ لکھ کر ان کی خدمت میں پیش کیا جس

کا ایک شعر یہ ہے۔

چوں سبحہ کہ بگسلد بر زمین فتد

[illegible] گشت عمر ماند بہ دل جا بجا گرہ

خوش آں زمانہ کہ پئے یاد دیدہ ام

می زد ز لطف یار بہ بند قبا گرہ

شاہ آفریں نے قصیدہ کو پڑھا بہت پسند کیا اور روتے ہوئے فرمایا

کہ ہم جا رہے ہیں ہمارے بعد ہماری جگہ تم کو ملے گی انشاء اللہ تعالیٰ۔ اس کے

بعد انھوں نے ذیل کا یہ شعر پڑھا۔

جہاں را نماند بی کد خدا   یکی می رود دیگر آید بجا

حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ شاہ آفریں نے اسی سال سے زیادہ کی عمر میں

[illegible] میں بمقام لاہور رحلت کی۔ حاکم لاہوری شاہ آفریں کا عزیز ترین

شاگرد تھا اس لیے جو تاریخ وفات اس نے لکھی ہے اس کے صحیح ہونے کا زیادہ

امکان ہے۔ اس نے اس موقع پر قطعہ تاریخ بھی کہی تھی لیکن تذکرہ مردم دیدہ

[illegible] کے دماغ سے اشعار محو ہو گئے تھے صرف ذیل کا

مصرع اس کو یاد تھا۔

رفت نقاد معنی از عالم
۱۱۵۲ھ

حاکم لاہوری کے بیان کے مطابق شاہ آفریں اپنے مکان ہی میں مدفون ہوئے۔

"......... مای رویم، بعد از ماشما جای مای گیرید .... سن

شریفش ہشتاد و چند بود کہ در سنہ ۱۱۵۴ھ یک ہزار دیکصد

و پنجاہ و چہار در لاہور رخصت ازیں جہان فانی کشید و بجنت خرامید

و بخانہ خود مدفون گردید فقیر قطعہ تاریخ وفاتش گفتہ بودم مصراع

تاریخ کہ ہمیں یاد بود نوشتم"

رفت نقاد معنی از عالم[1]

آزاد بلگرامی[2] اور قدرت اللہ[3] بھی متفق ہیں کہ شاہ آفریں نے ۱۱۵۴ھ میں وفات

پائی لیکن مصحفی نے سال رحلت ۱۱۵۳ھ لکھا ہے۔ حاکم لاہوری چونکہ شاہ آفریں

کا ہموطن اور شاگرد تھا اس لئے تاریخ وفات کے سلسلے میں بھی اس کا بیان

مصحفی سے زیادہ مستند ہے ڈاکٹر اسپرنگر نے ۱۱۴۲ھ سال وفات لکھا ہے جو

غلط ہے اس نے حاکم لاہوری کے حوالہ سے ۱۱۵۴ھ بھی سال وفات لکھا ہے

نہایت افسوس کی بات ہے کہ باوجود تلاش و جستجو کے شاہ آفریں کے اہل و عیال

کے بارے میں کچھ معلوم نہ ہو سکا! چونکہ وہ ایک صوفی تھے اس لئے امکان

ہے کہ انھوں نے ضرور نکاح کی سنت پر عمل کیا ہوگا۔ لیکن یقینی طور پر یہ کہنا

مشکل ہے کہ انھوں نے نکاح کیا تھا یا نہیں؟ ان کے عزیز ترین شاگرد عبدالحکیم

حاکم لاہوری ان سے بارہا ملتے رہے اور ان کے حالات اس نے اپنے تذکرہ

---

[1] مردم دیدہ ص ۲۲
[2] خزانہ عامرہ ص ۲۸
[3] نتائج الافکار ص ۵۹
[4] کٹلاگ انڈیا آفس جلد دوم ص ۱۹

میں لکھا ہے لیکن ازدواج و اولاد کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ شاہ آفریں کے ذیل کے شعر پر اس باب کو ختم کیا جاتا ہے۔

بروز حشر چہ باک آفریں زعصیانم[1]
خدا کریم و شفیعم محمدؐ عربی ست

---

[1] دیوان شاہ آفریں لاہوری مخطوطہ لندن ورق ۷۵

بود ز نکتہ رسا عارف آفرین آگاہ
کہ دیدہ است ہمین قدردان سر فروش
(شاہ آفرین)

سیرت و شخصیت شاہ آفریں لاہوری

شو سرفراز جوہر ذاتی برنگ تیغ
زاں ابلہاں مباش کہ فخر از نسب کنند[1]

شاہ آفریں ایک باکمال صوفی اور مرد عارف تھے۔ ان کے شاگرد عبدالحکیم حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں نے عنفوان شباب ہی میں تحصیل علم و فضل کیا تھا اور جید و فاضل عالم ہو گئے تھے۔ علم رمل میں بھی ان کو دستگاہ تھی۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ وہ صرف ایک جید عالم ہی نہیں تھے بلکہ عامل بھی تھے۔ صرف علم جاننا ہی کافی نہیں ہے بلکہ اس پر عمل کرنا اصل شئے ہے۔ امام غزالیؒ نے فرمایا کہ ایک اونٹ کے وزن کے برابر کتابیں پڑھنا ہی کافی نہیں ہے جبتک کہ ان پر عمل نہ کیا جائے۔

"ای فرزند علم بی عمل دیوانگیست و عمل بی علم بیگانگی، علمی کہ امروز ترا از معاصی باز ندارد و در طاعت ندارد فردا ترا از آتش دوزخ ہم باز ندارد"[2]

شاہ آفریں کا یہ عقیدہ تھا کہ عبادات و ریاضات کے بغیر قرب الہی حاصل نہیں ہوتا ہے۔ محض اکتساب علم بغیر عمل کے بیکار ہے۔ ان کے دیوان اور تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ عالم باعمل تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شخصیت ہمہ گیر اور پرکشش ہے۔ ان کے ذیل کے شعر سے ان کے عقیدہ کی وضاحت ہوتی ہے۔

بی عبادت کی شود حاصل نشاط قرب دوست[3]
آفریں ماہ نو این عید محراب است و بس

---

[1] مکاتیب فارسی غزالی ص ۹۵ مطبوعہ تہران [3] مثنوی معنوی

شاہ آفریں کے احوال کے دقیق مطالعہ سے یہ بات روشن ہے کہ وہ مولانا روم کی شخصیت اور ان کی مثنوی معنوی سے بہت زیادہ متاثر تھے۔ ان کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ مثنوی معنوی سے انھوں نے خود بھی استفادہ کیا اور دوسروں کو بھی اس قرآن عجم سے فیض پہنچایا۔ لاہور میں کسی شخص کو اگر مثنوی معنوی کے کسی نکتہ کو سمجھنے کا شوق ہوتا تھا تو وہ ان کی خدمت میں پہنچتا تھا۔ وہ مولانا روم کو اپنا پیر و مرشد سمجھتے تھے گرچہ کئی سو سال قبل مولانا روم کا وصال ہوا اور ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے لیکن انھوں نے مولانا روم کی مثنوی سے اس طرح استفادہ کیا تھا جس طرح کوئی شخص کسی زندہ استاد سے استفادہ کرتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مثنوی معنوی کے شب و روز کے مطالعہ نے ان کو مرد عارف اور ایک باکمال صوفی بنا دیا۔

یک زمانہ صحبت با اولیا[1]

خوشتر از صد سالہ طاعت بی ریا

علامہ اقبال بھی مولانا روم کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے تھے اور انھوں نے ان کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہے۔

پیر رومی مرشد روشن ضمیر[2] | کاروان عشق و مستی را امیر

شاہ آفریں نے مولانا روم کی بارگاہ میں اپنے عقیدت کا اظہار اس طرح کیا ہے کہ وہ ان کے در کی خاک ہے اور ان کے چہرے اور عقل و دانش کو انھیں کے فیض سے چمک دمک ملی۔ ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

خاک مولوی ست آفریں[3] | آب رخ دانش و فرہنگ من

---

[1] مثنوی معنوی [2] مثنوی پس چہ باید کرد ص [3] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۰۹

حاکم لاہوری جس نے شاہ آفریں کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا تھا اس کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"در عنفوان شباب تحصیل علم و فضل کردہ فاضل و عالم جید بود و در رمل نیز دستی داشت...... در علوم عربیہ فارغ التحصیل بود ...... در افادہ مثنوی معنوی یگانہ و بی ہمتا بود"[1]

شاہ آفریں باوجود اس کے کہ مجمع کمالات اور جلیل القدر صوفی تھے نہایت خاکسار اور منکسر المزاج تھے وہ غریبوں اور محتاجوں سے نہایت خندہ پیشانی سے ملتے تھے لیکن امراء و وزراء سے ملاقات کرنا باعث ننگ سمجھتے تھے۔ انھوں نے اپنے ذیل کے شعر میں اس عقیدہ کو واضح کیا ہے کہ کسی توکل پیشہ کے لئے اپنے گھر سے تلاش معاش میں نکلنا برہنہ ہونے کے مثل ہے۔

بفتوای خرد از کشف عورت ہم بتر باشد[2]
توکل پیشہ را یک گام بیرون ز آستان خود

شاہ آفریں کے ذیل کے شعر سے یہ بات روشن ہے کہ خاکساری نے ان کو دین و دنیا میں سربلندی عطا کیا ہے۔

خاکساری سرفرازم کرد ورنہ آفریں
گرد باد آسا نشاط ماست سرتا پا غبار[3]

شاہ آفریں نے اپنے ذیل کے شعر میں اپنے قناعت پیشہ ہونے کا ذکر کیا ہے۔

قناعت مشربم از بسکہ دارم پاس آب خود[4]
بجو یاقوت است روییم سرخ از موج شراب خود

---

[1] مردم دیدہ ص۳۲ [2] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۳۷ [3] دیوان شاہ آفریں ۱۳۷

شاہ آفریں کی شخصیت اپنے عہد میں ایک مرشدانہ شخصیت تھی۔ انھوں نے اپنے دل کو حرص و ہوا سے پاک رکھا تھا جیسا کہ اس کے ذیل کے شعر سے واضح ہے کہ انھوں نے اپنی تربیت تسلیم و رضا کی فضا میں کی تھی۔

به نعمت های تسلیم و رضا پرورده ام خود را
بکامم آفریں شربت شود گر زهر ناب آید

شاہ آفریں کا یہ عقیدہ تھا کہ فقر کا لباس جب کوئی شخص زیب تن کرتا ہے تو وہ دنیا کو شکست دیدیتا ہے اسے دنیا کے مال و دولت تب پریشان نہیں کرتے!

لباس فقر از مردان کند نامرد دنیا را[1]
محقق می شود هر کس درین تقلید می آید

شاہ آفریں ہمہ تن عشق الٰہی اور حبِ رسول میں ڈوبے ہوئے تھے۔ وہ اس امر سے واقف تھے کہ ذکر حق سے افضل کوئی شئے نہیں ہے۔ امام غزالی نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر کثرت سے کیا کریں تاکہ فلاح ملے حدیث شریف ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ذکر صدقات، خیرات اور جہاد سے افضل ہے۔ اس سے روشن ہے کہ کوئی عمل اللہ تعالیٰ کے ذکر سے افضل نہیں ہے۔

شاہ آفریں کا فلسفہ یہ ہے کہ عشق الٰہی کی آگ مرنے کے بعد بھی ختم نہیں ہوتی ہے اللہ والوں کی قبر کی مٹی پر جو پھول اگتے ہیں ان سے کباب کی خوشبو آتی ہے یعنی ان کے عشق الٰہی میں جلے جسم کی خوشبو اس پھول میں پیوست ہو جاتی ہے شعر ملاحظہ ہو۔

به مردن هم نه میرد آتش سوز دل عاشق[3]
گلی کز خاک مشتاقان دمد بوی کباب آمد

---

[1] دیوان شاہ آفریں ص ۹۶ [2] تبلیغ دین ص ۲۲-۲۳ [3] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۳۲

شیخ سعدی نے اپنے ذیل کے شعر میں تقریباً شاہ آفریں ہی جیسے خیالات ظاہر کئے ہیں۔ اس سے واضح ہے کہ شاہ آفریں نے بھی شیخ سعدی کے مسلک کو اختیار کیا تھا۔ شیخ سعدی کا خیال تھا کہ ان کے وصال کے بعد ان کی قبر کی خاک سے عشق کی خوشبو آئے گی اگر لوگ ہزار سال کے بعد بھی اس کی قبر کی مٹی کو سونگھینگے۔

زخاک سعدی شیراز بوئے عشق آید
ہزار سال پس از مرگ او گرش بوئی

استاذ محترم ڈاکٹر پروفیسر عبدالحق انصاری نے مجھسے کہا کہ انھوں نے شیخ سعدی کی قبر کے دروازہ پر ان کا مندرجہ بالا شعر مرقوم دیکھا ہے۔

شاہ آفریں کی شخصیت کی برتری اور افضلیت کا یہ ثبوت ہے کہ صغر سنی ہی سے انھوں نے ترک دنیا اختیار کیا تھا اور اکل حلال کی طرف مائل تھے۔ بزرگان دین اپنے مریدوں کو سب سے پہلے اکل حلال کی تعلیم دیتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر سارے عبادات ضائع ہو جاتے ہیں۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ اگر کوئی شخص روزہ رکھتے رکھتے کانٹے کی طرح دبلا ہو جائے اور کثرت نماز کی وجہ سے اس کی کمر جھک جائے لیکن اگر وہ اکل حلال نہیں کھاتا ہے تو اللہ تعالیٰ کو اس کے روزہ نماز کی پرواہ نہیں ہے۔ حضرت ابن عباس رضؓ سے روایت ہے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت رکھو اس لئے کہ وہ تم کو غذا کے لئے اپنی نعمتیں دیتا ہے اور مجھ سے محبت رکھو اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ کو مجھ سے محبت ہے۔[1]

شاہ آفریں کو اللہ اور ان کے رسول سے بے پناہ محبت تھی۔ ان کے ذیل کے شعر سے یہ ظاہر ہے کہ روز ازل ہی سے عشق الٰہی کا منصب ان کو جاگیر میں ملا تھا۔

جاگیر من قبول ابد عشق منصبم[2]   تا آفریں رسیدہ فیضم خطاب شد

---

[1] ترمذی [2] دیوان شاہ آفریں

شاہ آفریں ایک روشن دل انسان تھے اس لئے وہ کسی کا احسان اپنا پسند نہیں کرتے تھے۔

نباشد آفریں روشندلاں را منت غیری[1]
بود آئینۂ خورشید را از نسج خاکستر

شاہ آفریں کو اللہ تعالی کی رحمت اور حضور اکرمؐ کی شفاعت پر پورا پورا بھروسہ تھا۔

بروز حشر چہ باک آفریں ز عصیانم[2]
خدا کریم و شفیعم محمدؐ عربی است

شاہ آفریں اس بات کے قائل تھے کہ اللہ تعالی کا ذکر اس کثرت سے کیا جائے کہ جسم کے ہر بال سے لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ کی آواز آئے۔

ذکر کن آں قدر کہ بانگ زند	مو بمو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ
عزت دیں احمد مرسل	آبرو لَآ اِلٰہَ اِلَّا اللہ[3]

شاہ آفریں کا عقیدہ تھا کہ عشق الہی اور عرفان محض اللہ تعالی کی عطا ہے یہ نعمت ہر شخص کو نہیں ملتی ہے۔

جذبۂ شوق بہ تقلید نہ گردد حاصل[4]
عاشقی محض عطائیست کہ من می دانم

وہ حضرت خضرؑ کی طرح زندہ جاوید رہنے کا حق رکھتے تھے کیونکہ عشق الہی میں مقتول ہوتے تھے۔

چوں خضر چرا زندۂ جاوید نباشم[5]
قاتل چو توئی آب حیات ست کفن ہم

۱،۲،۳،۴،۵ دیوان شاہ آفریں ورق ۱۸۰،۱۸۲،۲۲۶،۲۰۱،۲۰۲

عشق الٰہی کی نعمت سے بوڑھی قسمت بھی جوان ہو جاتی ہے۔

چہ فیض ہاست ز اکسیر حضرت عشق[1]
کہ بخت پیر تواں آفریں جوان کردن

عوام کے دل اللہ والوں کی صحبت سے روشن ہوتے ہیں۔ شاہ آفریں جیسے حضرات بجھی ہوئی شمع کو اپنے عشق کی آگ سے روشن کرتے تھے۔

عالمی روشن چراغ از صحبت ما می شود[2] — زندہ شمع مردہ از خوں گرمی دل می کنم

شاہ آفریں کا یہ عقیدہ تھا کہ اہل معرفت کو لوگوں کی پیشانی سے ان کے دلوں کا حال مل جاتا ہے۔

عارفاں دانند حال خلق از سیمای خلق[3] — نیک و بد را سرنوشتی نیست الّا بر جبیں

اللہ تعالیٰ ہر جگہ ہے اس کے باوجود انسانی آنکھیں ان کو نہیں دیکھ سکتی ہیں۔ موسیٰؑ نے دیدار کی آرزو کیا لیکن تاب نہ لا سکے۔

جلوۂ آں بی نشاں بسیار امد کاں عرصہ تنگ[4] — آفریں ما آنچہ می جستیم در عالم نہ بود

شاہ آفریں ضعف اور پیری میں بھی اللہ کی یاد میں غرق رہتے تھے۔

چناں ز نشۂ ضعف است آفریں بیتاب[5] — کہ سر نہادہ بہ زانوی برق خواب کند

مرد عارف کو حقیقتوں کی خبر ہوتی ہے اور باقی لوگ بے خبر ہیں جس نے اپنے آپ کو پہچان لیا اس نے خدا کو پہچان لیا۔

معنی شناس عارف باللہ می شود[6] — خود را شناخت ہر کہ بہ نکتہ سخن رسید

شاہ آفریں کی شخصیت ہم لوگوں کے لئے اس وجہ سے باعث افتخار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک دردمند دل دیا تھا جو ہمیشہ عشق الٰہی میں غرق رہتا تھا۔ والہ داغستانی

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ دیوان شاہ آفریں ورق ۲۱۵، ۱۹۵، ۲۱۴، ۹۵، ۹۶، ۱۰۲

نے لکھا ہے کہ ایسے درد مند لوگ بہت کم پیدا ہوتے ہیں۔

"او را طلبیدم چوں ترک آمیزش خلق خصوص اغنیاء و ارباب
دنیا کردہ عزلت گزیں بود مفائقہ نمود ...... الحق بہ ایں دردمندی
کم کسی دیدہ شدہ [۱]"

شاہ آفریں نے ذیل کے شعر میں اپنے سوز عشق کا ذکر کیا ہے۔

آگہ نہ ز سوز دل آفریں ہنوز [۲] — فریاد ایں سپند بہ ہر انجمن رسید

شعراء آپس میں حسد و رقابت رکھتے ہیں لیکن شاہ آفریں کو کسی شاعر سے تو کیا کسی انسان سے بھی حسد اور جلن نہ تھی۔

خوب می گوید بقدر فہم ہر کس آفریں — نیست بیجا شعر ما گر قابل تحسیں نہ شد [۳]

شاہ آفریں کو اپنے وطن ہندوستان کے موسم بسنت سے پیار تھا۔ یہاں کا ذرہ ذرہ ان کو عزیز تھا۔

زبسکہ طبل طرب زد بہر دیار بسنت — بود مقدمۃ الجیش نو بہار بسنت [۴]

انھوں نے دنیا والوں کو عرفی شیرازی کی طرح ذاتی جوہر حاصل کرنے کی تلقین کی ہے اور نسبی جوہر کو بیکار کہا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک وہی شخص سب سے زیادہ افضل ہے جو سب سے زیادہ پاکیزہ ہے۔

شو سرفراز جوہر ذاتی برنگ تیغ — زاں ابلہاں مباش کہ فخر از نسب کنند [۵]

سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم سے شاہ آفریں کو بے پناہ محبت اور عقیدت تھی انھوں نے آپ کی نعت میں نہایت طویل قصیدہ بہت جوش و خروش کے ساتھ کہا ہے ذیل میں چند اشعار قلمبند کئے جاتے ہیں۔

---

۱ ریاض الشعراء ورق ۴۴ ۲، ۳، ۴، ۵ دیوان شاہ آفریں ورق ۱۰۲، ۹۲، ۸۰، ۸۸

محمد عربی شاہ انبیا و رسل ازاں غلام اویم بندۂ زمانہ کشور
زحد بروں مدح تو با منطقی نہ اندیشہ عمر کنم زعرفی خوش نغمہ مطلعی مذکور
سخن بمدح تو گفتن نہ حد انسانست دگرنہ شوخی طبعم نمی کند تقصیر
سر نیاز من و خاک پای آن تو باد دو کون حلقہ بگوش تو و بلال تو باد[1]

نواب عبدالصمد خاں بہادر صوبہ دار لاہور نہایت متقی، پرہیزگار اور تہجد گذار تھے وہ شاہ آفریں جیسے باکمال شاعر اور مرد عارف سے ملاقات کے مشتاق تھے۔ اس ارادہ سے انہوں نے دو بار آدمی بھیج کر انکو طلب کیا لیکن وہ ان سے ملنے نہیں گئے کیونکہ امراء سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ بالآخر ایک مقرب سے جب شاہ آفریں کو یہ معلوم ہوا کہ وہ بہت مذہبی آدمی ہے تب وہ اس سے ملنے گئے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ امراء اور اغنیاء سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے لیکن جب ان کو کسی کے متعلق یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ بہت مذہبی اور با اخلاق ہے تو ضرور ان سے ملتے تھے۔ والہ داغستانی کو بھی پہلے انکار کر دیا تھا لیکن جب اس کا رقعہ ان کو ملا اور اس بات کا علم ہوا کہ وہ نیک آدمی ہے تو وہ خود ان کے یہاں ملاقات کرنے گئے۔ اپنے شاگرد حاکم لاہوری کے دولتکدہ پر وہ ہفتہ میں دو بار جاتے تھے اور حاکم لاہوری تو ہمیشہ ان کے یہاں جاتے تھے۔

"نواب عبدالصمد خاں ...... مکرر خواہش دیدنش کرد و کس بطلبش فرستاد ابا نمود۔ آخر بہ تحریک عزیزے کہ از مخلصان صمیمش بود بنا بر پاس خاطرش بالنواب مرحوم ملاقات کرد ...... ایں فقیر بخدمت او آمد و رفت داشتہ ام و در ہفتہ دو بار بتقریب خانہ تشریف می آورد و صحبت ہا می شد"[2]

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۶۸۔۲۷۱ [2] مردم دیدہ ص ۲۰

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ آفریں اخلاص، محبت اور خاکساری کے پیکر تھے ان میں مروت بھی بدرجۂ اتم تھی اور وہ کہا کرتے تھے کہ اس زمانہ میں مروت ختم ہوتی جا رہی ہے۔

عمری گذشت بوی مروت نمی رسد — گلدستۂ ز باغ فتوت نمی رسد[1]

شاہ آفریں گرچہ مذہب امامیہ کے پیرو تھے لیکن چونکہ ایک مردِ عارف تھے (۲) اس لئے حضرت بڑے پیرؒ سے ان کو بیحد عقیدت اور محبت تھی جس سے ان کے بلند کردار ہونے کا ثبوت ملتا ہے۔ یہ بڑی بات ہے کہ ان کو کسی فرقہ کے فرد سے نفرت نہیں تھی کیونکہ وہ محبت کے پیکر تھے۔

مسند یا لغز خطا یا غوث اعظم الغیاث[2] — ای دست تو خدا یا غوث اعظم الغیاث

گویند گر در مشکلی یادت کند آساں شود — مائیم مشکل ماجرا یا غوث اعظم الغیاث

اوتاد با حکم ز تو اقطاب صاحب دم ز تو — ابدال و ابدالت فدا یا غوث اعظم الغیاث

شاہ آفریں کو شہدائے کربلا سے بھی بیحد محبت اور عقیدت تھی اس لئے ان حضرات کی منقبت میں انھوں نے کئی غزلیں اور ترجیع بند کہے ہیں۔

دل می شود بیاد شہیدان کربلا[3] — جانم فدای ہمت مردان کربلا

باسر زمین کہ نداد ندایں شرف — سازند بہتہ فق کی شہیدان کربلا

دل سوخت در ہوای حسینؓ و حسنؓ مرا — جان نیز از برای حسینؓ و حسنؓ مرا

شاہ آفریں حوض کوثر کے شربت کے لئے عبادت کرنا پسند نہیں کرتے تھے عبادت محض دیدار محبوب اور قرب کے لئے ہے۔

خوش ندارد آفریں بی دوست گلگشت بہار[4] — تشنۂ دیدار را با چشمۂ کوثر چہ کار

۱، ۲، ۳، ۴، ۵ دیوان شاہ آفریں ورق ۱۳۲، ۸۲، ۲۷۲، ۲۷۱، ۱۴۵

کمینہ لوگوں سے وہ خود کنارہ کش تھے اور دوسروں کو بھی اسی بات کی تلقین کرتے تھے۔

از بزم معاشرش مردم این دہر آفریںؔ — خوبست گر کنارہ گرفتی کنارہ تر[۱]

شاہ آفریںؔ کو روز حساب کا بہت خوف تھا کہ کل کیا جواب دیں گے۔

جوابت چیست گر فردا بپرسند — چہ خواندی آفریںؔ در مکتب عمر[۲]

شاہ آفریںؔ اس دنیا کے ہر واقعہ سے عبرت حاصل کرتے تھے اور کسی کا احسان لینا ان کے لئے بوجھ تھا۔

منت کش دنیا نہ شود ہمت مردان — جز عبرت دل زانچہ مزدور است تو کم گیر[۳]

موت کو کون پیار کرتا ہے؟ لیکن جو لوگ اہل معرفت ہوتے ہیں وہ موت کو گلے لگاتے ہیں۔

آفریںؔ کیست کہ شیریں شمرد تلخی مرگ — کوہکن خاک شد و تیشہ مہیاست ہنوز[۴]

علامہ اقبال نے بھی موت کے متعلق کہا ہے۔

نشان مرد مومن با تو گویم — چو مرگ آید تبسم بر لب اوست

شاہ آفریںؔ کے دل کے رازوں کو کوئی مرد عارف ہی سمجھ سکتا ہے عام انسان کی وہاں تک رسائی کہاں؟ ولی را ولی می شناسد۔

بود ز نکتۂ ما عارف آفریںؔ آگاہ — کہ دیدہ است ہمیں قدرداں سرمہ فروش[۵]

شاہ آفریںؔ عشق الہی میں پریشان اور سرگرداں رہتے تھے اور یہی بیتابی ان کا علاج تھا۔

مسیحا در علاجم آفریںؔ حیرانی دارد — چہ باشد فکر بیماری کہ بیتابیست آرامش[۶]

شاہ آفریںؔ ان لوگوں میں سے نہیں تھے جو عبادات محض جنت و کوثر کی ہوس

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ دیوان شاہ آفریں ورق ۱۲۶، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۲۹، ۱۶۱، ۱۶۵

میں کرتے ہیں۔

من آن نیم کہ جنت و کوثر کنم خیال ‏[۱]
در دعوت تنعم و ذوقم گداز شوق

شاہ آفریں کو اپنے جامع کمالات ہونے کا احساس زندگی ہی میں ہو چکا تھا انھوں نے اپنے ذیل کے شعر میں یہ واضح کیا ہے کہ اگر ان کی مانند بیٹا باپ کو مل جائے تو دنیا حضرت آدمؑ پر قیامت تک ناز کرے۔

پدری را کہ بود چوں تو گرامی پسرش ‏[۲]
تا ابد ناز بر آدم کند و جا دارد

جو شخص اہل فقر میں سے ہے ان کے لئے باعث ننگ ہے کہ کسی کا احسان اٹھائے۔

ذلت از ما و مروت ز شما ہر دو غلط
ننگ فقر است کہ منت کش دنیا باشد

شاہ آفریں کی وفات ۱۱۶۷ھ میں ہوئی ان کے دیوان کا واحد نسخہ (ابتک کی دریافت کے مطابق) برٹش میوزیم میں ہے جس کا عکس راقم حروف کے سامنے ہے اس نسخہ کی کتابت ۱۱۵۷ھ میں غلام حسین شاگرد عبدالرحمٰن نے اس وقت کی تھی جب شاہ آفریں بقید حیات تھے اس نے شاہ آفریں کو خاتمہ میں ذیل کے القاب سے یاد کیا ہے جس سے ان کی سیرت اور شخصیت پر روشنی پڑتی ہے۔

"تمام شد نسخۂ متبرکہ تصنیف سلطان العاشقین قدوۃ المحققین
ہادی ضالین برہان دین حضرت محمد آفریں"

شاہ آفریں کو سلطان العاشقین قدوۃ المحققین ہادی ضالین اور برہان دین کہا گیا ہے ظاہر ہے یہ مقام ان کو حیات ہی میں مل گیا تھا جو بہت کم حضرات کو ملتے ہیں۔

شاہ آفریں کا یہ خیال تھا کہ پست فطرت لوگوں کے سامنے ادب سے رہنا چاہیے

۱، ۲ دیوان شاہ آفریں ورق ۱۷۶، ۱۶۶

اور ان سے بات تک نہ کرنی چاہیئے کیونکہ وہ لوگ مانند خاک ہیں خاک سے وہی بات کہتے ہیں جو دیوانہ ہیں۔

بالپست فطرتاں بہ ادب باش آفریںؔ — دیوانہ نیستی کہ کنی گفتگو بہ خاک[1]

صبر و تحمل سے ملک جمشید کو بھی فتح کیا جاسکتا ہے اس لئے انسان کو صبر سے کام لینا چاہیئے۔ شاہ آفریںؔ صبر و حلم کے مجسمہ تھے۔

آفریںؔ ملک جم از صبر بہ تسخیر آمد — ایں فسونیست کز و دیو بزنہار کردیم[2]

اللہ والوں کے کلام سے لوگوں کے سروں کا درد کافور ہو جاتا ہے۔ بے چینی اور پریشانی سے بھی نجات پانے کے لیئے عارفوں کے اشعار سنیئے جن میں فقر، صبر اور تسلیم و رضا کی تعلیم ہوتی ہے۔

درد سر جہاں را ما صندلیم صندل — ما شاعریم عارف ما حکمت خدائیم[3]

شاہ آفریں نے مخلوق کو مظلوموں کی آہ سے بچنے کی نصیحت کی ہے اور وہ خود اس پر عامل تھے۔

آہ مظلوماں اثر دارد اثر ہشیار باش — نیست بی تعبیر ظالم خواب ایں افسانہا[4]

دنیا کا انجام عدم ہے ساری چیزیں ایک دن فنا ہو جائیں گی۔

ندارد آفریںؔ مضمون ہستی نکتۂ دیگر — عدم باشد عدم گر ہست اسمی ایں معمّا[5]

شاہ آفریںؔ کے عظیم انسان ہونے کا یہ بڑا ثبوت ہے کہ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ان کی روح بے نور ہے اور اس دنیا میں ظلمت ہی ظلمت ہے اس لئے جب تک سانس باقی ہے ان کو توبہ استغفار کرنا چاہیئے پتہ نہیں اللہ تعالیٰ کس وقت استغفار کو قبول کرلیگا۔

شمع جان بی نور شد از ظلمت ہستی مپرس — تا نفس باقیست استغفار می باید مرا[6]

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶ ه دیوان شاہ آفریں ورق ۷۷، ۱۸۶، ۱۹۴، ۱۸، ۵، ۹، ۲۱۴

اللہ اللہ نے اس کائنات کو آراستہ کیا ہے ورنہ یہ موجودات بے رونق رہتی، یہاں

پر انسان سے مراد اہل اللہ ہیں۔

ریاض کائنات از فیض من نشو نماداد[1] نہال از من گل از من باغبان از بہار من

آزاد بلگرامی نے شاہ آفریں کے متعلق لکھا ہے کہ وہ فناجیہ حضرات میں سے تھے۔[2]

خان آرزو نے ان کو بہت خوش زبان، خوش مشرب، آزاد اور متوکل کہا ہے۔[3] حاکم لاہوری[4]

کا بیان ہے کہ وہ گوشۂ تنہائی میں رہتے تھے اور اکثر فاقہ کرتے تھے۔ بھگوان داس

رقمطراز ہے۔

"مردی درویش از اہل تصوف و صاحب درد بودہ۔ اوقات خود را

معروف عزلت و انزوا می داشت"[5]

حاکم لاہوری کا بیان یہ ہے۔

"با این ہمہ کمال بر خود اصلاً نظر نداشت با فقراء و غربا بتواضع

و انکسار و با امرا بہ استغنا و کبریا پیش می آمد و بر شعر کسی انگشت

اعتراض نمی نہاد و سلف را بخوبی یاد می فرمود"

و ہمہ را استاد و مرشد می دانست و در قناعت و توکل چہ گویم کہ بچہ

درجہ بود! بیش از اوقات از اکثر مردم شنیدہ می شد کہ در گوشۂ انزوا

فاقہ ہای کشید و از خانہ بر نمی آمد"[6]

تا ابد ناز بر آدم کند و جا دارد

پدری را کہ بود چوں تو گرامی پسرش[7]

---

[1] خزانہ عامرہ ورق ۲۸ [2] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص۱۷ [3] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص۱۷

[4] سفینۂ ہندی ص۱۱ [5] مردم دیدہ ص۲۰ [6] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۲۶
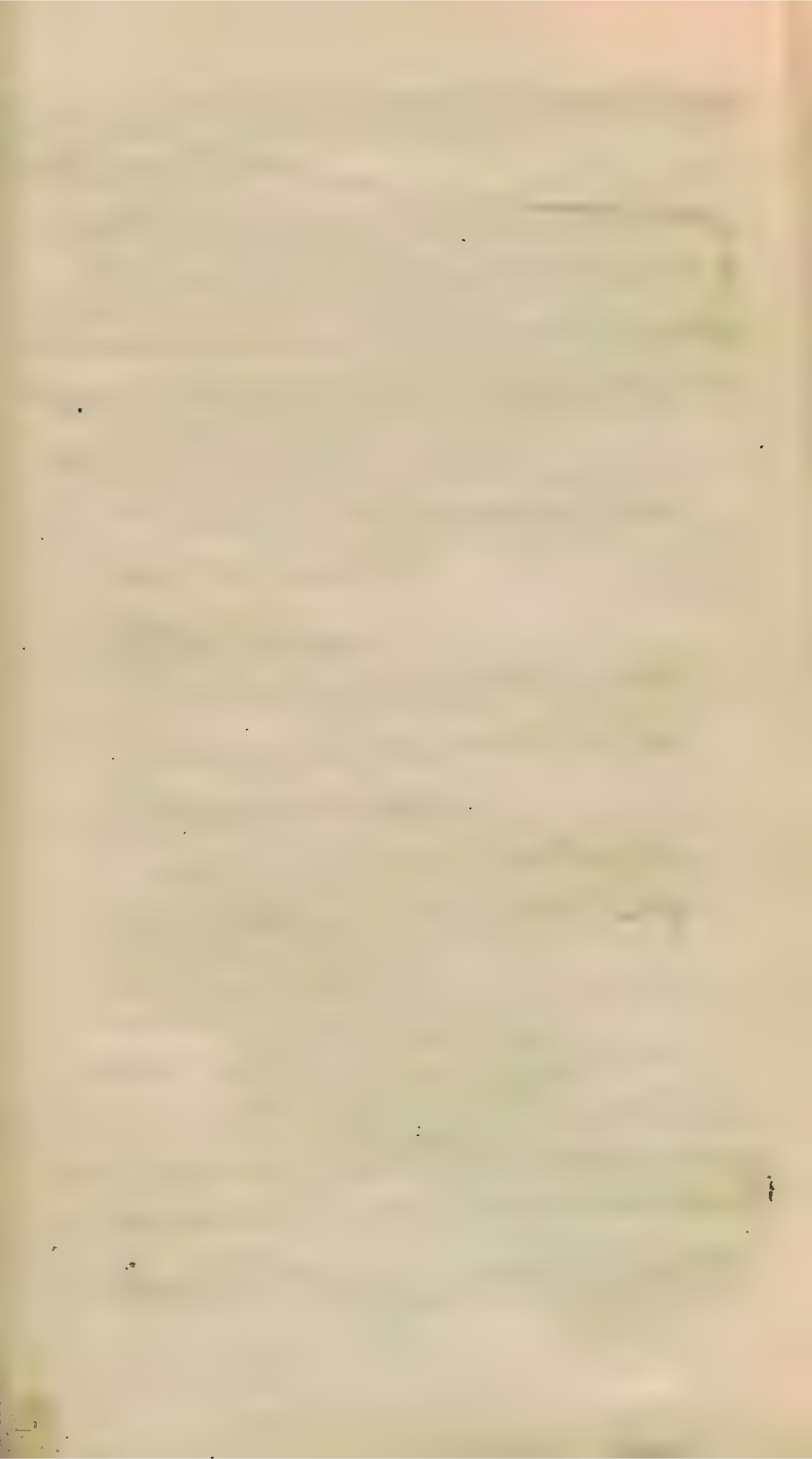
باب ششم

تصنیفات و تالیفات شاہ آفرین لاہوری

بحیثیت شاعر

(ا) غزل سرا (ب) مثنوی نگار (ج) قصیدہ نگار (د) رباعی گو

خیالِ لعلِ نوشینی کہ دارد آفرین در دل
کہ ہر مصراعش از معنیٔ شیریں نیشکر باشد
(شاہ آفرین)

تصنیفات و تالیفات شاہ آفریں لاہوری

شاہ آفریں لاہوری کی شاعری کا تنقیدی جائزہ لینے سے قبل لازم ہے کہ اس کی تصنیفات اور تالیفات کے مختلف دستیاب نسخوں پر روشنی ڈالی جائے۔ راقم حروف دنیا کے مختلف کتب خانوں کے کٹلاگ کا مطالعہ کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ دیوان شاہ آفریں لاہوری کا ایک ہی کامل نسخہ دنیا میں ہے۔ جو برٹش میوزیم لندن کے کتب خانہ میں زیر شمارہ ۲۷۰ ہے۔ راقم حروف کو خدا بخش لائبریری، رضا لائبریری مولانا آزاد لائبریری، دہلی یونیورسٹی لائبریری، لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری، نیشنل میوزیم، نیشنل آرکائیوز، نیشنل لائبریری، ایشیٹک سوسائٹی آف بنگال، سالار جنگ میوزیم، حیدرآباد یونیورسٹی لائبریری اور ندوہ کے کتب خانہ میں بھی شاہ آفریں کے دیوان یا کلیات کا کوئی نسخہ نہیں ملا اس لیے راقم حروف کو برٹش میوزیم کے کتب خانہ سے دیوان آفریں لاہوری کا عکس حاصل کرنا پڑا جو ابھی راقم حروف کے پیش نظر ہے اس نسخہ میں کل ۵۵۸ صفحات ہیں ہر صفحہ میں دس یا گیارہ اشعار ہیں اور آغاز ذیل کے شعر سے ہوا ہے۔

خداوندا نگیں کن دور بزم قدس نامم را ... چو مسطر آہ عاشق سوز مضمون دہ کلامم را

اور اختتام اس نسخہ کا ذیل کے شعر پر ہوا ہے۔

دل سوخت در ہوای حسینؑ و حسنؑ مرا ... جان نیز از برای حسینؑ و حسنؑ مرا

نسخہ مذکور کا کاتب غلام حسین ہے جو حضرت عبدالرحمٰن کا شاگرد تھا سنہ کتابت یکم ربیع الاول روز یکشنبہ سنہ ۱۱۴۷ھ اور سنہ ۱۹ جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی مرقوم ہے۔ کاتب نے اس نسخہ کی کتابت خواجہ محی الدین خاں کی فرمائش سے کی تھی۔ ذیل میں اس نسخہ کے اختتام کی عبارت نقل کی جاتی ہے۔

"تمام شد نسخہ معتبر کہ تصنیف سلطان العاشقین قدوۃ المحققین بادئ...
ضالین برہان دین یعنی حضرت آفرین بجہت فرمودۂ خالو اشاں ربانندۂ
گوی از مردان شکنندۂ فوج فیلان حاتم زمان خواجہ غلام محی الدین
سلمہ اللہ الی یوم التناد بخط اضعف العباد غلام حسین کمترین شاگردان
حضرت عبدالرحمٰن قلمی شد بتاریخ غرۂ شہر ربیع الاول روز یکشنبہ
جلوس محمد شاہ بادشاہ غازی سنہ ۱۹ سنہ ۱۱۴۷ھ

[illegible]

اس نسخہ کے آخر میں ایک انگریزی عبارت بھی ہے جس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نسخہ کو برٹش میوزیم نے ۱۸۶۷ء میں کرنل جارج ولیم ہملٹن کی بیوہ سے خریدا تھا۔ نسخہ کے تیسرے صفحہ پر انگریزی زبان میں پانچ روپیہ لکھا ہوا ہے جس سے واضح ہوتا ہے کہ کرنل جارج ولیم ہملٹن نے پانچ روپیہ میں ہندوستان میں خریدا ہوگا۔ کرنل جارج ولیم ہملٹن کے انتقال کے بعد اس کی بیوہ کو جب مالی مشکلات ہوئی ہوگی اس نے برٹش میوزیم کے ہاتھ اس نسخہ کو اپریل ۱۸۶۸ء میں بیچ دیا۔

کرنل جارج ولیم ہملٹن ملتان کا کمشنر تھا اور نہایت صاحب ذوق تھا۔ اس کو کتابیں خریدنے کا شوق تھا۔ اس کی بیوہ نے دیوان نظام کے قلمی نسخہ کو بھی اپریل ۱۸۶۸ء میں ہی برٹش میوزیم کے ہاتھ فروخت کیا تھا۔ دیوان نظام کے اختتام پر کی انگریزی عبارت سے یہ بات معلوم ہوتی ہے۔ دیوان آفتاب کا جو نسخہ برٹش میوزیم

میں ہے وہ بھی ولیم ہملٹن ہی کے ذریعہ وہاں پہنچا۔ اس لئے اب شبہ کی کوئی گنجائش نہیں رہجاتی ہے کہ کرنل جارج ولیم ہملٹن ہندوستان سے قیمتی اور نادر بہت ساری قلمی کتابیں قیمتاً حاصل کر کے اپنے ساتھ برطانیہ لے گیا۔ لیکن اللہ کا شکر ہے کہ یہ نسخہ دیوان شاہ آفریں لاہوری کا برٹش میوزیم میں محفوظ ہے ورنہ امکان تھا کہ علم و دانش کا یہ گوہر گراں بہا ضائع ہو گیا ہوتا اور آج راقم حروف کو اس عظیم شخصیت پر مقالہ لکھنے کا موقع نہیں ملتا۔

دیوان شاہ آفریں کے اس دستیاب نسخہ میں تقریباً چھ ہزار اشعار ہیں پوتھے صفحہ سے اس نسخہ کا آغاز ہوا ہے دوسرے صفحہ پر یہ لکھا ہوا ہے۔

"دیوان آفریں نوشتہ نظم فارسی

۱۱۴۷ھ ہجری سنہ ۔"

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ یہ نسخہ جس کی زیر وکس کاپی راقم حروف کے زیر مطالعہ ہے یکم ربیع الاول ۱۱۴۷ھ میں اس کی کتابت تکمیل کو پہنچی تھی تذکروں سے یہ بات واضح ہے کہ شاہ آفریں اس وقت بقید حیات تھے کیونکہ ان کی وفات ۱۱۵۴ھ میں ہوئی یہ نسخہ اس اعتبار سے بہت اہم ہے کہ اس کی کتابت خود شاہ آفریں کی زندگی میں ہوئی ہے اور اب تک کی دریافت کے مطابق دنیا میں یہ واحد دستیاب کامل نسخہ ہے۔ غزلیں بحساب ردیف مرقوم ہیں۔ ذیل میں بحساب ردیف غزلوں کا شمار قلمبند کیا جاتا ہے۔

ردیف	تعداد غزل	ردیف	تعداد غزل
الف	۱۲۰	ث	۴
ب	۲۲	ج	۶
ت	۱۱۵	چ	۱

ردیف	تعداد غزل	ردیف	تعداد غزل
ح	۳	ظ	۲
خ	۴	ع	۲
د	۱۹۲	غ	۵
ذ	۲	ف	۲
ر	۲۵	ق	۳
ز	۱۴	ک	۷
س	۱۰	ل	۱۸
ش	۴۰	م	۸۹
ص	۲	ن	۵۶
ض	۴	و	۵۶
ط	۲	ہ	۲۳
ی	۶۵		

کل ۸۶۷ غزلیں اس نسخہ میں ہیں۔ ورق ۴ سے ۲۵۶ تک غزلیں ہیں
کل ۸۶۷ غزلیں اس نسخہ میں ہیں اور ورق ۲۵۶ سے ۲۶۶ تک ۱۲ مخمس ہیں ورق ۲۶۶ سے ورق ۲۶۸ تک میں ۱۴ رباعیاں ہیں ورق ۲۶۸ سے ورق ۲۷۱ تک عرفی شیرازی کے ایک مشہور نعتیہ قصیدہ[1] کے جواب میں ایک نعتیہ قصیدہ مرقوم ہے۔ عرفی کے اس نعتیہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

سپیدہ دم چو زدم آستین بہ شمع شعور
شنیدم آیت استفتحو ز عالم نور

---

[1] قصائد عرفی۔

آفریں کے اس نعتیہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے جسے انھوں نے عرفی شیرازی کے مندرجہ بالا قصیدہ کے جواب میں نظم کیا ہے ۔

نہ ہے بہ عون تو قصر شکستہ دل منفور — زپاسبانی عدل تو ملک جاں معمور

اس نسخہ کے آخر میں ۹ اوراق پر مشتمل ایک طویل ترجیع بند حضرت امام حسینؓ اور شہدائے کربلا کی یاد میں مرقوم ہے۔ اس ترجیع بند میں کل ۱۶۸ اشعار ہیں اور ہر ایک شعر جوش سے پُر اور عقیدت شہدائے کربلا میں ڈوبا ہوا ہے اس ترجیع بند کا پہلا شعر ذیل میں نقل کیا جاتا ہے ۔

دل می طپد بہ یاد شہیدان کربلا — جانم فدای ہمت مردان کربلا

اور اس ترجیع بند کی گرہ یہ ہے ۔

دل سوخت در ہوای حسینؓ و حسنؓ مرا — جان نیز از برای حسینؓ و حسنؓ مرا

دیوان شاہ آفریں مخطوطہ کنگس آف اودھ :- اشپرنگر نے کتب خانہ کنگس آف اودھ کا کٹلاگ تیار کیا تھا۔ لیکن پتہ نہیں اس کتب خانہ کی کتابیں اس وقت دنیا کے کس کتب خانہ میں ہیں اشپرنگر کا تیار کردہ کٹلاگ اس کتب خانہ کی یاد دلاتا رہے گا۔ دیوان شاہ آفریں کا ایک نامکمل اور مختصر نسخہ کٹلاگ نمبر ۷۶ کے تحت کتب خانہ کنگس آف اودھ میں تھا۔ اس میں فقط ردیف ن تک غزلیں تھیں۔[1] کل صفحات ۱۰۶ اور ہر صفحہ میں پندرہ سطریں تھیں اس نسخہ کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے ۔

دل قبلہ نماز نیاز دوام ما — گرداندن رخ از دو جہاں شد سلام ما

یہ غزل برٹش میوزیم کے نسخہ میں ورق ۷ پر موجود ہے ۔

---

[1] کٹلاگ کنگس آف اودھ جلد اول ص ۲۱۷

عبدالحکیم حاکم لاہوری[1] کا بیان ہے کہ شاہ آفریں نے تین مثنویاں نظم کی تھیں۔
جن کے نام ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

(۱) مثنوی ابجد فکر — یہ مثنوی عہد عالمگیری میں منظوم ہوئی
(۲) مثنوی اںبان معرفت — یہ مثنوی عہد بہادر شاہی میں لکھی گئی
(۳) مثنوی ہیر رانجھا — یہ مثنوی عہد فرخ سیر میں منظوم ہوئی

اس کا ایک نسخہ انڈیا آفس میں اور ایک نسخہ برٹش لائبریری لندن میں
موجود ہے۔ اس مثنوی کا ایک نسخہ کتب خانہ کنگس آف اودھ میں زیر شمارہ ۷۷ تھا پتہ
نہیں اب یہ نسخہ کہاں ہے۔

(۱) **مثنوی ابجد فکر**:- یہ مثنوی شاہ آفریں کی نایاب ہے ان کے شاگرد حاکم
لاہوری نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں نے اس مثنوی کو عہد عالمگیری میں نظم کیا تھا اس لئے
اس میں کوئی شبہ نہیں کہ ابجد فکر نام کی ایک مثنوی شاہ آفریں نے لکھی تھی۔ مگر راقم
حروف کو باوجود بہت تلاش اور جستجو کے اب تک یہ نسخہ دستیاب نہ ہو سکا۔ اس
کمترین نے کتب خانہ خدا بخش، رضا لائبریری رام پور، انڈیا آفس لائبریری لندن
برٹش میوزیم لندن، نیشنل میوزیم، کتب خانہ برلن، کتب خانہ ملا فیروز بمبئی، بوہار
لائبریری اور مولانا آزاد لائبریری علیگڑھ میں بھی اس نسخہ کو نہیں پایا اس لئے اس پر
تبصرہ کرنے سے معذور ہے لیکن شاہ آفریں کے شاعرانہ کمالات کی روشنی میں یہ بات
کہی جا سکتی ہے کہ یہ مثنوی ایک عمدہ مثنوی ہو گی۔ شاہ آفریں کی دوسری مثنویوں مثلاً
ہیر رانجھا اور اںبان معرفت میں ان کے شاعرانہ محاسن بہت بلند مقام پر نظر آتے
ہیں اس لئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ ان کی مثنوی ابجد فکر بھی ایک بلند پایہ مثنوی ہو گی

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۸۰ مطبوعہ لاہور [1] مردم دیدہ ص ۱۸۰

ان کی شاعری کے خواص حسن شیرینی، شائستگی، خوش بیانی، سوز وگداز، فصاحت متانت اور نغز گوئی ہیں۔ ان کی مثنوی ہیر رانجھا عاشقانہ ہونے کے باوجود دعوت عشق الٰہی دیتی ہے اور ابنان معرفت تو صوفیانہ مثنوی ہے ہی اس لئے یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ انھوں نے ابجد فکر میں بھی عشق الٰہی کے رموز واسرار بیان کئے ہوں گے۔

(۲) مثنوی ابنان معرفت :- یہ مثنوی جیسا کہ نام سے ظاہر ہے معرفت کی زنبیل ہے۔ شاہ آفریں جیسے باکمال مرد عارف نے اپنی اس مثنوی میں بتایا ہوگا کہ مخلوق کس طرح معرفت کی راہیں طے کر سکتی ہے۔ ان کی یہ مثنوی شیریں بیانی اور دلکشی کی وجہ سے نہایت باوقار اور پر مغز ہوگی وہ چونکہ معرفت کی راہوں سے واقف تھے اسلئے ایسے رموز اور نکات انھوں نے اس مثنوی میں واضح طور پر پیش کئے ہوں گے کہ راہرو معرفت کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ ۱۱۴۳ھ میں جب اسکی ملاقات شاہ آفریں سے لاہور میں ہوئی تھی تو ان دنوں وہ مثنوی ہیر رانجھا نظم کر رہے تھے اور اپنی مثنوی ابنان معرفت کا ایک نسخہ جو خود ان کے ہاتھ کا لکھا ہوا تھا انھوں نے اس کو (آزاد بلگرامی) بہ طریق یادگار عنایت کیا تھا۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ ید بیضا میں اس مثنوی کے چند اشعار نقل کئے ہیں جن سے راقم حروف چار شعر لکھتا ہے۔

ای مغنی بہ دعوی تجرید | صبح شد صبح نماز توحید

ستم بر زیر دستاں مرد سرکش را خطر دارد
فلک را شیوۂ عاجز کشی زیر و زبر دارد

شب کہ ماشانۂ آن زلف پریشان کردیم
ہر گرہ یوسفی آزاد ز زندان کردیم

لہ خزانہ عامرہ ورق ۲۲

کہ ہم چشم رکاب او ست غیرت کردہ پامالم
رگ جاں می طپید دست کہ می گیرد عنان او

راقم حروف کو اس مثنوی کا بھی کوئی نسخہ دنیا کے کسی کتب خانہ میں نہیں ملا ورنہ مزید تبصرہ کیا جا سکتا تھا۔ شاید اس کا کوئی نسخہ کسی شخصی کتب خانہ میں ہو۔

(۳) مثنوی ہیر رانجھا:۔ یہ مثنوی زیر شمارہ ۲۰۲۷ انڈیا آفس لائبریری لندن میں موجود ہے اس مثنوی کا دوسرا نام "ناز و نیاز" بھی ہے جس کی ابتدا ورق (ایک سے) ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

بنام چمن ساز ناز و نیاز   کہ خار نیازش بود سرو ناز

جیسا کہ اس مثنوی کے نام سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مثنوی ہیر رانجھا کی داستان عشق میں منظوم کی گئی ہے۔ ہیر اور رانجھا کے عشق و محبت کا قصہ پنجاب کا مشہور قصہ ہے۔ شاہ آفریں لاہوری چونکہ پنجاب سے تعلق رکھتے تھے اس لئے انھوں نے حق وطنیت اس داستان کو نظم کر کے ادا کیا۔ امیر خسرو کی مثنوی "شیریں خسرو" کے رنگ میں یہ مثنوی لکھی گئی ہے چونکہ شاہ آفریں کا دل عشق الہی میں آتشکدہ بنا ہوا تھا جیسا کہ اس کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے اس لئے انھوں نے اس مثنوی میں عشق مجازی کے راز و نیاز کے ساتھ عشق حقیقی کی اہمیت کو بھی اجاگر کیا ہے۔ اس لئے یہ مثنوی معرفت کی دعوت بھی دیتی ہے اور اس کے اشعار اس لائق ہیں کہ تا قیامت فارسی ادب کی دنیا میں زندہ رہیں گے۔

قبول عشق دارد آرزو عرض شہادت را
بہ قربان گاہ نازش آفریں خونت بحل باشد[۱]

---

[۱] دیوان آفریں ورق ۹۷

عشق و محبت کی دنیا میں جہاں لیلیٰ و مجنوں، شیریں و فرہاد اور نل ودمن کی داستانیں زبان زد عام ہیں وہاں ہیر اور رانجھا کی داستان عشق بھی سرزمین ہند کے چپہ چپہ پر پیوست ہے۔ ہندوستانی محبت اور عشق کی یہ داستان نہایت دل انگیز ہے۔ یہ داستان عشق اردو اور ہندی میں بھی کئی بار لکھی جا چکی ہے اور رہتی دنیا تک لوگوں میں ان کی محبت کے چرچے ہوتے رہیں گے اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شاہ آفریں جیسے صوفی اور خدا پرست شاعر نے ہیر اور رانجھا کی داستان عشق کو کیوں قلمبند کیا ہے؟ راقم حروف کے خیال میں اس کی دو وجہیں ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ ہے کہ شاہ آفریں پکے وطن پرست تھے۔ ان کو اپنے ملک کی ہر شئے سے محبت تھی اور ہر کس و ناکس کو محبت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں جہاں بہار کا ذکر کیا ہے وہاں ہندوستان کی رُت بسنت کو بھی فراموش نہیں کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ امیر خسرو کی طرح ہندوستان کے ذرے ذرے سے ان کو محبت تھی۔ ہیر اور رانجھا کی داستان عشق ان کے وطن کی داستان عشق ہے اس لئے انھوں نے اس داستان عشق کو نظم کرنے میں اپنی شاعری کے سارے جوہر دکھائے ہیں خان آرزو[1] جیسے ناقد نے ان کو نہایت شیریں زبان کہا ہے۔ ظاہر ہے عشق و محبت کی شیریں داستان کے لئے شیریں زبان کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ نظامی گنجوی اور امیر خسرو مثنوی نگاری کی دنیا میں اپنی شیریں بیانی اور سوز و گداز و درد کی وجہ سے بے مثال شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ آفریں کی یہ مثنوی ہیر و رانجھا اس بات کا ثبوت پیش کرتی ہے کہ ان کو زبان پر قدرت حاصل تھی اور انھوں نے واردات عشق کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ عشق و محبت انسان کی فطرت ہے اور دنیا کی کوئی قوم عشقیہ شاعری

---

[1] مجمع النفائس

بھی نہیں ہے لیکن فارسی شاعری خصوصاً اس فن میں ایک عالمگیر شہرت کی حامل ہے
ایران میں عشقیہ شاعری کو جتنی ترقی ہوئی وہ کسی صنف سخن کو نہ ہوئی۔ مولانا
نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ صوفیانہ شاعری کا تعلق واردات اور جذبات
سے ہے اور عشق و محبت کے رموز کے بغیر صوفیانہ شاعری درجۂ کمال پر نہیں پہنچ
سکتی ہے مولانا شبلی کا خیال ہے کہ شیخ سعدی ایک باکمال صوفی شاعر اس لیے ہیں
کہ ان کی زندگی کا ایک حصہ عشق و عاشقی میں گذرا تھا۔

شاہ آفریں کی اس عشقیہ مثنوی میں حسن بیان، جذبات اور واردات
عشق اپنے کمال پر نظر آتے ہیں الفاظ کی شیرینی نے اس مثنوی کو سحر سامری بنا دیا
ہے۔ شاہ آفریں کا خود اپنا دعویٰ دیکھیے کہاں تک درست ہے۔

منم از گلشن ہند آفریں رنگین نوا بلبل
اگر شد صائب شیریں سخن از اصفہان پیدا[1]

مندرجہ بالا شعر میں آفریں نے اپنے آپ کو گلشن ہند کا شیریں زبان
بلبل کہا ہے اور اس شیرینی میں وہ باکمال شاعر صائب اصفہانی سے اپنے آپ کو
کمتر نہیں سمجھتے تھے فرق یہ ہے کہ وہ ایرانی تھے اور شاہ آفریں ہندوستانی تھے۔

اس مثنوی کے ورق ۱۱ (ب) سے پتہ چلتا ہے کہ یہ مثنوی انھوں نے بادشاہ
فرخ سیر کے نام معنون کی تھی۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں سنہ ۱۱۲۷ھ میں
اس مثنوی کو نظم کرنے میں مشغول تھے اس نسخہ کی کتابت جو ابھی انڈیا آفس لائبریری
میں موجود ہے۔ فقیر اللہ محمد نے ۱۱۲۷ھ مطابق ۱۷۱۵ء میں کی تھی۔ لاہور کی پنجاب کمیٹی[2]
نے اس نسخہ کو امپریل نمائش میں پیرس بھیجا تھا (یہ) نسخہ کو انڈیا آفس لائبریری

۱؎ دیوان شاہ آفریں ورق ۲۲

نے ڈاکٹر رائل سے سنہ ۱۸۵۶ء میں حاصل کیا تھا۔ امپیریل نمائش کے سپرنٹنڈنٹ نے اس نسخہ کے حاشیہ پر ذیل کی عبارت بزبان انگریزی لکھی ہے۔

A very popular poem, imitated from the Persian Leila and Mujnoon and Sheerin and Khosrou but original in all its details and exhibiting a very pleasing view of every day life among the rural population of the Panjab.[1]

شاہ آفریں کی اس مشہور مثنوی میں کل ۱۹۲ اوراق ہیں۔ اور ہر ورق میں دو کالم ہیں جن کے ہر صفحہ میں ۱۱-۱۲ سطریں ہیں کتابت اس کی واضح نستعلیق میں ہوئی ہے سائز اس کا ″۸ ۱/۲ × ″۵ ۵/۸ ہے اس مثنوی کا ایک نسخہ برٹش میوزیم لندن میں کٹلاگ نمبر ۲۷۷۸ کے تحت ہے جس میں کل ۱۰۲ اوراق ہیں سائز اس کا ″۹ × ″۵ ۳/۴ اور لمبائی ″۲ ۱/۸ ہے۔ ہر صفحہ میں ۱۱ سطریں ہیں۔ یہ نسخہ بھی خط نستعلیق میں ہے شوق محمد ساکن قصبہ جلال پور ہنداں نے کرنل جارج ولیم ہملٹن کمشنر ملتان کی فرمائش پر سنہ ۱۲۷۷ھ مطابق سنہ ۱۸۶۱ء میں اس کی کتابت کی تھی اس نسخہ کی بھی ابتداء ذیل کے شعر سے ہوئی ہے۔

بنام چمن ساز ناز و نیاز
کہ خار نیازش بود سر دماغ

اس مثنوی کا نام گرچہ ہیر رانجھا ہے لیکن کتاب کے اندر ہیروئن کا نام رانجھن مرقوم ہے مقبول نے "قصہ ہیر رانجھا" نام کی کتاب اردو میں لکھی ہے۔ جس کا ایک نسخہ برٹش میوزیم میں کٹلاگ نمبر ۱۲۷۲ کے تحت ہے لیکن یہ کتاب اردو نثر میں ہے۔ ہندوستان میں ہیر رانجھا کی کہانی، لیلیٰ مجنوں کی کہانی کی طرح مشہور ہے ہمارے ملک

---

[1] کٹلاگ انڈیا آفس جلد دوم صـ ۱۹

میں یہ قصہ اتنا ہر دلعزیز ہے کہ اس پر فلم بھی تیار ہو چکی ہے اور عوام نے بہت پسند کیا۔

اس مثنوی کا ایک نسخہ کٹلاگ نمبر ۷ کے تحت کنگس آف اودھ کے کتب خانہ میں بھی تھا جس میں ۲۱۲ صفحات تھے اور ہر صفحہ میں ۲۷ سطریں تھیں۔ اس نسخہ کے آغاز میں بھی ذیل ہی کا شعر ہے:

بنام چمن ساز ناز و نیاز
کہ خار نیازش بود سرو ناز

شاہ آفریں لاہوری بحیثیت شاعر

شاہ آفریں لاہوری عالمگیر، فرخ سیر اور محمد شاہ کے عہد کے ایک جامع کمالات شاعر اور صوفی تھے مگر فارسی ادب سے واقفیت رکھنے والے بیشتر حضرات ان سے بے خبر ہیں۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ دور مغلیہ کے اواخر عہد کے شعراء کے حالات کمیاب ہیں فارسی تذکرہ نگاروں نے عام طور پر انھیں شعراء اور اہل قلم کے حالات لکھے ہیں جن کے احوال زندگی اور کلام آسانی سے ان کو مل سکے شاہ آفریں کی حیات اور ان کے اشعار کمیاب ہیں اور صرف چند تذکروں میں ملتے ہیں۔ اس لیے ان کی حیات اور کمالات شاعری پردۂ خفا میں ہیں۔ ان کی گمنامی کا ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ ان کے دیوان کا کوئی نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے فقط ایک ہی نسخہ اب تک کی دریافت کے مطابق دنیا میں ہے جو برٹش میوزیم لندن میں ہے فارسی کے دیگر شعراء کی طرح اگر ان کے دیوان کے دو چار نسخے ہندوستان میں ہوتے تو تذکرہ نگاروں کو ضرور ان کے حالات قلمبند کرنے کی توفیق ہوتی۔ ایران میں جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں شاہ آفریں کا ذکر بالکل نہیں ہے۔ نامور ایرانی تذکرہ نگار لطف علی بیگ آذر نے آتش کدہ لکھا لیکن آفریں کے متعلق ایک حرف نہیں لکھا۔ رضا قلی خاں ہدایت[1]

---

[1] ریاض العارفین مطبوعہ تہران

نے بھی اپنے تذکرہ میں ان کا ذکر تک نہیں کیا۔ پروفیسر براؤن نے بھی ایک لفظ ان کے متعلق نہیں لکھا۔ آذر[1] نے البتہ اپنے تذکرہ میں ایک دوسرے آفریں کا ذکر کیا ہے جن کا نام زین العابدین تھا۔ اور وہ اصفہان کے باشندہ تھے۔ مولانا شبلی[2] نے بھی مقالات شبلی میں آفریں کا کہیں پر ذکر تک نہیں کیا۔ ایسی صورت میں راقم حروف کو ان کے حالات اور کلام کو حاصل کرنے میں دقتوں کا سامنا کرنا پڑا اور یہی وجہ ہے کہ اب تک ان کی زندگی اور ان کے شاعرانہ کمالات پر ایک عمیق پردہ پڑا ہوا ہے۔ اس کمترین نے "تاریخ الوسیع" شاہ آفریں جیسے باکمال اور گمنام صوفی شاعر کے اشعار کو یکجا کیا اور ان کے شاعرانہ محاسن پر تبصرہ کیا ہے۔

شاہ آفریں غزل سرا

والہ داغستانی جس نے کئی بار شاہ آفریں سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا[3] رقمطراز ہے۔

"دریں شہر بہ سخن سرائی مشہور بود ..... الحق بہ ایں
درد مندی کم کسی دیدہ شدہ غرض تا در لاہور بودم اکثر قدم رنجہ
می نمودہ و اثر صحبتش بر ذوق و شورم می افزود[4]"

والہ داغستانی نے یہاں تک لکھا ہے کہ اگر شاہ آفریں ایران میں پیدا ہوتے تو اپنے وقت کے بڑے شاعر ہوتے[5]۔ شاہ آفریں کے ہمعصر نامور تذکرہ نگار آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ شاہ آفریں اپنے اشعار میں نئے نئے معنی پیدا کرتے تھے یعنی بوسیدہ اور پرانے مضامین کو نئے رنگ میں پیش کرتے تھے تاکہ سننے والوں

---

[1] آتشکدہ نول کشور ص ۲۸۵ [2] ... [3] ریاض الشعراء ورق ۸۴

کے دلوں میں بیٹھ جاتے عام طور پر شعراء کا یہ خیال ہے کہ چمن میں محبوب کے آنے سے پھول مسکرانے لگتے ہیں لیکن آفریں نے اسی مضمون کو نئے ڈھنگ سے باندھا ہے کہ معشوق کے گلشن میں آنے سے غنچے ناقوس کی طرح چمن میں رونے لگتے ہیں۔

چوں سوی گلشن آید آفریں آں شوخ کافر دل
فغاں از غنچہ چوں ناقوس در دیر چمن خیزد[1]

آزاد بلگرامی کی رائے ہے کہ آفریں کے کلام میں ایسی شائستگی پائی جاتی[2] جس پر ہزاروں بار آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے بلا مبالغہ یہ کمترین اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ آفریں کے دیوان کے سارے اشعار میں شائستگی ہے جس شعر کو بھی دیکھا جائے وہ زندگی سے لبریز نظر آتا ہے۔

نظامی عروضی نے لکھا ہے کہ اچھے اشعار وہ ہیں جو شاعر کے مرنے کے بعد بھی زندہ رہیں کیونکہ جن اشعار میں خود کو زندہ رکھنے کی صلاحیت نہیں ہوگی وہ شاعر کو کیا زندہ رکھ سکتا ہے؟ الغرض آفریں کے اشعار اس کسوٹی پر پورے اترتے ہیں۔ راقم حروف ذیل میں آفریں کی ایک غزل نقل کرتا ہے جو حافظ شیرازی کی ایک مشہور غزل کے جواب میں ہے۔ آفریں کی غزل کو قلمبند کرنے کے بعد راقم حروف حافظ کی اس غزل کو لکھے گا۔ جس کے جواب میں آفریں نے ذیل کی غزل کہی ہے۔

دل قبلہ و نیاز نمی زد دوام ما	گرداندن رخ است ز دنیا سلام ما
ماتنگ قسمتاں ز دہانش بہ خط خوشیم	چو روزہ دار صبح امید است شام ما
در بزم او کہ رخصت عرض نیاز نیست	باشد نگاہ نامۂ حسرت پیام ما

---

[1] دیوان آفریں ورق ۸۹ [2] دیوان آفریں ورق ۸۷

بی عشق زہد بی نمک و مستی امت شور — بسیار سوختیم و نہ شد پختہ خام ما

الطاف می کہ حرف جہانست در داو ست — تا ہست دزد عشق الٰہی بکام ما

تشریف کبریای محبت بہ ما رسید — گردوں کند سجود و زمانہ سلام ما

چوں دست جوہری بزبان کہ آشنا ست — بتخال موج می زند از سوز نام ما

ما را چو آفریں می شیراز دادہ اند — ای بی خبر ز لذت شرب مدام ما[1]

اب ذیل میں حافظ شیرازی کی وہ غزل نقل کی جاتی ہے جس کے جواب میں شاہ آفریں نے مندرجہ بالا غزل کہی۔

ساقی بنور بادہ بر افروز جام ما — مطرب بگو کہ کار جہاں شد بکام ما

ما در پیالہ عکس رخ یار دیدہ ایم — ای بی خبر ز لذت شرب مدام ما

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق — ثبت است بر جریدۂ عالم دوام ما

چنداں بود کرشمہ و ناز سہی قداں — کاید بہ جلوہ سرو صنوبر خرام ما

ای بادہ گر بہ گلشن احباب بگذری — زنہار عرضہ دہ بر جاناں پیام ما

گو نام ما ز یاد بہ عمدا چہ می بری — خود آید آنکہ یاد نیاری ز نام ما

مستی بہ چشم شاہد دلبند ما خوشست — زاں رو سپردہ اند بہ مستی زمام ما

ترسم کہ صرفہ نہ برد روز باز خواست — نان حلال شیخ ز آب حرام ما

حافظ ز دیدہ دانۂ اشکی ہمی فشاں — باشد کہ مرغ وصل کند قصد دام ما

دریای اخضر فلک و کشتی ہلال — ہستند غرق نعمت حاجی قوام ما[2]

قارئین خود اندازہ فرمائیں کہ حافظ شیرازی کی اس غزل کے مقابلے میں شاہ آفریں کی غزل جسے راقم حروف قلمبند کر چکا ہے کس مقام پر ہے؟ اس ہیچ مداں

---

[1] دیوان آفریں ورق ۸۰۷ [2] دیوان حافظ شیرازی ص ۹ مطبوعہ تہران

کا خیال ہے کہ شاہ آفریں حافظ شیرازی کا مقابلہ تو نہیں کر سکتے لیکن ان کے اشعار بھی حافظ کے مقابلہ میں زیادہ پست نہیں ہیں۔ شاہ آفریں نے خود اپنے ذیل کے شعر میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ قدرت نے ان کو شیراز کی وہ شراب عشق پلائی ہے جس شراب عشق کو خواجہ حافظ شیرازی نے پیا تھا۔

مارا چو آفریں مے شیراز دادہ اند　　　ای بی‌خبر ز لذت شرب مدام ما[1]

شاہ آفریں کے دیوان میں کئی غزلیں خواجہ حافظ کے تتبع میں ملتی ہیں ان کی یہ ہمت قابل صد ستائش ہے کہ انھوں نے حافظ شیرازی جیسے بے نظیر غزل گو شاعر کے تتبع میں غزلیں کہی ہیں۔

شاہ آفریں کے دیوان میں امیر خسرو جیسے باکمال استاد وقت شاعر کے تتبع میں اشعار ملتے ہیں ذیل میں چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ای شوخی مژگان تو سرمایۂ افسون گری[2]
واکردہ چشمت از نگہ طومار سحر سامری
ابرو سدت بنی خوشش ادا مضمون سراپا دلبری
ای چہرۂ زیبای تو رشک بتان آذری
هر چند وصفت می کنم در حسن ازاں زیبا تری

بنشاند شوقم یک دمک از دل نہ شد با غیر حک
کردم تماشا را یک فوق سما تحت سمک
آخر چو دیدم یک بیک معلوم شد بی‌ہیچ شک
تا نقش می بندد فلک کس را نہ دادہ این نمک
حوری نہ دانم یا ملک فرزند آدم یا پری

۱۔۲ دیوان آفریں ورق ۸، ۲۵۸

ای چشم دل ماوای تو بیمار دی پنهان جای تو
عید جنون غم های تو شهر طرب صحرای تو
سود خرد سودای تو تنها نه من رسوای تو
عالم همه شیدای تو خلقی همه نعمای تو
آن نرگس رعنای تو آورد کیش کافری

اب ذیل میں امیر خسرو کے وہ چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن کے تتبع میں شاہ آفریں لاہوری نے مندرجہ بالا اشعار کہے تاکہ قارئین دونوں کے کلام کا مقابلہ کر کے آفریں کے متعلق ایک رائے قائم کر سکیں۔

ای چهرهٔ زیبای تو رشک بتان آزری[1]
هر چند وصفت می کنم در حسن زان بالاتری
هرگز نیاید در نظر نقشی ز رویت خوبتر
شمسی ندانم یا قمر تو زهرهٔ یا مشتری
تا نقش می بندد فلک هرگز نداده این نمک
حوری ندانم یا ملک فرزند آدم یا پری
صورتگر نقاش چین رو صورت یارم ببین
صورتی کش این چنین یا ترک کن صورتگری
آفاق ها گردیده ام مهر بتان ورزیده ام
بسیار خوبان دیده ام اما تو چیزی دیگری
من تو شدم تو من شدی من تن شدم تو جان شدی
تا کس نگوید بعد ازین من دیگرم تو دیگری

---

[1] تحفۃ الصغر صـ۲۷۷

خسروِ غریب ، مست و گدا افتادہ در شہر شما
باشد کہ از بہر خدا سوی غریباں بنگری

خان آرزو نے شاہ آفریں کے کلام کی بڑی تعریف کی ہے اس نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں بہت خوش زبان تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں شیرینی درجۂ کمال پر پائی جاتی ہے۔ اس وصف میں خواجہ حافظ کے مقابلہ میں غزل گوئی میں کوئی سخنور نہیں تھا۔ خواجہ حافظ نے فارسی شاعری میں شیرینی اور حلاوت کو درجۂ کمال پر پہنچایا ہے۔ صائب جیسے استاد وقت نے خواجہ حافظ کی غزلوں کا تتبع کرنا بے ادبی سمجھا تھا۔

روا است صائب اگر نیست انیٔ رہ روی
تتبع غزل خواجہ گرچہ بی ادبی ست

ایسی صورت میں شاہ آفریں کا حافظ شیرازی کے تتبع میں غزل کہنا باعث صد آفریں ہے شاہ آفریں نے خود ذیل کے مصرع میں درج کیا ہے کہ قدرت نے ان کو شیراز کی شراب عشق پلایا ہے اس لئے ان کے اشعار میں درجۂ کمال پر ہیں۔

ما را چو آفریں مئی شیراز دادہ اند
ای بی خبر ز لذت شراب مدام ما[1]

ذیل میں شاہ آفریں کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی شیریں بیانی کا اندازہ ہوگا گرچہ ان کا پورا دیوان شیرینی اور حلاوت میں ڈوبا ہوا ہے۔
ذیل کے اشعار بھی حافظ کی مشہور غزل کے تتبع میں ہیں جس کا مطلع یہ ہے۔

یوسف گم گشتہ باز آید بکنعاں غم مخور
کلبۂ احزاں شود روزی گلستاں غم مخور

اب ذیل میں آفریں کے چند اشعار اسی زمین میں ملاحظہ ہوں۔

دل ز گرد غم بروں آید بساماں غم مخور
می دہد ہر تخم زیر خاک پنہاں غم مخور[2]

[1-2] دیوان آفریں ورق ۸، ۱۴۲

مہرباں خواہد شدن آں غمزۂ نمرود کیش | بہر خلیل دل شود آتش گلستاں غم مخور
کربلا یعنی سر آں کو بہ اقبال نیاز | می شود دار الشفا دردمنداں غم مخور
گر بہار عمر باشد از نسیم وصل دوست | خار خار آرزو گردد گلستاں غم مخور
آفریں دیدی چساں بگذشت ایام وصال | ہمچنیں روزی سر آمد شام ہجراں غم مخور

شاہ آفریں نے بہت ممکن ہے کہ شیخ سعدی اور خواجہ حافظ کی طرح عشق مجازی کا تیر کھایا ہو اور بعدہ عشق حقیقی کی دنیا میں پہنچے ہوں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ ایک باکمال صوفی تھے اور تارک دنیا تھے انکے اخلاق اور اعمال صوفی جیسے تھے۔ ان کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وہ کہاں تک بیان کرے کہ توکل اور قناعت میں اس کے استاد شاہ آفریں کس مقام پر تھے۔ عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ وہ گوشۂ تنہائی میں فاقے کرتے تھے گرچہ نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور کی طرف سے ان کو ایک روپیہ یومیہ وظیفہ ملتا تھا۔ فقر اور قناعت صوفیا اور اہل اللہ کے خاص زیور ہیں ان دو صفات کے بغیر سلوک کی راہیں طے نہیں ہو سکتیں۔ پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم خود فقر اور قناعت کے مجسمہ تھے۔ آپ اکثر فرماتے تھے کہ فقر ہمارے لیے افتخار ہے "الفقر فخری"

ہندوستانی شعرا میں مرزا عبدالقادر بیدل فقر اور قناعت میں اپنی مثال آپ تھے۔ شہزادہ وقت نے ان سے مدحیہ قصیدہ کی درخواست کی لیکن انھوں نے ٹھکرا دیا اور ترک ملازمت کر لی۔ نظام الملک آصف جاہ نے ان کو دکن میں ایک بلند عہدہ دینا چاہا اور اس مقصد سے ان کو بلایا لیکن انھوں نے ذیل کا شعر لکھ کر بھیج دیا مگر نہیں گئے۔"

سلہ دیوان آفریں ورق ۱۲۲

دنیا اگر دہند نہ خیزم ز جای خویش [۱]
من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش

[illegible] بھی مرزا بیدل کے ہمعصر شاعر تھے اور ان کے کلام سے متاثر تھے
جیسا کہ تذکروں سے معلوم ہوتا ہے مرزا بیدل کو ان سے غائبانہ الفت بھی تھی [۲] اور
ان کے ذیل کے شعر کو اکثر پڑھا کرتے تھے۔

حجاب عشقم نہ داد رخصت سوال بوس از دہان تنگش
از و نمی آید این مروت ز من نمی آید این تقاضا

شاہ آفریں کا عقیدہ تھا کہ توکل پیشہ انسان کے لئے کسی سے طلب کی خواہش
میں ایک قدم بھی اپنے گھر سے باہر جانا برہنہ ہونیکے مثل ہے ذیل میں ان کا شعر
ملاحظہ ہو:

بہ فتوای خرد از کشف عورت ہم بتر باشد
توکل پیشہ را یک گام بیرون ز آستان خود [۳]

شاہ آفریں نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا دعوی کیا ہے کہ ان کی پرورش
تسلیم و رضا کی نعمت سے ہوئی ہے اور وہ زہر ناب کو بھی شربت سمجھتے ہیں۔ [۴]

بہ نعمت ہای تسلیم و رضا پروردہ ام خود را
بکامم آفریں شربت شود گر زہر ناب آید

آفریں نے اپنے شعر ذیل میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ ان کا پیشہ قناعت ہے،
جس کی وجہ سے ان کا چہرہ یاقوت کی طرح سرخ ہے گرچہ پیٹ خالی ہے۔

قناعت مشربم از بسکہ دارم پاس آب خود [۵]
چو یاقوت است رویم سرخ از موج شراب خود

شاہ آفریں عشق حقیقی سے سرشار تھے ان کے دیوان کے بہت سارے اشعار
عشق حقیقی اور رموز عشق کے نکتہ کو پیش کرتے ہیں۔ ان کا یہ عقیدہ تھا کہ ذکر حق ایسا

---

[۱] خزانہ عامرہ [۲] مردم دیدہ ص ۲۰ [۳،۴،۵] دیوان آفریں ورق ۱۳۴، ۱۲۶، ۱۲۷

ہو کہ صرف زبان اور دل ہی سے لا الٰہ الا اللہ نہ نکلے بلکہ جسم کے ہر ایک بال سے
لا الٰہ الا اللہ کی آواز آئے بعض صوفیا کے حالات میں مرقوم ہے کہ عبادت کے وقت
ان کے جسم کے ہر عضو جدا ہو کر ذکر حق میں مشغول رہتے تھے۔ ذیل میں چند ایسے اشعار
شاہ آفریں کے لکھے جاتے ہیں جن سے ان کے فلسفہ عشق حقیقی کا پتہ چلتا ہے۔

ذکر کن آں قدر کہ بانگ زند — مو بہ مو لا الٰہ الا اللہ

درد سر جہاں را ما صندلیم صندل — ما شاعریم عارف ما حکمت خدائیم

محبت آفریں روشن کن آئینۂ باطن — طپیدن ہای دل صیقل گر زنگار خود کردیم

آفریں ملک جم از بہر بہ تسخیر آمد — ایں فسو نیست کہ ز دیو بہ زنداں کردیم

ہر ورقی در نظر معرفت از نسخۂ عشق — دفتری بود سر رشتہ چو پیدا کردیم

از عشق راہبر بہ خدای تواں شدن — سرگشتہ شو کہ قبلہ نمای تواں شدن

ریاض کائنات از فیض من نشو و نما دارد — نہال از من گل از من غنچہ از من بہار از من

چہ فیض ہاست در اکسیر خاک حضرت عشق — کہ تخت پیر تواں آفریں جواں کردن

حریف فقر نہ ور نہ عالمی دارد — نیازمند شدن ناز بر شہاں کردن

عارفاں دانند حال خلق از سیمای خلق — نیک و بد را سرنوشتی نیست الا بر جبیں

شہاں فقر را پروای چاوشی نمی باشد — کہ از من نفرت خلق است کافی اہتمام ما

تشریف کبریای محبت بہ ما رسد — گردوں کند سجود زمانہ سلام ما

جنون عشق بجائی رساند پایۂ ما — کہ نقش پا دل مجنوں شود ز مایۂ ما

محمود بت شکن بہ شکوہ ہند نمی رسد — عشق از شکست خود چو مظفر کند ترا

شاہ آفریں عشقیہ شاعری میں بھی مہارت رکھتے تھے جس کا ثبوت ان کی

١؎ ۲؎ دیوان شاہ آفریں نسخہ لندن

مایۂ ناز مثنوی "ہیر رانجھا" ہے[1]۔ علاوہ ازیں ان کے دیوان میں سیکڑوں ایسے اشعار موجود ہیں جن سے عشق و عاشقی اور رندی و سرمستی ٹپکتی ہے، گرچہ وہ صوفی تھے لیکن چونکہ ان کی طبیعت میں فطرتاً رنگینی اور شگفتگی تھی اس لیے انھوں نے ناز و نیاز اور بوس و کنار کے مضامین بھی نہایت حسن و خوبی کے ساتھ نظم کیے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ عشق و محبت کی واردات سے واقف تھے۔ معشوق کے ظلم و ستم سے فارسی شاعری بھری پڑی ہے اور عاشق معشوق کے غم میں روز بروز موم کی طرح نحیف و زار ہوتا جاتا ہے۔ شاہ آفریں نے اس پرانے مضمون کو نئے قالب میں پیش کیا ہے ان کے ذیل کے شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ جب وہ شوخ کافر دل معشوق گلشن میں آتی ہے تو چمن کی ہر کلی ناقوس کی طرح درد و غم سے چیخنے لگتی ہے۔

چو سوی گلشن آید آفریں آں شوخ کافر دل
فغاں از غنچہ چوں ناقوس در دیر چیں خیزد

ذیل میں ان کے چند عشقیہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

بہ تنہا دل ربودہ چشم او مستِ شراب آید | سخن را گر زمیں کاوند صہبا جائی آب آید
بمردن ہم نمیرد آتش سوز دل عاشق | گلی کز خاک مشتاقاں دمد بوی کباب آید
شہیداں را نفس در خوں طپید چوں غنچۂ لالہ | بہ محشر گر چنیں با غمزۂ حاضر جواب آید
بہ رنگی شد عرق ریز حیا آں شاخ گل امشب | کہ موج نکہت گل از فروغ ماہتاب آید[2]

خان آرزو و واقف لاہوری کا بیان ہے کہ شاہ آفریں نے شاعری میں ناصر علی کے طرز کو اختیار کیا تھا۔ واقف لاہوری نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں نوعمری ہی میں تھے کہ ناصر علی اپنے والد کے ساتھ لاہور آئے تھے اور شاہ آفریں سے ملے تھے۔ اس نے

۱، ۲ـ دیوان شاہ آفریں ورق ۹۰، ۱۲۴

شاہ آفریں کو اپنی مثنوی بھی تبرکاً پیش کیا تھا اور کہا تھا کہ جب ہوش کی آنکھ کھل جائے تو اس کا مطالعہ کریں گے۔

"ناصر علی را ہمراہ والد خود کہ در حفظ استاذ معزی الیہ بود در صغر سن دریافتہ ، ناصر علی مثنوی خود بہ شاہ مذکور مغفور تبرکاً عنایت فرمود و گفت ہر گاہ چشم ہوشت وا شود مطالعہ خواہی نمود و ناصر علی این شعرش پسند نمود"

نسیمی می کند نیلوفری برقع بنا گوشت[1]

فغان ہای شب ہجران شنیدن ہا چہ می دانی

ناصر علی جیسے باکمال شاعر نے شاہ آفریں کے مندرجہ بالا شعر کو پسند کیا تھا۔ یہ بات قابلِ تعریف ہے شاہ آفریں نے اپنے دیوان میں مرزا صائب اصفہانی کی بڑی تعریف کی ہے اور ان کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وہ اکثر مرزا صائب ہی کے تتبع میں اشعار کہتے تھے۔ ذیل میں آفریں کے وہ اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن میں انھوں نے مرزا صائب کو یاد کیا ہے:

منم از گلشن ہند آفریں رنگین نوا بلبل

اگر شد صائب شیریں سخن در اصفہاں پیدا

ہمچناں سودای ندارد آفریں   صائب و بیدل بود از جاں خریدارش ہنوز[2]

مرزا صائب کے تتبع میں شاہ آفریں کے دیوان میں بہت سی غزلیں ہیں اس لئے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ شاہ آفریں کو مرزا صائب کا طرز پسند تھا۔

شاہ آفریں امراء اور اہل دنیا سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے جیسا کہ تذکروں سے

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۹ [2] ایضاً دیوان شاہ آفریں ورق ۲۲ ، ۱۶۶

معلوم ہوتا ہے اس لیے ان کے دیوان میں کسی رئیس اور وزیر کی مدح میں قصیدہ نہیں ہے البتہ انھوں نے اپنے محسن نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور کی مدح ایک غزل میں کی ہے کیونکہ نواب مذکور کا وہ نمک خوار تھا۔ آفریں نے اس کی مدح میں مبالغہ سے بالکل کام نہیں لیا ہے اس کا وظیفہ ایک روپیہ یومیہ کے حساب سے انھوں نے اسلئے قبول کیا تھا کیونکہ نواب مذکور خدا پرست، نہایت دیندار اور عبادت گزار تھے۔ حاکم لاہوری نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ اس نے کبھی تہجد کی نماز قضا نہیں کی۔ ایسی صورت میں اگر شاہ آفریں نے اس کا عنایت کیا ہوا وظیفہ قبول کیا تو کوئی عیب کی بات نہیں اگر اس نے کسی دنیادار امیر یا وزیر سے کچھ قبول کیا ہوتا تو یہ بات قابل گرفت تھی ذیل میں اس غزل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جس میں شاہ آفریں نے نواب عبدالصمد خاں کا ذکر کیا ہے۔ اور اس کو دعا دی ہے۔

گزند عاقبت یارب مباد اورد مندان را
سپند چشم زخم دردی سوزند درمان را

زخبث باطن خویشند غافل این ریاکیشان
اگر دانند از خود ہیچو سگ دو زند داماں را

چو قمری بانگ کوکو می زند ہر مو براندامم
بسر وقت من آور یارب آں سرو خراماں را

پسر ابتر چو گردد از پدر اصلاح نپذیرد
کہ نتواند نمودن جمع گل بوی پریشاں را

بیک منعم چو گردی آشنا جمعیت پرداز در کن
صدف در بحر دارد انتظار ابر نیساں را

۱؎ مردم دیدہ ص ۱۷۱۔

زمین و آسماں دست دعا شد آفریں من ہم
نگہ دارد خدا از چشم بد عبد الصمد خاں را[1]

شاہ آفریں نے اپنی ایک غزل میں شاہ حسین کا ذکر کیا ہے جو بسنت سے متعلق ہے۔

تمام دل شوم و آفریں بوجد آیم ... مراز شاہ حسین است یادگار بسنت[2]

شاہ آفریں کو اپنے عزیز ترین شاگرد حاکم لاہوری سے بڑی محبت تھی اس لئے انھوں نے اس کے جشن عروسی کے موقع پر مبارکباد میں ایک غزل کہی تھی جس کے چند اشعار ذیل میں لکھے جاتے ہیں۔

بگو بہ حاکم ما ای صبا مبارکباد	ترا ز ماو ز ارض و سما مبارکباد
گرفت نخل تو پیوند نو چو شد کدخدا	چمن طرازی نشو و نما مبارکباد
عروس دہر کہ در عقد کس نمی آید	ترا بزیور مہر و بقا مبارکباد
چمن شد انجمنت از دمیدن گل عیش	ہزار مطرب بلبل نوا مبارکباد
زبس دعای تو ورد زباں پاک انست	کنند فرشتہ بدست دعا مبارکباد
مدام منزل عیش ترا ز بلبل و گل	ہزار قافلہ برگ و نوا مبارکباد
چنیں کہ صورت دمنی ز دست ای حاکم	ز آفریں دہم از اولیا مبارکباد[3]

شاہ آفریں گرچہ شیعہ تھے لیکن حضرت شیخ عبد القادر جیلانیؒ سے ان کو بیحد عقیدت تھی وہ چونکہ ایک باکمال صوفی تھے اس لئے ان کو بزرگان دین سے بڑی الفت و محبت تھی حضرت غوث الاعظم کے صفات حمیدہ کی انھوں نے بہت تعریف کی ہے۔ بلا شبہ آپ کی ذات گرامی سارے عالم کے لئے باعث رحمت ہے

1، 2، 3 دیوان شاہ آفریں ورق ۳۸، ۸۰، ۱۲۷

شاہ آفریں نے آپ کے دست مبارک کو دست خدا کہا ہے ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں۔

مسند یا لغز خطا یا غوث اعظم الغیاث
ای دست تو دست خدا یا غوث اعظم الغیاث

آرائش کون و مکاں شمع و چراغ انس و جاں
شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ یا غوث اعظم الغیاث

ہم بحر با ساحل توئی ہم پای تا سر دل توئی
سرچشمۂ نور ہدیٰ یا غوث اعظم الغیاث

گویند گر در مشکلی یادت کند آساں شود
ماایم مشکل ماجرا یا غوث اعظم الغیاث

ای لوح محفوظ خدا محفوظ ملحوظ خدا
ای محی دین مصطفیٰ یا غوث اعظم الغیاث

الیٰ کہ دست قدرتت مبرم معلق می کند
خواہم شود فقرم غنا یا غوث اعظم الغیاث

اوتاد یا محکم زلتو اقطاب صاحب دم زتو
ابطال و ابدالت فدا یا غوث اعظم الغیاث

چوں آفریں عمریست تا از نقش کافر ماجرا
دشمن قوی بیچارہ ما یا غوث اعظم الغیاث[1]

شاہ آفریں کے دیوان میں حضرت علیؓ کی مدح میں کئی غزلیں ہیں چونکہ ان کا

---

[1] دیوان آفریں ورق ۸۲

دل بقول والہ داغستانی درد سے لبریز تھا اس لیے ان اشعار میں انھوں نے عمیق درد و غم کا اظہار کیا ہے ذیل میں چند اشعار قلمبند کیے جاتے ہیں۔

تا چند آہ شعلہ کشد یا علیؓ مدد — ریزد زخم چو شمع جد یا علیؓ مدد
موقوف یک بہار کرم ہیچو عنبر است — شد نامہ ام سیاہ مدد یا علیؓ مدد
حسرت تمام چشم بدار الشفای تست — درد دلم یکی شدہ صد یا علیؓ مدد
ہر قست پیش نفسی آرمیدہ — بی تا بیم رسانست مدد یا علیؓ مدد
می نالد از ستم گری چرخ آفریںؔ — جز تو بگو کہ داد دہد یا علیؓ مدد[1]

شاہ آفریں نے بقول حاکم لاہوری[2] علم رمل اور دیگر علوم متداولہ کا بھی اکتساب کیا تھا اس لیے ان کے اشعار میں ان کے علم و فضل کی خاص جھلک ملتی ہے۔ وہ عربی زبان سے بھی اچھی طرح واقف تھے اس لیے ان کے دیوان میں جا بجا عربی کے الفاظ ملتے ہیں۔

نظامی عروضی نے لکھا ہے کہ شاعر کو سلیم الفطرت، عظیم الفکرۃ، صحیح الطبع اور دقیق النظر ہونا چاہیے۔ راقم حروف شاہ آفریں کے دیوان کے مطالعہ کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا ہے کہ وہ سلیم الفطرت صحیح الطبع اور دقیق نظر والے تھے۔ شاعر کی نگاہیں بڑی تیز ہوتی ہیں اور ہر شئے کو وہ اپنے انداز سے دیکھتا ہے اس میں شبہ نہیں کہ شاہ آفریں کو قدرت نے شاعرانہ کمالات سے نوازا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ خان آرزو جیسے نقادِ وقت نے بھی ان کی شاعری کی بڑی تعریف کی ہے۔ ذیل میں چند اشعار پیش کیے جاتے ہیں جن سے ان کے دقیق النظر ہونے کا پتہ چلتا ہے:

صدای بحر دارد سیل چوں بحر آشنا گردد — ہمہ یار است ہر کس آفریں با یار ہمدم شد[3]

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۸۷، ۸۹ [2] مردم دیدہ ورق ۱۸

عشق ہم موقوف اظہار است ورنہ آفریں — زیب ارنی بر طور موسیٰ می شود[1]
لباس فقر از مردان کند نامرد دنیا را — محقق می شود ہر کس دریں تقلید می آید[2]
جلوۂ آں بی نشاں بسیار و امکاں عرصہ تنگ — آفریں ما آں چہ می جستیم در عالم نہ بود[3]
زمیں بوس جلالش آفریں مشکل بود مشکل — چو صبح از چشمۂ خورشید اگر شویم دہان خود[4]

شاہ آفریں کا یہ فلسفہ کہ گرچہ معبود ازلی کے بیشمار جلوے ہیں اس عالم فانی میں مگر انسان باوجود تلاش بسیار اس ہستی کو نہیں دیکھ سکتا ہے اس جستجو میں انھوں نے ساری عمر صرف کی۔

جلوۂ آں بی نشاں بسیار و امکاں عرصہ تنگ
آفریں ما آنچہ می جستیم در عالم نہ بود[5]

ظاہر ہے وہ بے نشاں انسانی نگاہوں میں کس طرح آسکتا ہے خود خدا نے بھی کہا ہے کہ تم آنکھوں سے ان کو نہیں دیکھ سکتے۔

نہ بینی مرنجاں رو بینندہ را

نظامی عروضی کے معیار کے مطابق شاعر کا خوشگو اور خوشرو بھی ہونا لازم ہے شاہ آفریں خوشروئی اور خوشگوئی میں بھی ایک بلند مقام پر تھے۔ ان کی زندگی کے واقعات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظریف الطبع بھی تھے۔ ان کی خوشروئی کا یہ نہایت عمدہ ثبوت ہے کہ ان کے شاگرد حاکم لاہوری[6] نے ایک دن ان کی خدمت میں خواجہ منور قدرت کا ذیل کا شعر پڑھا۔

تشبیہی بر لب بالای جاناں کردہ ام پیدا
شریکی غالب چاہ زنخداں کردہ ام پیدا

۱، ۲، ۳، ۴، ۵ دیوان شاہ آفریں ورق ۹۰، ۹۴، ۹۵، ۱۰۱، ۹۵ ۔ ۶ مردم دیدہ ص ۱۸۲

شاہ آفریں یہ شعر سنکر مسکرائے اور بولے کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عزیز نے خلاقی کا دعویٰ کیا ہے۔

شاہ آفریں کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ قدماء اور متوسطین کے دواوین کا انھوں نے گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ان کے شاگرد حاکم لاہوری[1] کا بیان ہے کہ وہ کتاب دانی میں ماہر اور بے نظیر تھے ایک باکمال شاعر کے لئے لازم ہے کہ وہ قدماء اور متوسطین کے کلام کا مطالعہ کرے اور دیکھے کہ مشکل موقعوں پر خیالات کو کس طرح ان شعراء نے باندھا ہے۔

شاہ آفریں کے کلام میں (خلاق) کے فلسفے بھی ملتے ہیں اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ ان میں تواضع اور خاکساری درجۂ کمال پر تھی علاوہ ازیں وہ چونکہ ایک صوفی تھے اس لیئے انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عوام کو اخلاق کی تعلیم دی ہے ذیل میں ایسے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

انسان کو اپنے نسب پر فخر نہیں کرنا چاہیئے بلکہ خود اپنے اندر جوہر پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

شو سرفراز جوہر ذاتی برنگ تیغ — زاں ابلہاں مباش کہ فخر از نسب کنند[2]

جو لوگ فقر کا لباس پہنتے ہیں وہ دنیا پر فاتح ہوتے ہیں۔

لباس فقر از مردان کند نامرد دنیا را — محقق می شود ہر کس دریں تقلید می آید

انسان زندگی بھر اسی وفا دنیا کی نعمتوں کو حاصل کرنے میں غرق رہتا ہے:

آیدم ای آفریں گریہ بحال خودم
عمر بہر بی وفا صرف وفا می شود[3]

---

[1] مردم دیدہ ص ۲۰   [2،3] دیوان شاہ آفریں ورق ۸۸
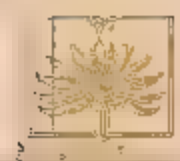
کمینہ لوگوں سے جہاں تک ممکن ہو کنارہ کش رہنا چاہیئے:

از بدمعاش مردم ایں دہر آفریں[1] | خوب است اگر کنارہ گرفتی کنارہ تر

شاہ آفریں نے مثنوی معنوی کا گہرا مطالعہ کیا تھا اور ان کے اشعار ان کو بہت عزیز تھے انھوں نے مثنوی معنوی سے اس طرح استفادہ کیا تھا جس طرح کوئی شاعر کسی استاد سے استفادہ کرتا ہے مثنوی معنوی کے مطالعہ نے ان کے دل و جگر کی چنگاری کو شعلہ بنا دیا تھا والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ انھوں نے ایسا دردمند بہت کم لوگوں کو دیکھا۔

"الحق بہ ایں دردمندی کم کسی دیدہ شدہ"[2]

آفریں نے مولانا روم کو نہایت احترام کے ساتھ اپنے ذیل کے شعر میں یاد کیا ہے اور کہا ہے کہ وہ ان کے در کی خاک ہے۔

خاک در مولیست آفریں | آب رخ دانش و فرہنگ من

علامہ اقبال جیسے باکمال شاعر نے بھی مولانا روم کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا ہے۔ ان کی فارسی شاعری ہی میں نہیں بلکہ اردو شاعری میں بھی مولانا روم کے فلسفۂ عشق کا گہرا اثر ہے علامہ اقبال نے اپنی شاعری میں عشق کو عقل پر برتری دی ہے یہی نہیں بلکہ انھوں نے عقل کو عیار و مکار کہا ہے کیونکہ عقل سو بہانے تراشتی ہے لیکن عشق اپنے وعدہ پر قائم رہتا ہے نہ اس کو جلنے کا غم ہے نہ فنا ہونے کا خوف علامہ اقبال کے ذیل کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

عقل عیار ہے سو بھیس بدل لیتی ہے | عشق بیچارہ نہ ملا ہے نہ زاہد نہ حکیم

بے خطر کود پڑا آتش نمرود میں عشق | عقل ہے محو تماشائے لب بام ابھی

---

[1] دیوان شاہ آفریں [2] ریاض الشعراء ورق ۴۴

علامہ اقبال کے ذیل کے شعر سے یہ واضح ہوتا ہے کہ انھوں نے مولانا روم کو اپنا پیر و مرشد تسلیم کیا تھا

پیر رومی مرشد روشن ضمیر	کاروان عشق و مستی را امیر
منزلش برتر زماہ و آفتاب	خیمہ را از کہکشاں سازد طناب
نور قرآں درمیاں سینہ اش	جام جم شرمندہ از آئینہ اش
از نے آں نے نواز پاک زاد	باز شورے در نہاد من فتاد[1]

مصحفی[2] کا بیان ہے کہ شاہ آفریں نہایت شیریں زبان اور فصاحت کے پیکر تھے۔ شیرینی اور فصاحت استاد غزل شیخ سعدی اور حافظ شیرازی کے اشعار میں درجۂ کمال پر ہے۔ ان باکمال شعراء کے کلام میں موسیقی کو خاص دخل ہے۔ شاہ آفریں کے اشعار بھی سلاست کے بہترین نمونہ ہیں لیکن ان کی بعض غزلیں بیدل کے رنگ میں بھی ہیں اگر ان کے دیوان سے بیدل کے تتبع کے اشعار جدا کر دیئے جائیں تو ان کا دیوان سلاست کا بہترین سرمایہ ہوگا۔ سلاست وہ صفت ہے جو شعر کو قاری کے دل و دماغ میں اتار دیتا ہے۔ ذیل میں چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن میں سلاست اپنے کمال پر ہے :-

بہ یک منعم چو گردی آشنا جیبت پر از در کن
صدف در بحر دارد انتظار ابر نیساں را[3]

محمود ... شکن بشکوہت نمی رسد
عشق از شکست خود چوں مظفر کند ترا[4]

شمع جاں بی نور شد از ظلمت ہستی مپرس
تا نفس باقیست استغفار می باید مرا[5]

---

[1] مثنوی پس چہ باید کرد ص۵ [2] عقد ثریا ص۲۲، ۵ [3] دیوان شاہ آفریں ص۲۸، ۹

خوشگو، شاہ آفریں کا ہمعصر تھا اس نے ایک غزل آفریں کی مدح میں لکھ کر ان کو بھیجا تھا جس میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ شاہ آفریں لاہور کے سخنوروں کے بادشاہ تھے اور ملک شاعری کی رکاب کے آقا تھے۔ ان کی یہ تعریف اس وقت کی گئی جب وہ بقید حیات تھے۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ بدون شک شاہ آفریں مذکورہ بالا صفات کے حامل تھے۔ کیونکہ ان کے دیوان کے سارے اشعار زندگی کی توانائی سے تڑپتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار پر اکتفا کیا جاتا ہے:

مارا چو آفریں مئی شیراز دادہ اند　　　ای بی خبر ز لذت شرب مدام ما[1]

جنون عشق بجای رساند پایۂ ما　　　کہ نقش پا دل مجنوں شود ز سایۂ ما[2]

آں شوخ را بہ دام نیاوردی آفریں　　　مجنوں شدی و رام نکردی غزالہ را[3]

خوشگو نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں کو الفاظ اور معانی پر قدرت حاصل تھی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عمدہ کلام وہی ہے جس میں موزوں اور بامعنی الفاظ استعمال ہوئے ہوں۔ فارسی شاعری میں فردوسی، شیخ سعدی، حافظ شیرازی، امیر خسرو اور عرفی وغیرہم کو الفاظ پر قدرت حاصل تھی رودکی بھی اس وصف میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ شاہ آفریں کے اشعار کے مطالعہ سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ ان کو الفاظ پر قدرت حاصل تھی اور موزوں الفاظ ان کے سامنے دست بستہ کھڑے نظر آتے تھے۔ ذیل میں دو شعر نقل کئے جاتے ہیں جن سے ان کی قدرت الفاظ ظاہر ہے۔

مو بہ مویم بسکہ طومار غم پنہاں اوست
می تواں ہر قطرہ خونم آفریں دل نام کرد[4]

عمری گذشت بوی مروت نمی رسد　　　گلدستۂ ز باغ فتوت نمی رسد[5]

۱، ۲، ۳، ۴، ۵ دیوان شاہ آفریں ورق ۸، ۱۰، ۴، ۹۹، ۱۲۲

خوشگو[1] نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ شاہ آفریں کی شاعری کی شہرت ملک روم اور چین تک گئی۔ راقم حروف کا خیال ہے کہ خوشگو کے کہنے کا یہ مقصد ہے کہ شاہ آفریں کی شاعری کا شہرہ دور دور تک پہنچا نہ کہ ملک روم اور چین۔ اگر یہ بات صحیح مان لی جائے تو پھر جائے تعجب ہے کہ بیشتر تذکروں میں ان کا ذکر کیوں نہیں ملتا۔

شاہ آفریں ایک باکمال شاعر اور استاد وقت تھے۔ لیکن خوشگو کا بیان ہے کہ ان کے بہت سے شاگرد بھی اپنے وقت کے استاد ہوئے۔ لذر العین واقف جیسے نامور شاعر کے بارے میں خوشگو نے لکھا ہے کہ وہ بھی شاہ آفریں کا شاگرد تھا۔

شاہ لاہور سخن ملک رکاب ملک تسلیم
کز سپاہ لفظ و معنی کوس زد در روم و چین
ای ز شاگردان درگاہ تو استادان وقت
گرد استاد جہاں، شاگرد رب العالمین[2]

آفریں کو منقبت شہدائے کربلا کے بیان کرنے میں بھی بڑی مہارت تھی اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کو قدرت نے ایک نہایت درد مند دل دیا تھا۔ قدرت الفاظ کی وجہ سے ان کے منقبت کے اشعار نہایت پر اثر اور درد میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یہ اشعار قاری کے دل و جگر میں فوراً اپنا مقام بنا لیتے ہیں۔ ذیل میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

فریاد ازیں مصیبت و زیں درد خونچکان — زخم ہزار نشتر و الماس و نبض جان
این ظلم و ایں تعدی و ایں بے مروتی — فریاد ازیں مصیبت نادیدہ کن فکان[3]

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۲۲۹،۲۱۰ [2] سفینۂ ہندی ورق ۲۲۱ [3] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۷۱

نالہ چنیں درون شکم چوں دل عروس	آہنگ است یار قافلہ پیر و نوجوان
ماہ محرم است ز عیش احتراز کن	مجلس بہ نوحہ گرم کن و نالہ ساز کن
گہ در قیام نالہ گہی در سجود عشق	دہ روز ساز ہمچو شمار این نیاز کن
از زخم خونچکاں شہیدان خاک کربلا	مانند بہ آن انار کہ از پختگی کفید
از حرف ماجرای حسینؓ و غم حسنؓ	چوں زخم تازہ چشمہ خوں می شود دہن
از کائنات دود بر آورد ہای ہای	کرسی و عرش لوح و قلم گریہ می کند
بلبل بہ نالہ آمد و گلشن بہ خون تپید	گل سینہ چاک کردہ و سنبل کشادہ موست
عرش خدا اسلام و فلک سجدہ می کند	با خود علو شان شہیداں کجا رسید
دل سوخت در ہوای حسینؓ و حسنؓ مرا	جان نیز از برای حسینؓ و حسنؓ مرا[1]

شاہ آفریں کا یہ فلسفہ تھا کہ دنیا کبھی مسند نشینوں سے خالی نہیں رہیگی۔ ایک شخص اس کرسی کو چھوڑ کر جائے گا تو فوراً دوسرا اس کرسی پر آ بیٹھے گا۔ ذیل کے شعر میں انھوں نے اس فلسفہ کو پیش کیا ہے جو ہم لوگوں کو بے ثباتی عالم کا درس دے رہا ہے لیکن ہم لوگوں کو اتنی کہاں فرصت کہ اس شعر کی روشنی میں اپنے کو صراط مستقیم پر چلائیں۔

جہاں را نہ مانند بی کر خدا — یکی می رود دیگر آمد بجا[2]

شاہ آفریں کے شاگرد حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ شاہ آفریں نقاد معنی تھے یہی وجہ ہے کہ ان کے اشعار نہایت بامعنی ہیں۔ ذیل میں چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

آفریں در ترک دنیا ایں قدر تاخیر چیست
جنبش یک آستیں پای بیش نیست

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۷۱، ۲۷۹ [2] مردم دیدہ ص ۲۲
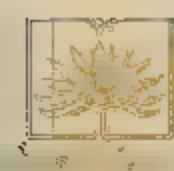
یار ساقی بزم خالی از رقیب ‏ ‏ ‏ ‏ ہر چہ باد اباد می خواہد دلم
صورت دیوار ہم ہشیار ہم ‏ ‏ ‏ ‏ من ہماں مست الست ام آفریں
خط را تراش کم نخواہد گشتن ‏ ‏ ‏ ‏ ایں سبزہ زآب تیغ می بالد بیش[1]

قدرت اللہ[2] کا بیان ہے کہ شاہ آفریں کی طبیعت میں متانت تھی جس کی جھلک ان کے اشعار میں ملتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک سنجیدہ اور متین آدمی تجربہ کی با[تیں] کرتا ہے اور ایک مشتعل طبیعت کا انسان بے معنی باتیں بک جاتا ہے۔ سنجیدگی اور متانت، وہ صفت ہے جو ہر شخص میں نہیں پائی جاتی ہے بہت سے لوگ ذرا سی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور سوئی کو بھالا بنا دیتے ہیں۔

شیخ سعدی نے کتنا صحیح کہا ہے کہ طاقتور وہ نہیں ہے جو پہلوان ہے بلکہ طاقتور وہ ہے جس کا غصہ پر قبضہ ہے۔ شاہ آفریں چونکہ نہایت سنجیدہ اور متین طبیعت کے انسان تھے اس لئے انھوں نے معنی کو اپنے اشعار میں نہایت سنجیدہ طور پر پیش کیا ہے تاکہ لوگ سوچ سمجھ کر اس پر عمل کریں اس اعتبار سے وہ صرف ایک شاعر ہی نہیں بلکہ ایک بہت بڑے مبلغ بھی تھے۔

جو لوگ نسب پر فخر کرتے ہیں ان کو تنبیہہ کی ہے اور جوہر ذاتی پیدا کرنے کی دعوت دی ہے۔

شو سرفراز جوہر ذاتی بہ رنگ تیغ ‏ ‏ ‏ ‏ زاں ابلہاں مباش کہ فخر از نسب کنند[4]
بہ مردن ہم نمیرد آتش سوز دل عاشق ‏ ‏ ‏ ‏ گلی کز خاک مشتاقان دمد بوی کباب آید
از بد معاش مردم ایں دہر آفریں[5] ‏ ‏ ‏ ‏ خوب است گر کنارہ گرفتی کنارہ تر[6]
آفریں کیست کہ شیریں شمرد تلخی مرگ ‏ ‏ ‏ ‏ کوہ کن خاک شد و تیشہ مہیا است ہنوز[7]

---

[1] مردم دیدہ ص ۲۵، ۲۳ [2] نتائج الافکار ص۸ [4-7] دیوان شاہ آفریں نسخہ لندن

منت کش دنیا نشود ہمت مردان[1] جز عبرت دل زانچہ ضرور است تو کم گیر

شاہ آفریں کے متعلق قدرت اللہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ نغز گو تھے نغز گوئی میں خواجہ حافظ، شیخ سعدی، مرزا صائب اور امیر خسرو عالمگیر شہرت کے مالک ہیں۔ شاہ آفریں کو بھی قدرت نے اس وصف کی نوازا تھا اس کے دیوان میں بیشمار ایسے اشعار ہیں جو نغز گوئی کے بے شواہد ہیں وہ نغز گو اور پر مغز گو بھی تھے جیسا کہ ان کے اشعار سے ثابت ہوتا ہے ذیل میں چند شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

دل را زگرد کینہ نشو ور نہ عاقبت	ہر کہ کند غبار مکدر کند ترا
آں رخ را بہ دام نیاوردی آفریں	مجنوں شدی و دام نہ کردی غزالہ را
آہ مظلوماں اثر دارد اثر ہشیار باش	نیست بے تعبیر ظالم خواب ایں افسانہا
پر نیش بغض و مار حسد تیرہ کلبہ ایست	در محفلی کہ صدق و صفا نیست جا مکن
بہ خون کوہ کن پرویز شیریں می کند کاری	مروت در مزاج زال دنیا نیست باور کن[2]

اس عصر کے قادر الکلام شاعر ناصر علی گرچہ شاہ آفریں سے عمر میں بہت بڑے تھے لیکن انھوں نے ان سے ملاقات کی تھی۔ شاہ آفریں اس وقت صغر سنی میں تھے ناصر علی کے والد بزرگوار بھی ان کے ساتھ تھے ناصر علی نے اپنی مثنوی تبرکاً شاہ آفریں کو عنایت کی تھی اور یہ بات کہی تھی کہ جب ان کی چشم ہوش کھل جائے اس وقت اس کا مطالعہ کریں۔ شاہ آفریں ایک قادر الکلام شاعر تھے۔ جس مضمون کو بھی انھوں نے باندھا ہے اسے نہایت اچھے ڈھنگ سے پیش کیا ہے ذیل میں شاہ آفریں کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں جن سے ان کی قادر الکلامی کا پتہ چلتا ہے۔

---

[1] دیوان شاہ آفریں نسخہ لندن [2] نتائج الافکار ص ۹

نے ذیل کا شعر پڑھا۔

آفریں تا دل ما گرد تعلق افشاند مشت خاکی بہ سر مردم دنیا کردیم

نواب حفظ اللہ خاں کو یہ شعر اچھا نہیں لگا اور انھوں نے کہا۔

"شما نیز داخل دنیا بودہ اید[۱]"

شاہ آفریں نے جواب دیا۔

"گفتم ہر گاہ دل ما گرد تعلق افشاند از دنیا بر آمدیم[۲]"

نواب حفظ اللہ خاں ان کا جواب سن کر چپ ہو گئے۔ اس واقعہ سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ شاہ آفریں نے نواب حفظ اللہ خاں جیسے نقاد سخن کو بھی اپنی باتوں سے خاموش کر دیا اور نواب مذکور دوبارہ یہ ہمت نہ ہوئی کہ وہ شاہ آفریں سے کچھ اور پوچھتا۔ اس سے بھی واضح ہوتا ہے کہ نواب مذکور شاہ آفریں کے شاعرانہ کمالات سے پہلے ہی سے متاثر تھا کیونکہ لاہور میں ان کی شخصیت استاد وقت کی سی تھی۔

ایک روز میر محمد زماں راسخ بھی کہیں موجود تھے اور مجلس سخن گرم تھی۔ بعض لوگوں کو راسخ کے ذیل کے شعر پر اعتراض تھا۔

جامۂ صبر بہ بالای جنوں تنگ آمد آں چہ از دست بر آمد بہ گریباں کردیم

شاہ آفریں نے فوراً ہاتفی کا ذیل کا شعر پڑھا جو تیمور نامہ میں ہے اور لوگ سن کر خاموش ہو گئے۔

نہ ہندو عناں تافت از راہ جنگ نہ بر قامت ترک شد جامہ تنگ

شاہ آفریں کی شاعری کا شہرہ شہر لاہور کی ہر مجلس میں تھا۔ ایک روز عبد اللطیف خاں کی مجلس میں بھی انھوں نے اپنے کچھ اشعار پڑھے تھے اور سامعین نے بڑی تحسین

۱،۲ مردم دیدہ ص ۱۹ ۳ مردم دیدہ ص ۱۹

کی تھی۔

حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ مسجد وزیر خاں لاہور کے صحن میں کبھی کبھی مشاعرہ ہوتا تھا اور بڑے بڑے شعرا وہاں محفل آرا ہوتے تھے۔ ایک روز ملا محمد سعید اعجاز نے ناصر علی کے ذیل کے شعر پر اعتراض کیا۔

"ہرگاہ صریر خامہ کہ عاشق از راہ دور و دراز مکتوب می نویسد بہ تبعش نمی سازد صدای، در بدن نامہ کہ شورخ تر از صریر خامہ است چہ قسم بہ او ساخت"

شاہ آفریں نے جواب دیا۔

"صریر خامہ خود معشوق است کہ دماغ نوشتن نہ دارد"

اب ذیل میں وہ شعر ملاحظہ ہو جس پر اعجاز نے اعتراض کیا تھا۔

صریر خامہ می دانم کہ با طبیعت نمی سازد
دریدی نامۂ دل صد پارہ شد قاصد رسید ایں جا

حاکم لاہوری نے مذکورہ بالا واقعہ کو اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ ملا محمد سعید اعجاز شاہ آفریں کا جواب سنکر خاموش ہو گئے۔ اس کا یہ مطلب ہے کہ انھوں نے یہ تسلیم کر لیا کہ شاہ آفریں کا جواب صحیح ہے۔ حاکم لاہوری کی ملاقات جب آزاد بلگرامی سے ہوئی تو اس نے اس واقعہ کو ان سے کہا اور ان کی رائے طلب کی۔ آزاد بلگرامی نے جواب دیا کہ شاہ آفریں کا جواب اپنی جگہ پر مسلم ہے لیکن میرے خیال میں یہ بھی آتا ہے۔

نامہ نوشتن عاشق مخالف طبع معشوق است و دریدن او
نامۂ عاشق را موافق طبع۔ لہذا صریر خامۂ عاشق با طبعش نہ ساخت"

۲ے مردم دیدہ ص ۲۰، ۲۱

وصدای دریدن نامہ ساخت[51]۔

حاکم لاہوری[52] نے اپنے تذکرہ میں اپنے استاد شاہ آفریں سے متعلق ایک اور واقعہ بیان کیا ہے کہ ایک روز عہد عالمگیری میں شاہ آفریں شالامار باغ لاہور میں ایک محفل میں تھے اور سید محمد برق بھی موجود تھا۔ برق شاہ آفریں سے بہت بے تکلف تھا اس لئے انھوں نے شاہ آفریں کا ہاتھ پکڑا اور دوڑنا شروع کیا۔ شاہ آفریں نے فوراً مرزا صائب کا یہ شعر پڑھا۔

ای برق بی مروت یارا شمردہ بگذار ۔۔۔ ہر خار این بیابان رزق برہنہ پائیست

حاضرین فی البدیہہ یہ شعر سن کر بہت خوش ہوئے۔ واہ واہ کیا اور برق خاموش ہوگیا شاہ آفریں نے صائب کے مندرجہ بالا شعر کے جواب میں بھی شعر کہا ہے جسے ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے۔

قانون نو از وحدت و سازہر نوائیست ۔۔۔ بیگانہ ہر کہ بینی در پردہ آشنائیست

شاہ آفریں نے ذیل کے اشعار میں خود دنیائے شاعری میں اپنا مقام بتایا ہے وہ گلشن ہند کے رنگین نوا بلبل تھے اور صائب اصفہان کے شیریں سخنور تھے۔

مفم از گلشن ہند آفریں رنگیں نوا بلبل ۔۔۔ اگر شد صائب شیریں سخن از اصفہان پیدا

شاہ آفریں کے کلام کا ہر مصرع معنی شیریں کا نیشکر ہے۔[53]

خیال لعل نوشینی کہ دارد آفریں در دل ۔۔۔ کہ ہر مصراعش از معنی شیریں نیشکر باشد

ہر شخص اپنی صلاحیت کے مطابق شعر کہتا ہے لے آفریں ہمارے اشعار بیجا نہیں ہیں اگر قابل تحسین نہیں ہیں۔

خوب می گوید بقدر فہم ہر کس آفریں ۔۔۔ نیست بیجا شعر ما گر قابل تحسین نہ شد[54]

---

۵۱ مردم دیدہ ص ۲۱، ۲۲ ۔ ۵۲ تا ۵۴ دیوان شاہ آفریں ورق ۳۲، ۹۲

خواجہ حافظ شیرازی سے آفریں کو بہت عقیدت تھی۔

آفریں نیست کم از عیسیٰ جاں بخش مرا ہر کہ با من سخن از حافظ شیراز کند [۱]

شاہ آفریں کے دل سے ہزاروں برجستہ مصرعے تیر کی طرح نکلتے تھے۔

ہزاراں مصرعۂ برجستہ ام چوں تیر پیدا شد [۲]

شاہ آفریں کا قلم اہل حشر سے فریاد کرتا تھا وہ دنیائے شاعری کے کبک تھے اور بعض کوے بھی ان کو اپنی مانند سمجھتے تھے۔

کنند اہل حشر کلکم آفریں فریاد فغاں زاغ باین کبک ہم نشین شد [۳]

شاہ آفریں کے اشعار برجستہ معانی سے پر ہیں اور مانند شرر انکے کان میں آتے تھے۔

زہر مصرع چو برقم آفریں از فیض سوز دل دو صد برجستہ معنی ہمچوں شرر در گوش می آید [۴]

شاہ آفریں اہل سخن کے فیض سے سخنور ہے۔

ز فیض اہل سخن آفریں سخنور شد طفیل خامہ شود حرف آشنا کاغذ [۵]

شاہ آفریں ہی نے اس سبک شاعری کو اختیار نہیں کیا بلکہ میرزا صائب اور بیدل بھی اسی سبک کے پیرو تھے۔

ہمچناں سودای دارد نہ تنہا آفریں صائب و بیدل بود از جاں خریدار شہ نوز [۶]

شاہ آفریں اپنے قلم سے موتیاں لٹاتے تھے یہ ان کی بلند طبیعت کا فیض ہے۔

ز فیض طبع بلند آفریں دریا جاش زبسکہ خامہ گہری کند نثار امروز [۷]

شاہ آفریں کے کلام کو محقق ہی سمجھ سکتے ہیں وہ خصوص عشق، لمعات شوق اور گلشن راز تھے۔

۱، ۲، ۳، ۴، ۵، ۶، ۷ دیوان شاہ آفریں ورق ۹۳، ۹۷، ۱۲۵، ۱۲۶، ۱۲۱، ۱۴۶، ۱۵۰

بجز فکر محقق کسی نمی فہمد کلامم را
خصوص عشقم و لمعات شوقم گلشن رازم[1]

شاہ آفریں نے دعویٰ کیا ہے کہ قدرت نے ان کو شیراز کی وہ شراب عشق پلایا تھا جس کو شیخ سعدی اور خواجہ حافظ نے نوش کیا تھا۔

مارا چو آفریں می شیراز دادہ اند
ای بی خبر ز لذت شرب مدام ما[2]

شاہ آفریں کے شاگرد ملا نقو فصاحت نے شاہ آفریں کی تعریف اس طرح کی ہے۔

کردم فراموش از دل شعر اسیر و صائب[3]
تا خواندہ ام فصاحت دیوان آفریں را

[1,2] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۹۷ [3] مردم دیدہ ص ۱۷۹

شاہ آفریں بحیثیت قصیدہ نگار

شاہ آفریں لاہوری کے دیوان میں صرف ایک قصیدہ ہے جو حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں عرفی کے تتبع میں ہے نعت گوئی میں عرفی شیرازی کا مقام بہت بلند ہے اس نے قصیدوں کو غزل کی زبان دی ہے۔ چونکہ اہل زبان تھا اس لئے خوب خوب قصیدے کہے ہیں۔

قصیدہ وہ صنف شاعری ہے جس سے شعراء کو انعام واکرام کی امید ہوتی ہے۔ عرب کی شاعری مدحیہ قصیدوں پر تھی۔ ایران کے شعراء نے بھی شعرائے عرب کی پیروی کی۔ قصیدہ کے چار عنصر ہیں اول تشبیب دوم گریز سوم مدح اور چہارم دعا۔

فارسی زبان میں رودکی، انوری، عنصری، منوچہری، فاریابی، کمال الدین اسمٰعیل، خاقانی، عرفی اور قاآنی مشہور قصیدہ گو شعراء گذرے ہیں۔

مولانا شبلی نے قصیدہ گوئی کے لیے تین شرط رکھی ہے۔ اول یہ کہ جس کی مدح کیجائے وہ واقعی اس کے لائق ہو دوم یہ کہ مدح میں جو کچھ بیان کیا جائے وہ سچائی پر مبنی ہو اور سوم یہ کہ اوصاف ممدوح اس طرح بیان ہوں کہ قاری کے جذبات متحرک ہوں۔ مگر جائے افسوس ہے کہ فارسی قصیدوں میں بیشتر مبالغہ سے کام لیا گیا ہے۔ ہر ممدوح کی مدح میں کم وبیش مبالغہ آرائی ہوئی ہے لیکن عربی قصائد

بیجا مبالغہ سے پاک ہیں۔ حکیم سنائی، اوحدی، شیخ سعدی، امیر خسرو، خاقانی، اور مولانا جامی نے فارسی قصیدوں میں حکمت، اور پند و نصیحت کے مضامین لکھے ہیں۔ شیخ سعدی نے شیراز کے گورنر انکیانو کی مدح میں قصیدہ کہا لیکن بیجا مدح سے دور رہے اور جگہ جگہ پند و نصیحت کی ہے شاہ آفریں لاہوری نے بھی اپنے قصیدہ میں فقط پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کی ہے ان کے تعلقات گرچہ نواب عبدالصمد خاں بہادر صوبہ دار لاہور سے تھے اور ایک روپیہ یومیہ وظیفہ بھی ان کی طرف سے ان کو ملتا تھا۔ لیکن انھوں نے ان کی مدح میں ایک، قصیدہ بھی نہیں کہا۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ وہ ایک مرد عارف اور باکمال صوفی تھے۔ ان کو نہ مال و زر کی خواہش تھی اور نہ شہرت کی تمنا تھی۔ ایسی حالت میں وہ کیوں کسی کی مدح میں قصیدہ لکھتے ان کے ذیل کے شعر سے واضح ہوتا ہے کہ ان کی پرورش تسلیم و رضا کے ماحول میں ہوئی تھی۔

به نعمت ہای تسلیم و رضا پرورده ام خود را
بکامم آفریں شربت شود گر زہر ناب آید[1]

شاہ آفریں کے اس نعتیہ قصیدہ کا مطلع یہ ہے۔

غزال طبع من آنجا کہ وحشت آغاز د
بہ اولیں قدم آں سوز لامکاں تاز د

اس قصیدہ کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زہی عروس تحیر نقاب حجلہ خیال
زہی بجلوہ خورش آئنہ تراز نسیم شمال

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۳۴

بخاک هند و بشیرین کلامی خسرو
بحسن شاهد پنجاب کش منم کمال

در آورد آز ره عاشقانه در آ
بمدح حضرت معشوق ایزد متعال

محمد عربی شاه انبیا لشکر
ازل غلام ابد بنده لامکان کشور

زهی بعون تو قصر شکسته دل معمور
ز پاسبانی عدل تو ملک جان معمور

دوات نافه شود خامه شاخ گل گردد
ز حرف خلق تو کرشمه کنم مسطور

ز حرص مدح تو با مصطفی آنچه از ره شعر
کنم ز عرفی شیرازی نغمه مطلعی مذکور

زهی لوای نبوت ز نسبت منصور
مزاج عشق ز آمیزش دلت رنجور

گل خیال جمال تو چون نسیم برد
بگلشنی که بود همت خیال یک خونشا

خیال تیغ تو ناکرده خون فکر چکید
چنانکه گشت قلم رشته ریشه سودا

زهی ز نسبت مدح تو شان فکر بلند
زهی ثنای تو بیرون ز طاقت ادراک

نهی ... بگل مدحت نسیم خیال
ازان چو غنچه و سوسن ببند زبان ادا

زهی مزاج تو فهرست نسخهٔ تقدیر
حدیث جاه ترا تنگ عرصهٔ تقریر

چه قدر مدح قدر تو گویم که هیچ نتوان گفت
ز آیتی که بود چار مصحفش تفسیر

سخن بمدح تو گفتن نه حد انسان است
وگرنه شوخی طبعم نمی کند تقصیر

زهی به وصف تو از دست هوش رفته عنان
خیال مست و سراسیمه عقل و دل حیران

همین نه من به ثنای تو عاجزم عاجز
که سر بجیب حیا ماند هیچو من حسان[1]

زهی غبار حریم تو صندل سر عشق
خیال طوف جناب تو در دو دادرسان

باین هوس که مگر لشکند دل غمگین
کنم بخون جگر شاخ نالهٔ رنگین

زمین دعا و روا اجابت ز ایزد متعال
زمین دعا ز ارباب آسمان آمین

---

[1] مراد حسان العجم خاقانی ہے

سر نیاز من و خاک پای آں تو باد — دو کون حلقہ بگوش تو و بلالؓ تو باد

شاہ آفریں کا یہ قصیدہ نعت میں کل ۷۸ اشعار پر مشتمل ہے اور اختتام ذیل کے شعر پر ہوا ہے۔

سر نیاز من و خاک پای آں تو باد — دو کون حلقہ بگوش تو و بلالؓ تو باد

شاہ آفریں کا گرچہ ایک ہی قصیدہ ان کے دیوان میں ہے لیکن بہت خوب ہے۔ اس قصیدہ میں ان کے شاعرانہ محاسن درجۂ کمال پر نظر آتے ہیں الفاظ کی نئی نئی ترکیبیں نئی تشبیہات و استعارات مضمون آفرینی، نازک خیالی، جدت ادا اور ان کی فطری عاجزی و انکساری نے اس قصیدہ کو یہ مقام بخشا ہے کہ اس کا مقابلہ عرفی کے اس نعتیہ قصیدہ سے کیا جا سکتا ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

سپیدہ دم چو زدم آستیں بہ شمع شعور — شنیدم آیت استغنی از عالم نور[۲]

جس طرح عرفی شیرازی نے اپنے مندرجہ بالا قصیدہ کو کئی ردیف میں لکھا ہے اسی طرح شاہ آفریں نے بھی اپنے متذکرہ بالا نعتیہ قصیدہ کو چار ردیفوں میں پورا کیا ہے دوسری ردیف میں جو اشعار کہے ہیں اس میں عرفی کو خوش نغمہ کہا ہے اور اس کے ایک شعر کو بھی قابند کیا ہے جیسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

زحرص مدح تو با مصطفیٰ نہ از رہ شعر — کنم ز عرفی خوش نغمہ مطلعی مذکور

زہی لوائی نبوت ز نسبت منصور — مزاج عشق ز آمیزش دلت رنجور[۳]

شاہ آفریں گرچہ ایک غزل گو شاعر تھے لیکن قصیدہ گوئی کی ساری صلاحیتیں ان میں موجود تھیں۔ مگر انھوں نے قصیدہ گوئی کو اپنا شعار نہیں بنایا کیونکہ قصیدہ گوئی کے لئے کسی ممدوح کی ضرورت ہوتی ہے اور وہ کسی کی بیجا مدح کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔

---

[۱] دیوان شاہ آفریں ورق ۸ ۲۰۸-۱ ۷ [۲] تعداد عرفی [۳] دیوان شاہ آفریں ۲۶۹

شاہ آفریں بحیثیت رباعی گو

شاہ آفریں ایک کامیاب رباعی گو شاعر بھی تھے اقسام شاعری میں بھی ایک بلند مقام کی حامل ہے رباعیوں میں بہت کشش پائی جاتی ہے اور معنی سے لبریز ہوتی ہیں۔ شاہ آفریں کے عہد میں رباعی گوئی کا رواج تقریباً متروک ہو گیا تھا اس لیے انھوں نے اس فن کی طرف زیادہ دھیان نہیں دیا ورنہ وہ رباعی گوئی میں بھی بڑی شہرت کے حامل ہو سکتے تھے ان کے دیوان میں کل چودہ رباعیاں ہیں گویا کہ نہیں کے برابر ہیں مگر ان میں سے ہر ایک رباعی زندگی سے لبریز ہے۔

فارسی شاعری کے میدان میں سب سے عظیم رباعی گو عمر خیام تھے گرچہ مختلف مطبوعہ نسخوں میں ۷۷۲ رباعیوں کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے مگر ایران میں جو جدید تحقیقات ہوئے ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ ان کی رباعیوں کی تعداد بہت کم ہے اور دیگر سخنوروں کی رباعیاں ان کے نام سے شہرت پا گئی ہیں۔ رباعی گوئی کی دنیا میں باباطاہر عریاںؔ اور بابا افضل کوہیؔ عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ لیکن عمر خیام کو ان کی رباعیوں کی وجہ سے جو شہرت ملی وہ کسی دوسرے رباعی گو شاعر کو آج تک نہ مل سکی۔ ان کی رباعیوں کا ترجمہ دنیا کی مختلف زبان میں کیا گیا ہے ان کے بعد رباعی گوئی کے میدان میں باباطاہر عریاںؔ اور بابا افضل کوہیؔ کے نام آتے ہیں ایک اور شاعر سحابی استرآبادی تھے جنھوں نے تقریباً سترہ ہزار رباعیاں کہی تھیں۔ مولانا شبلی کے ذاتی کتبخانہ میں سحابی استرآبادی کی رباعیات کا ایک نسخہ تھا جس میں سات ہزار رباعیاں تھیں[1]۔

---

[1] شعر العجم جلد سوم

شاہ آفریں کی رباعیاں گرچہ بہت کم ہیں لیکن فنی اور معنوی اعتبار سے ان رباعیوں کا مقابلہ کسی بھی باکمال رباعی گو شاعر کی رباعیوں سے کیا جاسکتا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ شاہ آفریں اس فن میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ انھوں نے اپنی رباعیوں میں زیادہ تر پند و نصیحت کی ہے۔

انسان کو حسن و جمال پر غرور نہیں کرنا چاہیئے کیونکہ ایک دن یہ برباد ہو جائے گا اور اسی کی وجہ سے کل محشر کے دن انسان کو ذلت اور رسوائی ہوگی، اسی خیال کو انھوں نے اپنی ذیل کی رباعی میں پیش کیا ہے۔

تاکی بہ غرور حسن باشی خودکام | ای تیرہ شب فراق راماہ تمام [1]
فرداست کہ ہر کز سیہ روئی ترا | آن دشمن خانگی کہ خط دارد نام

اللہ تعالیٰ رزاق ہے اور وہ ہر انسان کو ضروریات زندگی سے نوازتا ہے۔

گر زندہ ای تو گندم است روزی بخشند | اسباب معاش از نہ لزی بخشند
ای گویہ پوست کندہ در خویش ببین | ہر سال ترا قبای لو می بخشند [2]

اے لوگو حیات دنیا پہ مغرور مت ہو جاؤ کل موت لازم ہے اور قیامت در پیش ہے۔

غافل منشین علامتی در پیش است | دل خوش نہ کنی علامتی در پیش است
مغرور حیات و خانہ و جاہ مباش | مرگی کو ری قیامتی در پیش است [3]

راہ عشق بہت باریک ہے اور کوئی نزدیک تر راہ نہیں ہے جس سے انسان کامیاب ہو جائے عشق الہی میں بیخود ہو جانا ہی قرب الہی ہے۔

گویند کہ راہ عشق بس باریک است | این بادیہ تا تو با خودی تاریک است

۱۔۲۔۳ دیوان شاہ آفریں ورق ۲۷۶

نزدیک تر از تو نیست راہی دیگر   بیخود شو و با خود آ کہ حق نزدیک ست [۱]

شاہ آفریں نے ان مندرجہ بالا رباعیوں میں ہم لوگوں کو بیش بہا پند و نصیحت کی ہے۔

ترجیع بند :- یہ بھی فارسی شاعری میں ایک خاص صنف ہے نامور فارسی شعرا نے ترجیع بند کہے ہیں ان میں فرخی، مولانا جامی، اور خواجہ حافظ شیرازی کے نام سر فہرست ہیں۔ ڈاکٹر زہرا خانلری نے ترجیع بند کی وضاحت اسطرح کی ہے۔

"مجموع چند رشتہ شعر است کہ ہر رشتہ داری یک وزن و یک
قافیہ باشد و در آخر ہر رشتہ بیتی با قافیہ جداگانہ مکرر می شود و این
بیت ترجیع یا برگردان ست [۲]"

ترکیب بند اور ترجیع بند کے درمیان یہی فرق ہے کہ ترکیب بند وہ ہے جس میں ہر گرہ بار بار لوٹائی نہیں جاتے اور ترجیع بند وہ ہے کہ جس کے ہر بند میں بار بار وہی گرہ لگائی جاتے جو پہلی بند میں آئے۔ شاہ آفریں کے دیوان میں شہدائے کربلا کی مدح میں ایک طویل ترجیع بند ہے۔ جس میں کل ایک سو اڑسٹھ [۱۶۸] اشعار ہیں۔ ابتداء اس ترجیع بند کی ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

دل می طپد بریاد شہیدان کربلا   جانم فدای ہمت مردان کربلا [۳]

اور اختتام ذیل کے شعر پر ہوا ہے۔

زین پیش ناشناشکن غصہ بود دل   کار جگر گرفتہ دبدنام آفریں [۴]

خواجہ حافظ کے دیوان میں صرف ایک ہی ترجیع بند ہے۔ شاہ آفریں کے دیوان میں بھی ایک ہی ترجیع بند ہے لیکن بہت طویل اور ۱۶ صفحات پر مشتمل ہے

۱، ۳، ۴ دیوان شاہ آفریں ورق ۲۶۷، ۲۷۱، ۲۷۹   ۲ احوال و افکار و آثار عماد الملک ص ۲۰۱

یہ ہماری ترجیع بند سرچاروں صفحات پر مشتمل ہے۔ ذیل میں شاہ آفریں کی ترجیع بند کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔[1]

جائی کہ ہست آل محمدؐ فرشتہ کیست	از عرشش ہم بلند بود شان کربلا
با سرزمین مکہ نہ داد ند این شرف	سازند سبحہ خاک شہیدان کربلا
ماہ محرم است ز عیش احتراز کن	مجلس بہ نوحہ گرم کن و نالہ ساز کن
فریاد عالمی بہ خروش است و من خموش	در این چنین مصیبت عظمیٰ چرا چرا
از حرف ماجرای حسینؓ و غم حسنؓ	چون زخم تازہ چشمہ خون می شود دہن
با چشم تر مباش کہ ماہ محرم است	تا چون حباب در گرہت نقدی از دم است
در سینہ دل نہ ماند کہ آہی تواں کشید	ممنون مرا کسی کہ بجاں کرد نالہ است

اور اس ترکیب بند میں بار بار ذیل کی گرہ ہر سات شعر کے بعد لگائی گئی ہے۔

دل سوخت در ہوای حسینؓ و حسنؓ مرا	جاں نیز از برای حسینؓ و حسنؓ مرا

پروفیسر براؤن نے اپنی کتاب میں ہاتف اصفہانی کے ایک ترجیع بند کی بیحد تعریف کی ہے ہاتف کا پورا نام مرزا ابوعلی تھا۔ شجاع الدولہ کے دربار سے ہاتف کو پندرہ روپیہ سالانہ کی تنخواہ ملتی تھی۔ ہاتف کم سنی ہی میں اصفہان سے ہندوستان آیا تھا پروفیسر براؤن رقمطراز ہے کہ ہاتف کو اس کی ترجیع بند نے غیر فانی بنا دیا۔ ذیل میں ہاتف کے اس ترجیع بند کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں تاکہ قارئین اس کا مقابلہ شاہ آفریں کے ترجیع بند سے کر سکیں۔[2]

ای فدای تو ہم دل و ہم جان	وی نثار رہت ہم این و ہم آن
دل فدای تو چوں توئی دلبر	جان نثار تو چوں توئی جاناں

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۱۷۷ ۔ ۱۷۹
[2] A. Literary history of Persia p. ۲۸۴ vol. IV

داد رہا ندان دست تو مشکل — جان فشاندن بہ پای تو آسان

راہ وصل تو راہ پر آسیب — درد عشق تو درد بی درمان

راقم حروف کی رائے ہے کہ شاہ آفریں کو ترجیع بند کے فن میں بھی کمال حاصل تھا کیونکہ سولہ[16] صفحات پر مشتمل کسی فارسی شاعر کا ترجیع بند اب تک راقم حروف کی نظر سے نہیں گزرا ہے جیسا کہ قبل ذکر کیا گیا کہ حافظ شیرازی کا ترجیع بند بہت خوب ہے لیکن کل چار ہی صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حافظ شیرازی کا ترجیع بند شاہ آفریں سے کمتر ہے بلکہ راقم حروف کا مقصد یہ ہے کہ شاہ آفریں اپنے معاصرین میں ترجیع بند کے نظم کرنے میں مہارت رکھتے تھے۔ خواجہ حافظ کا مقابلہ شاہ آفریں سے نہیں کیا جا سکتا کیونکہ خود شاہ آفریں نے اپنے اشعار میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ خواجہ حافظ کا کلام ان کے لئے اعجاز عیسوی ہے لیکن انھوں نے اپنے ذیل کے شعر میں یہ بات کہی ہے کہ قدرت نے ان کو بھی شراب شیراز پلایا تھا اس لیے ان کے کلام میں بھی وہی مستی ہے جو قدرت نے حافظ شیرازی اور شیخ سعدی شیرازی کو بخشا تھا۔

ما را چو آفریں مئی شیراز دادہ اند — ای بی خبر ز لذت شرب مدام ما[1]

آفریں نیست کم از عیسی ما بخش مرا — ہر کہ با من سخن از حافظ شیراز کند[2]

مخمس:- فارسی شاعری میں مخمس بھی ایک صنف شاعری ہے شاہ آفریں کے دیوان میں بارہ[12] مخمس ہیں۔ ان کو مخمس گوئی میں بھی کمال حاصل تھا اور انھوں نے یہ مخمس فارسی کے نامور شعراء حافظ، سعدی، اور امیر خسرو کے تتبع میں کہا ہے اس میں شبہہ نہیں کہ وہ ایک قادر الکلام شاعر تھے لیکن بیشتر اشعار [illegible]

[1،2] دیوان شاہ آفریں ورق ۸، ۹۷

شاعری سے بے خبر ہیں۔ شاہ آفریں کے پہلے مخمس میں مرزا عاصی کو بھی یاد کیا گیا ہے۔ کیونکہ یہ انھیں کے رنگ میں ہے اس مخمس کی ابتدا ذیل کے شعر سے ہوتی ہے۔

یہ قربان نسیم جلوہ ہای آشنا کردم | ہماں بیتاب مجنونم اگر بی دست و پا کردم

اس مخمس کا پانچواں مصرع یہ ہے۔

نیم نکہت کہ از گل در پریشانی جدا کردم [1]

دوسرا مخمس شاہ آفریں کا ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے۔

تماشا مصد چمن نشو و نما داشت | ز مژگاں نہا نگہ دست دعا داشت

اور پانچواں مصرع یہ ہے۔

کہ ہر برگش بہار رو نما داشت

تیسرا مخمس امیر خسرو کی ایک مشہور غزل کے جواب میں ہے جو نعت مصطفیٰ [2] میں ہے پہلا شعر ملاحظہ ہو۔

ای شوخی مژگاں تو سرمایۂ افسونگری | وا کردہ چشمت از نگہ طومار سحر سامری

اور پانچواں مصرع یہ ہے:

ہر چند وصفت می کنم در حسن ازاں زیباتری

چوتھا مخمس شیخ سعدی کے رنگ میں ہے اور آغاز اس کا ذیل کے شعر سے ہوا ہے

ہوشم نبردہ از سر یک آرزو خیالی | دارم بہ نسبت خود از خویش ہم ملالی

اور پانچواں مصرع یہ ہے:

سعدی غزل نہ گوید جز ما چنیں غزالی

شاہ آفریں کا پانچواں مخمس صائب کے رنگ میں ہے آغاز ذیل کے شعر سے

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۵۶

ہوا ہے۔

جنون فرمای من صبحی نیامد در گلستانی نہ شد گاہی چراغ افروز عیشم در شبستانی

اور پانچواں مصرع یہ ہے۔

قیامت، قانعی زنّار زیبی نا مسلمانی

ذیل کے شعر میں مرزا صائب کو یاد کیا ہے:

بہ آفریں تو باشد نیاز من صائب میان اہل سخن امتیاز من صائب

ساتواں مخمس ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے:

تہی شوقی ز درد افسردہ ام یارب میسّر کن فضای سینہ آتش جوش چوں صحرای محشر کن

پانچواں مصرع یہ ہے:

چو آزاداں بساماں توکل دل تونگر کن

آٹھواں مخمس ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے:

عشقم بصد تماشا شوقم بہ صد مدارا دستی کجا کہ گیرم صبر گریز پا را

پانچواں مصرع یہ ہے:

دردا کہ راز پنہاں خواہد شد آشکارا

یہ مخمس حافظ کی مشہور غزل کے جواب میں ہے:

نواں مخمس ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے:

چند در آرزوی وصل سجدہ کنم خدای را قبلہ نمای دل کنم یاد تو بی وفائی را

پانچواں مصرع یہ ہے:

بر سر دوش سر دہی گریہ ہای ہای را

دسواں مخمس ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے:

آں قدر غم نیست تا یزاں بہ فریادم رسد با نسیم عشوۂ صہبا بہ فریادم رسد

پانچواں مصرع یہ ہے:

آہ صبح وگریۂ شبہا بہ فسریادم رسد

گیارھواں مخمس شاہ آفریں کا ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے:

دلی لبریز داغ وسینہ صد چاک از ہوس دارم

بسودای تو چو طاؤس گلشن در قفس دارم

پانچواں مصرع یہ ہے:

بہ ہر شاخی ترنجی آفتابی پیش رس دارم

بارھواں مخمس شاہ آفریں کا ذیل کے شعر سے شروع ہوا ہے:

حسن تو از نظارۂ ما کم نمی شود　　　قدر گل از نسیم صبا کم نمی شود

پانچواں مصرع یہ ہے:

بنمای رخ کہ از تو صفا کم نمی شود

شاہ آفریں کے سبھی مخمس درد اور سوز میں ڈوبے ہوئے ہیں خصوصاً ان کا بارھواں مخمس بڑا غمناک ہے گویا انھوں نے

کاغذ پہ رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

اس مخمس کا آخری شعر ملاحظہ ہو:

تا چند آہ آہ من خستہ بشنوی

روزی رسد کہ با من بی دل یکی شوی

☼

خوب می گوید بقدر فہم ہر کس آفریں
نیست بیجا شعر ما گر قابل تحسین نہ شد

(شاہ آفریں)

معاصرین

میر محمد علی افصح

محمد علی نام اور افصح تخلص تھا اس کے حالات تذکروں میں نہیں ملتے چونکہ حاکم لاہوری[1] کی ملاقات دو تین بار اس سے ہوئی تھی اس لیے اس نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کیا ورنہ افصح گمنام ہو جاتا۔ حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ افصح کا نسب نامہ مشہد کے رضوی سادات سے جا ملتا ہے اس کے والد سلطان شاہ میرزا عہد عالمگیری میں ہندوستان آئے تھے افصح کی والدہ، سربلند خاں میر بخشی کی بیٹی تھی افصح نے بعد میں لاہور میں سکونت اختیار کی تھی اور لاہور ہی میں حاکم لاہوری کی ملاقات اس سے ہوئی تھی ایک مدت کے بعد افصح دکن میں اقامت پذیر ہوا اور وہیں ہمت یار خاں اور وہ ۱۱۵۷ھ میں شہید ہوئے۔ شاہ آفریں نے اس کے ذیل کے اشعار پسند کیا تھا۔

نمک بوسہ بر آں رند قدح نوش حرام … کہ فراموش کند حق نمکداں ترا
نیست بیرایہ ہر تیرہ دروں جامۂ فقر … رسم آئینہ دلانست نمد نوشی ہا
شکر خدا کہ دیدۂ شاہد پرست من … ہر چند بت پرست بود خود پرست نیست
مرا کہ ابلق ایام زیر فرمانست … چہ غم کہ توسن گردوں ستارہ پیشانی است

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۵۰

بھگوان داس ہندی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے[1] کہ شاہ فصیح کا تخلص بھی افصح تھا لیکن اس کے آباؤ اجداد بخارا کے باشندہ تھے۔ اور وہ شاہ احسن اللہ کا مرید تھا ہندی کی ملاقات اس سے لکھنؤ میں ہوئی تھی اور اس نے لکھنؤ میں ایک تکیہ تعمیر کرایا تھا۔ اس نے تجرد کی زندگی گزاری تھی۔ ہندی نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذیل کا شعر نقل کیا ہے :

لالہ ساں ساغر داغ از غم یاری نزدیم
می خونابہ دل آبلہ داری نزدیم

صفدر جنگ

صفدر جنگ کا اصلی نام محمد مقیم تھا صفدر جنگ اس کا خطاب ہے وہ اودھ کا صوبہ دار اور ہندوستان کا وزیر اعظم بھی ہوا تذکروں سے پتہ چلتا ہے کہ سنہ ۱۱۷۳ھ میں بہ عہد محمد شاہی وہ صورت پہنچا ڈاکٹر آشیر وادی لال نے لکھا ہے کہ اس کی پیدائش کی صحیح تاریخ نہیں ملتی لیکن قیاس کیا جاتا ہے کہ ۱۷۰۸ء مطابق ۱۱۲۰ھ کی حدود میں ہوئی ہوگی برہان الملک سعادت علی خاں نیشا پوری اس کا ماموں تھا جو بعد میں خسر بھی بنا اسی نے اس کو نیشا پور سے ہندوستان بلایا تھا۔ اس سفر میں اس کے بڑے ماموں میر محمد باقر بھی اس کے ساتھ تھے۔ صفدر جنگ کے پدر بزرگوار کا اسم گرامی جعفر بیگ خاں تھا صفدر جنگ صرف چھ ماہ کا تھا کہ اس کی والدہ

---

[1] سفینۂ ہندی ورق ۱۷، ۱۸

نے رحلت کی اس کی ایک بہن نے اس کی پرورش کی صفدر جنگ نہایت مہذب، اور تربیت یافتہ تھا اس کے مکاتیب سے اس کی علمیت کا اندازہ ہوتا ہے برہان الملک نے اس کی مزید تربیت کی اور سلطنت داری کے گُر سکھائے وہ اس کو اپنی اولاد کی طرح سمجھتا تھا اس لیے اس نے اپنی دختر صدر النساء عرف نواب بیگم سے اس کی شادی کرادی وہ ہمیشہ اس کو اپنے ہمراہ رکھتا تھا نومبر ۱۷۲۵ء میں بھگونت سنگھ سے ایک لڑائی ہوئی تھی جس میں صفدر جنگ نے بھی ماموں کے ساتھ شرکت کی تھی برہان الملک نے ۱۹ مارچ ۱۷۳۹ء میں وفات پائی نثار محمد خاں شیر جنگ، برہان الملک کا بھتیجا اودھ کا صوبہ دار بننا چاہتا تھا لیکن صفدر جنگ کو اودھ کی صوبہ داری تفویض ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ برہان الملک نے اس کو اپنی حیات ہی میں اودھ کے نائب صوبہ دار کا عہدہ دیا تھا محمد شاہ نے صفدر جنگ کو ابوالمنصور خاں کا خطاب مرحمت کیا تھا برہان الملک نے اودھ کے خزانہ کو زر و جواہر سے بھر دیا تھا۔ صفدر جنگ نے اپنے ماموں کے جمع کیے ہوئے خزانہ سے نادر شاہ کو مبلغ دو کروڑ روپیے بطور پیشکش دیا تھا محمد شاہ رنگیلے نے بعد ازاں اس کو صفدر جنگ کے خطاب سے نوازا تھا۔

صفدر جنگ نہایت دانشمند اور ایک بڑا سیاست داں تھا اس نے اپنی حکمت عملی سے شیخ نصر اللہ، فرحت اللہ اور راجپوتوں کو شکست دیا تھا۔ ڈاکٹر آشیر وادی لال کا بیان ہے کہ صفدر جنگ پٹنہ آیا تھا اور بانکی پور میں ٹھہرا تھا اس کو میر آتش اور کشمیر کی صوبہ داری ۱۷۴۲ء میں ملی تھی ۱۱۴۴ھ میں اس کے بیٹا شجاع الدولہ کی ولادت ہوئی تھی جو اودھ کا تیسرا نواب ہوا صفدر جنگ نے اپنے اس بیٹا کی شادی میں چھیالیس لاکھ روپیہ خرچ کیا تھا[1] محمد شاہ اور

---

[1] تاریخ اودھ مرتب سید کمال الدین حیدر ص ۷۶

ارکان سلطنت بھی مدعو تھے۔ ایسی شان و شوکت کی شادی شاید ہی کسی شاہزادہ
کی ہوئی ہوگی۔ احمد شاہ نے صفدر جنگ کو منصب وزارت ۲۹ جون ۱۷۴۸ء میں
مرحمت کیا تھا علاوہ ازیں ہشت ہزاری کا عہدہ بھی بخشا تھا بعد ازاں جولائی ۱۷۴۸ء
میں اسے اجمیر کی صوبہ داری بھی ملی تھی احمد شاہ نے صفدر جنگ کو ۱۱۶۶ھ میں وزارت
سے برطرف کر دیا تھا۔ پھر انتظام الدولہ کو قلمدان وزارت مرحمت ہوا۔

صفدر جنگ کا خدوخال اچھا تھا۔ کشمیری وادی لال کا بیان ہے کہ اس کی ناک بڑی،
پیشانی کشادہ، آنکھیں روشن، رنگ چاندی کی طرح سفید اور داڑھی گھنی تھی۔
اس کی گفتگو میں نرمی تھی مگر وہ قصور واروں کو بڑی کڑی سزائیں دیتا تھا وہ علم و
ادب کا بھی سرپرست تھا اس کے زیر سایہ علماء اور دانشوروں کی کفالت ہوتی
تھی اس نے جن حضرات کو وظیفے دیئے تھے ان میں سے چند کے نام ذیل میں لکھے
جاتے ہیں۔ (۱) محمد حسن (۲) سید زین العابدین طباطبائی (۳) سید محمد علی اورنگ آبادی
(۴) میر غلام نبی بلگرامی (۵) مولوی فضل اللہ خاں (۶) مولوی حمداللہ خاں اور (۷) مرزا
علی نقی خاں وغیرہم نامور شاعر مرزا عظیما اکسیر وہ بڑی تعریف کرتا تھا اس نے
اس کو ایک گھوڑا طلائی ساز و سامان کے ساتھ اور پانچ ہزار روپئے بھی مرحمت کیا
تھا۔ عبدالرضا متین پر بھی اس کی نظر کرم تھی وہ مساکین اور غرباء کو نہایت فراخ
دلی سے دیتا تھا۔ وہ کسی بھی سائل کو پچاس اشرفی سے کم نہیں دیتا تھا وہ گرچہ صوبہ
دار تھا لیکن اس نے ایک ہی نکاح کیا تھا صاحب سیر المتاخرین کا بیان ہے کہ
بیس ہزار لشکر ہمیشہ لشکر گاہ میں تیار رہتے تھے اپنے لشکریوں کو بھی وہ بے
فراخ دلی سے رقومات دیتا تھا۔ جوگل کشور، مہاراج نول رائے، راجہ ناگرمل،
راجہ رام نرائن موزوں، اور راجہ لچھمی نرائن کو بھی اس نے مناصب لائقہ سے نوازا
تھا وہ نہایت باہوش وزیر تھا۔ مگر بہت سے ارکان سلطنت اس کے خلاف

ہو گئے تھے۔ احمد شاہ کو زیادہ عقل و فہم نہیں تھی اسلئے وہ عماد الملک، نظام کے فریب میں پھنس گیا تھا۔ جس کا نتیجہ بادشاہ احمد شاہ اور صفدر جنگ کی لڑائی میں نمودار ہوا مگر برے کام کا انجام برا ہی ہوتا ہے آخر کار عماد الملک کو بھی اپنی جان بچانی پڑی اور وزارت سے معزول ہوا۔ صفدر جنگ ہی نے عماد الملک کو احمد شاہ سے کہہ کر میر بخشی گری کا عہدہ دلوایا تھا لیکن عماد الملک نے خود اپنے محسن صفدر جنگ ہی کو نقصان پہنچایا۔ وزارت سے برطرف ہونے کے بعد صفدر جنگ نے دوسرے ہی سال ۱۷ ذی الحجہ ۱۱۶۷ھ میں بہ مرض کینسر یا برگاٹ میں رحلت کی اوائل میں اس کو فیض آباد میں سپرد خاک کیا گیا تھا مگر کچھ مدت کے بعد دہلی میں شاہ مردان کے روضہ کے قریب دفن کیا گیا اس کے بیٹا شجاع الدولہ نے تین لاکھ روپے خرچ کر کے اس کے مرقد پر ایک نہایت شاندار عمارت تعمیر کرایا جو ابھی تک موجود ہے۔ ڈاکٹر عبد الغفار الغفاری نے لکھا ہے کہ اس کے مرقد کے دروازہ پر ذیل کے اشعار کندہ ہیں۔ آخری مصرع سے سنہ ۱۱۶۷ھ کی تاریخ نکلتی ہے:

چوں آں صفدر عرصۂ مردمی	ز دار فنا گشت رحلت گزین[1]
چنیں سال تاریخ او شد رقم	کہ بادا مقیم بہشت بریں

ایرانی شاعر اور تذکرہ نگار والہ داغستانی کو صفدر جنگ[11] سے بڑی الفت اور عقیدت تھی اس نے اس سے کئی بار شرف ملاقات حاصل کی تھی اس نے اس کی مدح میں ایک نہایت شاندار قصیدہ کہا ہے جسے ذیل میں رقم کیا جاتا ہے۔

ای دلت پاک تر از در خوشاب	در جہاں مثل و عدیلت نایاب
ای کرمہای تو افزوں ز شمار	وی عطاہای تو بیروں ز حساب

---

[1] احوال و اذکار علی قلی خاں والہ داغستانی

ای گفت نام زد جود و کرم — وی دلت حاملۂ رای صواب
پیش تیغ تو سراسیمه عدو — ہمچو آن خس که فتد در گرداب
دگران را چه غم از شورش ملک — همه در فکر شراب اند و کباب
سعی کن سعی در اصلاح جہاں — که فتاده اند خلائق به عذاب
کار کن کار موانع منگر — می رود وقت ز دست دریاب
ہم سپہ داری و ہم آصف عہد — نیست ہیچ کس کمی در اسباب
تو چو شتری و مخالفت ارنب — تو ہمای و دگرہا چو ذباب
کس ز حکم تو نمی پیچد سر — حکم حکم تو بود در ہر باب
شہ ترا گفته برادر تو مرا — من ترا خوانده پدر در آداب
جان فدای تو کنم دین نه بود — پیش ارباب خرد فعل عجاب
زانکه در پرورش خلق امروز — در جہاں مثل تو باشد نایاب
به دعا ختم نمایم اکنون — که ملالت برسد از اطناب
ہست تا گردش گردون بادا — کوکب طالع تو عالم تاب
روز خصم تو بود ز عالم — تیره و تار ترا از پر غراب[1]

قزلباش خان امید

والہ[2] داغستانی نے اس کا نام محمد رضا اور امید تخلص لکھا ہے وطن ہمدان[3] تھا۔ تذکروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کی ولادت ہمدان میں ہوئی تھی لیکن خوشگو

---

[1] کلیات والہ داغستانی رام پور [2] ریاض الشعراء ورق ۵۶ [3] سفینۂ خوشگو ص ۲۵۰

رقمطراز ہے کہ وہ اصفہان میں پیدا ہوا تھا۔ والہ داغستانی نے لکھا ہے کہ اس کی پرورش و تربیت اصفہان میں واقع ہوئی۔ تذکروں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس نے ہمدان کو ترک کر کے اصفہان اقامت اختیار کیا تھا۔ عہد بہادر شاہی کے اوائل میں امید ہندوستان چلا آیا۔ ذوالفقار خاں نے اس کو ہزاری منصب اور قزلباش خاں کا خطاب مرحمت کیا تھا۔ مرزا طاہر وحید نے اس کو امید کا تخلص دیا تھا اس سے واضح ہوتا ہے کہ مرزا طاہر وحید سے اس کے تعلقات تھے وہ جس عہدہ پر مامور تھا اس سے وہ خوش نہیں تھا جس کا پتہ اس کے ذیل کے شعر سے چلتا ہے۔

ہیچو بلبل ہمیشہ نالائیم ایں بود منصب ہزاری ما

امید کے تعلقات نظام الملک سے بھی نہایت استوار تھے اس نے دکن میں اس کو ایک بلند عہدہ عطا کیا تھا۔ علاوہ ازیں ہیرے کے کان کا وہ داروغہ بھی تھا نظام الملک کے ۱۱۳۴ھ کے سفر دہلی میں امید اور فقیر دہلوی بھی اس کے ہمراہ تھے صاحب نشتر عشق کا بیان ملاحظہ ہو۔

"تا پنج سال سیاحت اورنگ آباد (دکن) و دیگر بلاد نمودہ
ہمراہ قزلباش امید تخلص مراجعت بہ وطن خود ساخت"

امید فن موسیقی میں ید طولیٰ رکھتا تھا اس فن کے ماہرین بھی اس کا احترام کرتے تھے اس کا دل نہایت دردمند تھا اس کو محفلوں کی جان کہنا چاہیے جس مجلس میں جاتا تھا اس کی رونق دوبالا کر دیتا تھا دوست احباب اس کو دیکھتے ہی مسکرانے لگتے تھے۔

لہ نتائج الافکار، تذکرہ بے نظیر، سفینۂ ہندی۔

راقم حروف اس مقالہ میں امید کا ذکر اسلئے کر رہا ہے کیونکہ وہ شاہ آفریں لاہوری کے معاصرین میں سے تھا لیکن کسی تذکرہ سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ دونوں کی کبھی ملاقات ہوئی ہو شاہ آفریں لاہوری کی رحلت کے تقریباً پانچ سال بعد بہ مرض سکتہ ۱۱۵۹ھ میں امید نے وفات پائی انتقال کے وقت اس کی عمر کتنی تھی یہ کسی تذکرہ میں مرقوم نہیں ہے اسلئے یہ کہنا دشوار ہے کہ شاہ آفریں بڑے تھے یا امید بڑا تھا تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ امید کے تعلقات فقیر دہلوی سے نہایت استوار تھے ۱۱۴۸ھ کے سفر دہلی میں امید اور فقیر دونوں دکن سے ساتھ چلے تھے۔ امید کے انتقال ہونے سے بہت لوگوں کو صدمہ ہوا کیونکہ وہ اپنی خوش مزاجی اور ظرافت کی وجہ سے عوام میں مشہور تھا فقیر دہلوی نے اس کی وفات کے موقع پر ذیل کا مرثیہ کہا تھا۔

واحسرتا دریغا کز جور تیشۂ مرگ — افتاد ناگاہ سرو روان امید

پیراہن عزیزاں در مرگ او کبود است — گلہائے یاس آورد فصل خزان امید

سیراب باغ ہستی در خشک سال دانش — آب حیات بہ برید از بوستان امید

بر شاخسار معنی چوں بلبل آشیاں داشت — چو نقش پا ست اکنوں خاک آشیان امید

جستم فقیر از عقل تاریخ ایں مصیبت — گفتا کہ گشت بی آب باغ جہان امید[1]

والہ داغستانی اور امید کے درمیان بھی نہایت گہرے دوستانہ تعلقات تھے اس کو بھی اس کی رحلت سے بہت غم ہوا اس نے بھی اس کی وفات پر ذیل کی قطعہ تاریخ کہی تھی۔

از رفتن امید دلم خوں شد و رفت — با اشک ز راہ دیدہ بیروں شد و رفت

---

[1] احوال و افکار و آثار میر شمس الدین فقیر دہلوی ص ۱۷۵

چشم اشک فشاں کہ قطرۂ بود چہ شد دل خندہ زنا کہ قطرۂ چیچوں شد و رفت[1]

امید نہایت رنگین بیان اور شیریں زبان تھا وہ ہندوستانی موسیقی میں بھی مہارت رکھتا تھا قدرت اللہ[2] کا بیان ہے کہ اس کی طبیعت میں پاکیزگی، خوش خلقی اور رنگینی تھی وہ حج بیت اللہ سے بھی سبکدوش ہوا تھا اور ایک مذہبی آدمی تھا. عبد الوہاب، قدرت اللہ اور بھگوان داس ہندی سبھی متفق ہیں کہ اس کی وفات سنہ ۱۱۵۹ھ میں ہوئی تھی۔ تذکروں میں مرقوم ہے کہ اس نے تقریباً سات ہزار اشعار نظم کیا تھا۔ ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

بہ بزم غیر چرا می دہی شراب مرا	ز آتش دگری می کنی کباب مرا
منم آن آہوی وحشت زدۂ دشت جنوں	کہ نیاورد بہ دام الفت صیاد مرا
یک غنچہ نہ دیدم کہ جیبش نہ بود چاک	ایں نغمہ کہ آموختہ مرغان چمن را

*

تصور خاں حیرت

تصور خاں نام اور حیرت تخلص تھا۔ وہ معتمد خاں میرزا رستم کا بھائی تھا کابل کے تورانی نسب سے تھا محمد شاہ نے اس کو چار ہزاری کے منصب پر سرفراز کیا تھا وہ ایک شجاع دلیر اور باکمال امیر تھا۔ حاکم لاہوری[2] کا بیان ہے کہ اس نے حیرت کو اپنی صغر سنی میں دو بار نواب عبد الصمد خاں صوبہ دار لاہور کی صحبت میں دیکھا تھا حیرت کو شاہ آفریں سے بہت اخلاص تھا اس لیے گرچہ شاہ آفریں اس دنیا سے

---

[1] احوال و افکار و آثار میر شمس الدین فقیر دہلوی ص ۱۷۶ [2] نتائج الافکار ص ۶۳

[3] مردم دیدہ ص ۱۵۹

بہت کم ملتے تھے لیکن وہ کبھی کبھی اس کے یہاں جاتے تھے۔

"بادشاہ آفریں مرحوم اخلاص داشت وشاہ مرحوم باہمہ نفرت

کہ از مردم دنیا داشت بخانہ اش گاہ گاہی می رفت"[1]

ذیل میں حیرت کے چند اشعار بطور نمونہ لکھے جاتے ہیں۔

خرامد چوں بہ مہتاب از لطافت می شود پنہاں

مگر از عطر پیراہن کسے گیرد سراغش را

در خموشی می شود لعل لبش آدم فریب

چوں بہم آید دو لب یک دانہ گندم می شود

نیست از آبلہ بر چہرہ صاف تو نشان

شدہ حسن تو بصد چشم تماشائی تو

بھگوان داس ہندی[2] نے لکھا ہے کہ قیام الدین کا تخلص حیرت تھا وہ اکبر آباد کا باشندہ تھا اور اس کے والد کا نام شیخ امان اللہ تھا۔

خواجہ اسماعیل خاں خلیل

اسماعیل خاں نام اور خلیل تخلص تھا حاکم لاہوری[3] نے لکھا ہے کہ اس کے والد نواب خواجہ عبدالمومن خاں بہادر تھے جو نواب زکریا خاں بہادر دلیر جنگ کے چھوٹے بھائی تھے۔ خلیل کی شادی نواب زکریا خاں بہادر کی بیٹی سے ہوئی تھی

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۵۹ [2] سفینۂ ہندی ص ۶۰ [3] مردم دیدہ ص ۱۶۲

حاکم نے جب [illegible] میں اپنا تذکرہ لکھا اس وقت خلیل جوان تھا وہ سلیم الطبع اور
گہری نظر رکھنے والا تھا۔ وہ حاکم لاہوری سے شاعری میں اصلاح لیتا تھا حاکم لاہوری
کا خیال تھا کہ اگر وہ اسی طرح مشق سخن کرتا رہتا تو ضرور کسی مقام پر پہنچتا۔ اس نے
حاکم لاہوری کو مثنوی معنوی کا ایک نہایت خوشخط اور صحیح نسخہ تحفتہً پیش کیا تھا
لیکن وہ نسخہ سندیلہ میں چوری ہو گیا نہایت افسوس کی بات ہے کہ خلیل کے حالات
باوجود تلاش اور جستجو کے تذکروں میں نہیں مل سکے اس لئے تشنگی رہ گئی راقم
حروف نے خلیل کا ذکر اس مقالہ میں اس لئے کیا کہ وہ نواب زکریا خاں بہادر ناظم
لاہور کا داماد تھا اور نواب مذکور شاہ آفریں کی نہایت تعظیم و تکریم کرتا تھا ذیل
میں خلیل کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

چشمش ز سیاہ مستی خویش — پروائے خمار ما ندارد
ہر آنکہ بود ز حسن بہتر — این نیست کہ یار ما ندارد
ز ہجر بتے چناں تلخ شد کام من — کہ تلخی اثر کرد در نام من
من کہ ز جان خویشتن سیر شدم بہ ہجر او — کاش ز وصل او مرا مژدہ بہ ناگہاں دہی

ابوالحسن امیر الدین احمد نے اپنے تذکرہ[1] میں ایک دوسرے خلیل کا ذکر
کیا ہے جس کا نام علی ابراہیم تھا اس کی پیدائش موضع شیخپورہ میں ہوئی تھی
جو عظیم آباد (پٹنہ) سے قریب ہے لیکن اس کی نشوونما مرشد آباد میں ہوئی تھی
نواب میر محمد قاسم خاں کے عہد سلطنت میں وہ بلند عہدہ پر فائز تھا ۱۱۹۵ھ تک
وہ زندہ تھا اس کے بعد کے حالات کو مؤلف مذکور نے قلمبند نہیں کیا ہے۔ یہ
واضح ہو کہ اس تذکرہ میں خلیل کے فارسی اشعار درج نہیں ہیں شاید اس نے
فارسی میں شاعری نہیں کی۔

---

[1] تذکرہ مسرت افزا ص ۹۵، ۹۶

عباس قلی خاں فلاّنی

عباس قلی خاں نام اور فلاّنی تخلص تھا حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وہ ایران کے شہر داغستان[1] کا رہنے والا تھا عالمگیر بادشاہ کے عہد سلطنت میں وہ دکن آیا تھا اور اس کو ایک بلند عہدہ سے نوازا گیا تھا بادشاہ عالمگیر کی وفات کے بعد نواب عبد الصمد خاں بہادر دلیر جنگ کے ساتھ اس کی صحبت رہی نواب مذکور اس کی بہت تعظیم و تکریم کرتے تھے حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ اس کے والد سے فلاّنی کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اکثر و بیشتر ان سے ملنے آتا تھا حاکم لاہوری نے اس کو دوبار دیکھا تھا اس کا بیان ہے کہ وہ شیریں زبان تھا اور میٹھی تقریر کرتا تھا وہ دلچسپ اور رنگین حکایتیں بھی سناتا تھا اس کے دماغ میں نہایت بلندی تھی اور اس وقت اس کے دماغ سے امارت کی بو نہیں گئی تھی۔ فلاّنی سے شاہ آفریں نہایت اخلاص اور محبت سے پیش آتے تھے اور کبھی کبھی وہ اس کے گھر جاتا تھا گرچہ وہ غیر ملکی مغل تھا لیکن آفریں کی بہت تعظیم اور توقیر کرتا تھا حاکم لاہوری نے اس کے ذیل کے شعر کو شاہ آفریں کی زبان سے سنا تھا۔

درد سر کوتاہ کردم نامۂ ہجر ترا   از سواد شب نوشتم تا سیاہی رنگ داشت

فلاّنی شعر کم کہتا تھا اس لئے اس کو شاعری کی دنیا میں زیادہ شہرت نہیں ملی عہد محمد شاہی کے اواسط میں اس نے وفات پائی راقم حروف نے فلاّنی کا ذکر اس مقالہ میں اس لئے کیا کیونکہ شاہ آفریں اس سے بہت اخلاص اور محبت کے ساتھ پیش آتے تھے

---

[1] داغستان اب روس کے قبضہ میں ہے۔
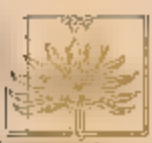
محمد پناہ قابل

اس کا نام محمد پناہ اور قابل تخلص تھا حاکم لاہوری[1] اور قدرت اللہ[2] نے لکھا ہے کہ قابل کشمیر کا باشندہ تھا وہ مرزا عبدالقادر بیدل[3] کا شاگرد تھا اس نے لاہور میں شاہ آفریں سے بھی شرف ملاقات حاصل کیا تھا حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ جب وہ جہان آباد آیا تھا تو اس نے اس کو دعوت پر بلایا تھا وہ آیا تھا اور دیر تک صحبت رہی تھی حاکم کا بیان ہے کہ وہ ایک بوڑھا دبلا پتلا آدمی تھا لیکن شعر بہت پڑھتا تھا۔

"در وقتے از اوقات کہ بہ لاہور رفتہ بود بخدمت شاہ آفریں رسیدہ ہنگامے کہ فقیر بہ جہاں آباد وارد شدم قابل مرحوم را بہ طریق دعوت طلبیدم آمد و تا دیرے نشست"

قابل کے دیوان میں تقریباً پچاس ساٹھ ہزار اشعار ہونگے اس نے اپنا ایک دیوان حافظ شیراز کے دیوان کے جواب میں بھی ترتیب دیا تھا۔ حاکم لاہوری نے قابل کے ذکر میں ایک لطیفہ اس طرح پیش کیا ہے کہ کسی ایرانی شاعر نے خواجہ حافظ کے دیوان کے جواب میں ایک دیوان مرتب کیا تھا اور شاہ عباس بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا تھا شاہ نے کہا کہ تو نے دیوان حافظ کا جواب لکھا ہے کل حشر کے دن خدا کو کیا جواب دے گا؟ شاید قابل کو یہ لطیفہ معلوم نہیں تھا

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۸۱ [2] نتائج الافکار ص ۵۸۲ [3] مردم دیدہ ص ۱۸۱

ورنہ وہ خواجہ حافظ کے دیوان کے جواب میں اپنا دیوان مرتب نہ کرتا قابل نے آخری عمر میں ترک دنیا اختیار کیا تھا قدرت اللہ کے بیان کے مطابق اس نے ۱۱۷۰ھ میں وفات پائی ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

به بزم دود بماند ز بعد کشتن شمع | چو ما به داغ تو مردیم آه ما باقیست
روزے کہ ما و یار گذشتیم از چمن | نالید باغباں کہ بہار و خزاں گذشت
سوز دل پروانہ زد آتش کفنم را | امشب کہ برافروختہ شمعے بہ مزارم
دوئی را رنگ وحدت می دہد یکتائیم قابل | دو مصرع گر بہ دیوانم نشیند فرد برخیزد

بھگوان داس ہندی[1] نے ایک دوسرے قابل کا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا ہے جس کا نام عبداللہ تھا وہ بلگرام کے سادات میں سے تھا اس کا انتقال ۱۱۳۲ھ میں ہوا تھا۔

خواجہ منور قدرت

خواجہ منور نام اور قدرت تخلص تھا تذکروں میں اس کے حالات نہیں ملتے ہیں۔ حاکم لاہوری[2] کی چونکہ اس سے ملاقات ہوئی تھی اس لئے اس نے اس کا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا اس نے لکھا ہے کہ اس کا خاندان توران سے تھا اور وہ سید عفا قدس سرہٗ کی اولاد میں سے تھا اس کے دادا یا والد ہجرت کر کے ہندوستان آئے تھے۔ قدرت نے پنجاب کے ایک قصبہ آدینہ نگر میں اقامت اختیار کیا تھا اس کو

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۱۷۱ [2] مردم دیدہ ص ۱۸۲
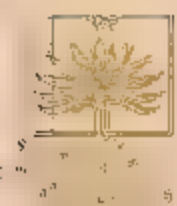
علم طب میں مہارت حاصل تھی اس لیے طبابت کا پیشہ کرتا تھا اتفاق سے حاکم لاہوری کی طبیعت ایکبار آدینہ نگر کے سفر میں خراب ہوگئی تھی اس لیے اس نے اس کو علاج کے لیے طلب کیا تھا بعد میں اس کو معلوم ہوا کہ وہ شعر بھی کہتا تھا قدرت کو اس بات کا یقین تھا کہ وہ اچھے شعر کہتا تھا اس نے حاکم لاہوری کی صحبت میں اپنے چند اشعار پڑھا تھا اور یہ بات کہی تھی کہ میں جس طرح تازہ مضامین باندھتا ہوں وہ کم ہی لوگوں کے بس میں ہے۔ بعدہٗ اس نے ذیل کا شعر پڑھا تھا۔

نشئہ بر لب بالائے جاناں کردہ ام پیدا　　　شریک غالب چاہ زنخداں کردہ ام پیدا

حاکم لاہوری نے قدرت کے اس شعر کو اپنے استاد شاہ آفریں کی خدمت میں اک روز پڑھا تھا وہ سن کر مسکرائے اور فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس عزیز نے خلاقی کا دعویٰ کیا ہے۔ اس نے ایک مختصر دیوان بھی ترتیب دیا تھا لیکن افسوس کہ راقم حروف کو اس کا دیوان دستیاب نہ ہو سکا حاکم لاہوری کے بیان[1] کے مطابق اس کو لمبی عمر عطا ہوئی تھی اور ۱۱۷۰ھ میں وہ معبود حقیقی سے جا ملا ذیل میں اس کے چند اشعار بطور نمونہ نقل کیے جاتے ہیں تاکہ اس کے کلام کا اندازہ ہو۔

این غلامان بقا دشمن مرا نہ تنہا ختند　　　خیر باشد دیدۂ اقبال ودولت کو نیست

فردن کردم کہ رقیباں ہستند　　　نہ گذارند سحر، شام بیا

بر حسن قیامت است اکنوں کہ زخط　　　دادند بہ دست نامۂ اعمالش

بھگوان داس[2] ہندی خواجہ منور قدرت کے بارے میں اپنے تذکرہ میں ایک سطر بھی نہیں لکھا لیکن اس نے مشتاق رائے کے متعلق لکھا ہے جس کا تخلص قدرت ہی تھا مگر اس کے متعلق بھی اس نے ایک ہی سطر میں یہ بات کہی ہے

---

[2] سفینۂ ہندی ص ۱۷۰

کہ وہ خوش فکروں میں سے تھا اور فارسی زبان کی کتابوں کے مطالعہ میں اس کو قدرت حاصل تھی۔ نمونہ کے طور پر اس کا ایک ہی شعر نقل کیا ہے جو پیش کیا جاتا ہے۔

نہ شد در زندگانی از تو رفع خار خار من — چہ حاصل بعد مرگم گر بہ گل گیری مزار من

☼

ابوالحسن قابل خاں میرزا

ابوالحسن قابل خاں نام اور تخلص میرزا تھا اس کے آباؤ اجداد ایران کے باشندہ تھے لیکن ابوالحسن کی پیدائش ہندوستان میں ہوئی وہ دربار شاہی میں ایک منصب پر فائز تھا بہادر شاہ کے عہد سلطنت میں لاہور آیا اور شاہ آفریں سے اس کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے دونوں ساتھ ملکر مشق سخن کرتے تھے ابوالحسن کو آفریں سے بہت محبت تھی حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ اس نے ابوالحسن کو پہلی بار شاہ آفریں کی صحبت میں عہد محمد شاہی میں دیکھا تھا وہ نہایت وضعدار اور صاحب تمکیں تھا اس کے دیوان میں قصیدے اور مثنویاں بھی ہیں۔ وہ نہایت پختہ گو اور مشق رسیدہ تھا حاکم نے دوسری بار اس کو نواب عبدالصمد خان دلیر جنگ کی مجلس میں دیکھا تھا۔ نواب مذکور کو شعر و شاعری سے نہایت دلچسپی تھی اور وہ شعراء کا سرپرست تھا جیسا کہ راقم حروف نے بعض شعراء کے احوال کے سلسلے میں لکھا ہے اس نے ابوالحسن پر بھی عنایتیں کی تھیں اور اس کی بڑی عزت کرتا تھا حاکم لاہوری کے بیان کے مطابق احمد شاہ کے عہد سلطنت میں

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۸۲

ابوالحسن نے وفات پائی اس کے تعلقات شاہ آفریں سے اتنے استوار تھے کہ اس نے آفریں کی ایک غزل کے تتبع میں غزل کہی تھی راقم حروف پہلے آفریں کے اس غزل کے مطلع کو نقل کیا ہے :

عشاق گرچہ پائے بہ سنگ اند چو شرر   گل باز شوق یا دل تنگ اند چوں شرر

اب ذیل میں ابوالحسن کا شعر آفریں کے مندرجہ بالا شعر کے جواب میں نقل کیا جاتا ہے۔

مرزا بہ عاشقاں بلا کش صد آفریں   گل باز شوق با دل تنگ اند چوں شرر [1]

※

مرزا عبدالقادر بیدل

عبدالقادر نام اور بیدل تخلص تھا۔ آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ وہ سخن دانی کے میکدہ کا پیر تھا اور معانی تراشنے میں افلاطون وقت کس میں طاقت اور قدرت کہ اس کی نقالی کرے روش شاعری کے جس کمان سے اس نے بازیگری کی تھی بھلا اب کون اس کو اٹھائے[2] اس کے ذیل کے شعر سے اس کے دعویٰ کا پتہ چلتا ہے۔

مدعی درگذر از دعویٰ طرز بیدل   سحر مشکل کہ بہ کیفیت اعجاز رسد [3]

قدرت اللہ نے اس کو بوستان طریقت کا سرو کہا ہے۔ اس کے اسلاف اور اس چغتائی قوم سے تھے قدرت اللہ،[4] آزاد بلگرامی[5] اور ابوالحسن امیرالدین[6] کی

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۸۲، [2] خزانہ عامرہ [3] نتائج الاذکار ص ۱۱۲، ۱۱۳ [5] سرو آفرین ص ۵۲

واسطے ہے کہ اس کی ولادت عظیم آباد (پٹنہ) میں ہوئی تھی۔ آزاد بلگرامی نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ بیدل نے معانی کے درجہ کو نویں آسمان پر پہنچا دیا تھا اور جو لوگ بلند طبع ہیں وہی ان کے اشعار کو سمجھ سکتے ہیں۔

رساند پایۂ معنی بہ آسمان نہم　　　　بلند طبع شناسد کلام بیدل را

تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ بیدل، فقر، روشن دلی اور استقامت میں پایۂ بلند پر تھا اس کی زندگی کے بیشتر حصے بنگال میں گذرے گرچہ وہ ہندوستان کے مختلف شہروں میں مقیم رہا پروفیسر سید حسنؒ نے تحقیق سے یہ بات لکھی ہے کہ اس کی پیدائش مرشد آباد میں ہوئی تھی بیدل کی جوانی کے اوائل کا زمانہ شہزادہ محمد اعظم خلف عالمگیر بادشاہ کی ملازمت میں گذرا اور وہ ایک لائق منصب پر سرفراز تھا۔ آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ میں یہ بات لکھی ہے کہ شہزادہ محمد اعظم کے دوستوں میں سے کسی نے ان کی خدمت میں بیدل کی شاعری کی تعریف کی شہزادہ نے اس سے کہا کہ آپ بیدل سے کہئے کہ میری مدح میں قصیدہ کہے تاکہ اس کو انعامات سے نوازا جائے لیکن جب بیدل سے اس بات کی فرمائش کی گئی تو اس نے انکار کر دیا دوستوں نے اس کو بہت سمجھایا کہ کوئی نظم شہزادہ مذکور کی مدح میں کہی جائے لیکن اس نے تسلیم نہیں کیا اور ملازمت سے برطرف ہو کر دہلی چلا گیا۔ تذکروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اس نے اپنی زندگی کے باقی دن اسی شہر میں گذارے آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ وہ بھی اس معاملہ میں بیدل کا ہم خیال ہے یعنی ترک مداحی اور ردّ صلہ۔ صلہ عطا کرنا امراء کی ہمت اور صلہ کو رد کرنا فقراء کی ہمت ہے بیدل نے اپنے آپ کو بادشاہوں اور امراء سے دور رکھتا تھا لیکن امراء خود اس

لے ماہنامہ نیا دور

کے آستانہ پر جاتے تھے بلکہ بادشاہ سے لیکر ادنیٰ جلودار شاہ تک ہر
بادشاہ کے امراء اور ارکان دولت (اس کی خدمت میں) جاتے تھے اور وہ ان
سے نہایت خلوص کے ساتھ ملتا تھا. نواب آصف جاہ سنہ ۱۱۳۲ھ میں جب دکن میں
جلوہ افروز ہوا تو اس نے خط لکھ کر بیدل کو بلایا. اس نے اس کے جواب میں
ذیل کا شعر لکھ کر بھیجدیا اور خود نہیں گیا۔

دنیا اگر دہند نہ خیزم زجای خویش | من بستہ ام حنای قناعت بہ پای خویش[1]

بیدل نے زبان فارسی میں نادر چیزیں ایجاد کیں جن کو اہل محاورہ نے
پسند نہیں کیا مثلاً اس نے اپنے چھوٹے بیٹا کے مرثیہ میں ذیل کا شعر کہا جس میں
خرام کاشتن کا محاورہ استعمال ہوا ہے شعر ملاحظہ ہو۔

ہر گہ دو قدم خرام می کاشت | از انگشتم عصا بہ کف داشت[2]

بیدل نے ایسے اشعار بھی بہت کہے ہیں جو قواعد فصاحت کے مطابق ہیں
اگر کوئی صاحب استعداد اس کے کلیات سے ایسے اشعار کو جدا کرکے علیحدہ
ایک دیوان مرتب کرے تو نسخۂ اعجاز ہو جائے۔ بیدل نے غزل، قصیدہ، مثنوی
اور رباعی بھی کہی ہے۔ اس کے علاوہ نثر میں بھی اس کی شہرت ہے اور وہ طرز
خاص کا موجد اور خاتم بھی تھا اس کی نظم و نثر میں تصوف کا رنگ نمایاں ہے
اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک نہایت باکمال انسان بنایا تھا آزاد بلگرامی کے بیان
کے مطابق اس کے کلیات میں تقریباً نوے ہزار اشعار ہونگے۔

بھگوان داس ہندی کا بیان ہے کہ بیدل نے نواب شکر اللہ خاں کے
سوا اور کسی کی مدح نہیں کی اور اپنی زندگی کے آخری دنوں تک نواب مذکور اور

---

[1] خزانہ عامرہ [2] سفینۂ ہندی ص ۲۹

اس کی اولاد کے سایہ رافت میں رہا۔

"از منصب استعفا نمود و از اں روز عزلت اختیار کرد بمواری نواب شکر اللہ خاں طرح دیگری نو کردہ و تا آخر حیات در سایہ رافت نواب مرحوم و اولادش می زیست[1]"

راقم حروف نے بیدل کا ذکر اس مقالہ میں اس لئے کیا کیونکہ خان آرزو[2] نے محمد علی رائج کے سلسلہ میں لکھا ہے کہ محمد علی رائج، عبدالقادر بیدل، شاہ ناصر علی اور فقیر اللہ آفریں ہمطرح تھے اس میں شبہہ نہیں کہ بیدل کی طرح شاہ آفریں بھی اہل دنیا سے ملنا پسند نہیں کرتے تھے۔ یہاں تک کہ نواب عبدالصمد خاں بہادر دلیر جنگ صوبہ دار لاہور نے دو بار ان سے شرف ملاقات کی درخواست کی تھی لیکن انھوں نے ملاقات کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ علی قلی خاں والہ داغستانی[3] کو بھی انھوں نے ملاقات کرنے کی اجازت نہیں دی تھی یہ بات بھی صحیح ہے کہ آفریں نے بیدل کے رنگ میں کچھ اشعار کہے ہیں لیکن ان کے دیوان میں بہت سارے سادہ اور عام فہم اشعار بھی ہیں ذیل میں خان آرزو کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"میر محمد علی رائج .... با میرزا عبدالقادر بیدل و شاہ ناصر علی و فقیر اللہ آفریں و دیگر شعرای عصر ہم طرح بود[4]"

بیدل شاہ آفریں کا ہمعصر تھا اس کی وفات ۱۱۳۳ھ میں دہلی میں ہوئی اور آفریں نے گیارہ سال بعد لاہور میں رحلت کی راقم حروف کو کسی تذکرہ سے یہ معلوم نہ ہو سکا کہ بیدل کی ولادت کس سال ہوئی تھی اس لئے دونوں میں عمر کے لحاظ سے کون بڑا تھا یہ کہنا مشکل ہے ذیل میں بیدل کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں

---

[1] سفینۂ ہندی ص ۲۹ [2، 4] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص ۷۶ [3] ریاض الشعراء

من سنگدل چہ اثر برم نہ حضور ذکر دوام او[1]
چو نگین نشر کہ فرو روم بخود از خجالت نام او
نہ دماغ دیدہ کشودنی نہ سر فسانہ شنودنی
ہمہ راز بودہ غنودنی بکنار رحمت عام او

ابو الحسن امیر الدین احمد[2] نے اس کے ریختہ کے دو شعر اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے جسے ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے:

مت پوچھ دل کی باتیں وہ دل کہاں ہے میں ہوں
اس تخم بے نشاں کا حاصل کہاں ہے میں ہوں
جب دل کے گلستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا بیدل کہاں ہے میں ہوں

٭

میر غلام علی آزاد بلگرامی

آزاد تخلص اور میر غلام علی نام تھا۔ تذکروں میں مذکور ہے کہ آزاد بلگرامی کے آباؤ اجداد سید محمد صغریٰ کے خاندان سے تھے اور سید محمد صغریٰ حضرت خواجہ قطب الدین بختیار کاکی علیہ رحمۃ کے مریدوں میں سے تھے۔ سلطان التمش نے ان کو اپنے دربار میں مناسب عہدہ عنایت کیا تھا نامور تذکرہ نگاروں کی رائے ہے کہ میر عبد الجلیل بلگرامی اس کے نانا تھے وہ اپنے بیان کے مطابق واسطی سادات سے تھا۔

---

[1] خزانہ عامرہ [2] مسرت افزا ص ۵۳

"آزاد الحسینی نسباً والواسطی اصلاً والبلگرامی مولداً و منشاء
والحنفی مذہباً والچشتی طریقۃ"[1]

آزاد بلگرامی بروز اتوار ۲۵ صفر ۱۱۱۶ھ میں بلگرام کے میدان پورہ قصبہ میں متولد ہوئے[2] انھوں نے سید میر طفیل محمد بلگرامی سے درس لیا جو اس عہد میں ایک جلیل القدر استاد تھے میر سید محمد سے علم العروض اور چند کتابیں پڑھیں یہ بات واضح ہو کہ میر سید محمد اس کے ماموں تھے میر عبدالجلیل بلگرامی (نانا جان) سے احادیث اور لغات کا درس لیا۔ انھوں نے مدینہ منورہ میں شیخ حیات سندھی سے صحاح ستہ میں سند حاصل کیا ان کے ذوق و شوق اور عشق الٰہی کا یہ عالم تھا کہ اکثر و بیشتر شب میں مسجد نبوی کے پر فضا ماحول میں صحیح بخاری کو یاد کرتا تھا اس نے مدینہ منورہ کے دور اقامت میں شیخ عبدالوہاب طنطاوی مصری علیہ رحمتہ سے احادیث نبوی کا درس لیا۔

آزاد بلگرامی کو شعراء، علماء، محققین اور دانشوروں سے شرف ملاقات حاصل کرنے کا بڑا ذوق تھا۔ راقم حروف اس مقالہ میں آزاد بلگرامی کے حالات اس لیے قلمبند کر رہا ہے کیونکہ وہ شاہ آفریں لاہوری کے معاصرین میں سے تھا۔ اور ان سے لاہور میں ۲۹ محرم ۱۱۴۳ھ میں اور دوسری بار ۱۱۴۷ھ میں شرف ملاقات بھی حاصل کیا تھا جس کا ذکر اس نے اپنے تذکرہ میں کیا ہے[3] اس کا ماموں میر سید محمد سندھ میں میر بخشی اور وقائع نگار کے منصب پر مامور تھا اس زمانہ میں سندھ کا صدر مقام سیوستان تھا آزاد بلگرامی ۱۱۴۲ھ میں ماموں سے شرف ملاقات حاصل کرنے کے لئے دہلی، لاہور، اور ملتان کی راہ سے ایک سال تین ماہ میں سیوستان میں وارد ہوا اس کے ماموں نے اس کو اپنا قائم مقام مقرر

۱، ۲، ۳ سرو آزاد ص ۲۹۲، ۲۹۳، ۲۰۵ مطبوعہ

کر کے بلگرام کا سفر کیا اور چار سال کی طویل مدت کے بعد واپس آیا آزاد بلگرامی نے میر بخشی اور وقائع نگار کے فرض کو نہایت حسن سلوک کے ساتھ اپنے ماموں کے غائبانہ میں انجام دیا ۱۱۴۸ھ میں پھر وہ دہلی لوٹ آیا۔ تین رجب ۱۱۵۰ھ میں آزاد بلگرامی حج بیت اللہ کے ارادہ سے روانہ ہوا اور اس فریضہ سے سبکدوش ہونیکے بعد پھر دکن میں اقامت پذیر ہوا[1]۔ اس نے اپنا مشہور تذکرہ ۱۱۶۶ھ میں تالیف کیا۔ مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ آزاد بلگرامی کی تصنیفیں ہندوستان میں اپنی نوعیت کی پہلی تصنیف ہیں اس نے ہزاروں علماء اور دانشوروں کے احوال قلمبند کیا جو گمنامی میں پڑے ہوئے تھے وہ شاعر بھی تھا اور اس نے عربی و فارسی میں بھی شاعری کی ہے گرچہ اس نے کبھی کسی کی تعریف میں شعر نہیں کہا لیکن حج بیت اللہ کے اشتیاق میں اس نے نظام الملک آصف جاہ صوبہ دار دکن کی مدح میں یہ رباعی کہی تھی۔

اے حامی دین محیط جود و احساں[1] ۔۔۔ حق داد ترا خطاب آصف شایاں

او تخت بہ درگاہ سلیماں آورد ۔۔۔ تو آل نبی را بہ در کعبہ رساں

نظام الملک مندرجہ بالا رباعی سن کر بہت خوش ہوا اور اس نے آزاد بلگرامی کے حج بیت اللہ کا نظم کر دیا اس کی عمر اس وقت صرف چھتیس[36] سال تھی مولانا شبلی نے لکھا ہے کہ وہ مدینہ منورہ میں آٹھ مہینے اقامت پذیر رہا میر عبدالوہاب افتخار سے اس کے گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور افتخار اس کا شاگرد بھی تھا گلشن علی جونپوری، آزاد بلگرامی سے بڑی محبت رکھتا تھا۔ آزاد بلگرامی کی ملاقات شیخ حزیں اور علی قلی خاں والہ داغستانی سے ہوئی تھی شاہ آفریں کے شاگرد حاکم لاہوری نے بھی چند بار آزاد بلگرامی سے ملنے

---

[1] خزانہ عامرہ ورق ۳۳۸

کا شرف حاصل کیا تھا اس کا بیان ہے کہ آزاد بلگرامی خصائل حمیدہ اور مروت میں بے مثال تھا اس کا خالو زادہ علم و فضل سے معمور تھا ایسی عالمگیر شہرت کے باوجود وہ لوگوں سے نہایت عاجزی اور خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا فقرا اور اور غربا کی وقت ضرورت امداد کرتا تھا۔ مولانا شبلی نے اس کی شاعرانہ صلاحیتوں کی بڑی تعریف کی ہے ایک واقعہ[1] اس نے قلمبند کیا ہے کہ ایک روز نواب ناصر جنگ شہید کے دربار میں موسوی خاں جرأت، میرزا جان رسا شاہنواز خاں اور نقد علی خاں ایجاد بھی تشریف رکھتے تھے نواب مذکور نے ایک تازہ غزل پڑھنا شروع کیا جس کی اصلاح آزاد بلگرامی سے ہو چکی تھی کسی شعر میں سرو کو خراماں کہا تھا اس لئے سبھوں نے اعتراض کیا آزاد بلگرامی نے کہا کہ یہ مرزا صائب کا شعر دیکھیے۔

یک رہ بر آر از آستین دست نگاریں در چمن
تا دست ہا پنہاں کند سرو خراماں در بغل

جرأت نے حیرت زدہ ہو کر کہا کہ صائب نے بھی سرو کو خراماں ہے گرچہ وہ تو ساکت رہتا ہے آزاد بلگرامی نے جواب دیا کہ شاعری کی جڑ تخیل ہے شاخیں ہوا میں ہلتی ہیں اور درخت خراماں نظر آتا ہے۔

آزاد بلگرامی نے اپنی تصنیف "سبحۃ المرجان" میں بھاشا کے خیالات اور صنائع شاعری کو عربی زبان میں منتقل کیا ہے ہندی زبان کی بحروں اور قوافی کا مقابلہ اس نے عربی سے کیا ہے اور یہ بات ثابت کی ہے کہ عربی و فارسی کی بحریں ہندی سے جدا ہیں[2]۔

آزاد بلگرامی کی ملاقات ۱۱۶۲ھ تک خان آرزو سے نہیں ہوئی تھی لیکن

---

[1] داکٹر داغستانی ۱۶ مقالات شبلی جلد پنجم ص ۱۲۲، ص ۱۲۶

کو خان آرزو سے محبت اور ربط تھا جس کا ذکر خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں
ہے تعجب کی بات ہے کہ والہ داغستانی نے آزاد بلگرامی جیسے باکمال شاعر کا
اپنے تذکرہ ریاض الشعراء میں نہیں کیا حالانکہ دونوں میں دوستانہ تعلقات اور
بار ملاقات بھی ہوئی تھی۔ مولانا شبلی نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ والہ داغستانی
نی نژاد تھا اور وہ آزاد بلگرامی کے اشعار کو اس درجہ کا نہیں سمجھتا تھا کہ اپنے
رہ میں قلمبند کرے والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں کئی جگہ اس بات کا اظہار
ہے کہ ہندوستان کے شعراء کی فارسی نہ جانے کس ملک کی زبان ہے لیکن راقم
ن مولانا شبلی کے اس خیال کو تسلیم نہیں کرتا ہے کہ وہ ہندوستانی شعراء
رت سے دیکھتا تھا کیونکہ اس نے بہت سے ہندوستانی شعراء کی بڑی تعریف
ہے جن میں سے چند کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

(میر محمد عظیم ثبات کے بارے میں:

"بسیار محبوب القلوب، وحمیدہ خصائل وخوش سلیقہ و
بہ دل آشنا و سخن فہم است"[1]

فقیر دہلوی سے متعلق :-

"بہ اعتقاد راقم حروف، ہیچ یک از متقدمین و متاخرین
راپایۂ او نبود و نیست چہ جمیع محسنات ولوازم سخنوری را جامع
است"[2]

خان آرزو سے متعلق :-

"در ادا دانی و بدیہہ گوئی و بذلہ گوئی و دیگر صفات حمیدہ امیر
خان، مرحوم کہ مسلم روزگار بودہ از حساب بر می داشت"[3]

[1-3] ریاض الشعراء ورق ۴۸، ۲۶۱، ۲۶۱

شاہ آفریں لاہوری کے بارے میں :-

"الحق بہ ایں دردمندی کم کسے دیدہ شدہ عرض تازہ یابود بودم اکثر قدم رنجہ می نمود و اثر صحبتش بر دلولہ و شورم می افزود"[1]

قدرت اللہ[2]، مولانا شبلی[3] اور دیگر تذکرہ نگاروں نے لکھا ہے کہ آزاد بلگرامی نے ۱۲۰۰ھ میں اورنگ آباد میں وفات پائی۔

تصنیفات آزاد بلگرامی :- (۱) "خزانہ عامرہ": اس میں ایسے شعراء کا ذکر ہے جنکو بادشاہوں سے انعامات ملتے تھے۔

(۲) "روضۃ الاولیاء": اس کتاب میں صوفیا کے احوال درج ہیں۔

(۳) "دیوان عربی" (۴) "دیوان فارسی"

(۵) "شرح بخاری": صرف چند باب کی شرح اس کتاب میں ہے۔

(۶) "مآثر الکرام": بلگرام کے فقراء اور علماء کے علاوہ ہندوستان کے بھی بڑے علماء کا ذکر ہے۔

(۷) "سند السعادات فی حسن خاتمۃ السادات" اس کتاب میں یہ بات ہے کہ سادات کا خاتمہ ہمیشہ بہتر ہوتا ہے۔

(۸) سرو آزاد :- فارسی شعراء کا تذکرہ ہے۔

(۹) ید بیضا :- یہ بھی فارسی شعراء کا ایک تذکرہ ہے۔

☼

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۲۴ [2] نتائج الافکار صہ ۸۹ [3] مقالات شبلی جلد پنجم صہ ۲

سراج الدین علی خان آرزو

سراج الدین علی خاں کا تخلص آرزو تھا تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کی ولادت ۱۱۰۱ھ کے اواخر میں اکبرآباد (آگرہ) میں ہوئی تھی اس کا نسب نامہ نسلاً شیخ نصرالدین محمود چراغ دہلوی تک پہنچتا ہے اور بطناً شیخ غوث گوالیاری علیہ رحمۃ سے جا ملتا ہے آزاد بلگرامیؒ نے لکھا ہے کہ اوائل شعور میں ہی وہ کسب علم میں مصروف ہوا اور صرف چودہ سال کی عمر سے شعر کہنا شروع کیا اس نے چوبیس سال کی عمر تک اپنے عہد کے باکمال علماء سے اکتساب علم کیا نامور ایرانی شاعر اور تذکرہ نگار والہ داغستانی نے اس کے متعلق لکھا ہے۔

"در اوائل شباب تحصیل علم نمود وارد دارالخلافہ دہلی شدہ تاحال تحریر ہمیں جا توطن دارد۔ امرا و اعاظم دولت پیوستہ در حرمت و مراعات او اہتمام می ورزند و او باکمال بے اعتنائی و وارستگی بسر می برد۔ در اداد انی و بدیہہ سنجی و بذلہ گوئی و دیگر صفات حمیدہ امیر خاں مرحوم کہ مسلم روزگار بودہ ازو حساب بر می داشت .... در ترتیب نظم طبعی بہ قدرت دارد"[2]

آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ خان آرزو ۱۱۳۲ھ میں دہلی میں اقامت پذیر تھا راقم حروف اس مقالہ میں خان آرزو کا ذکر اس لیے لکھ رہا ہے کہ خان آرزو، شاہ آفریں کے معاصرین میں سے تھا اور اس نے اس کو خط بھی لکھا تھا جس سے دونوں کے

---

[1] سرو آزاد ص ۲۲۰ مطبوعہ [2] ریاض الشعراء ورق ۵۱

گہرے تعلقات پر روشنی پڑتی ہے خان آرزو نے جو خط شاہ آفریں کو لکھا تھا اسے شاہ آفریں کے عزیز شاگرد حاکم لاہوری نے اپنے استاد مذکور کے یہاں پڑھا تھا جس سے دو سطر اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے ذیل میں ملاحظہ ہو۔

"فقیر سر تخیل بہ جیب از زمرۂ یومنون بالغیب دیدار طلب مو
بہ مو سراج الدین علی آرزو بہ عرض اشتیاق یاد دہ آں بہ عمد اگر فراموش
کن دنیا و مافیہا است[1]"

اس خط میں ذیل کا دو مطلع بھی مرقوم تھا۔

(۱) گر بہ روی تو زلیخا مژہ ای وا می کرد۔

(۲) ہست مضمون فنا جلوہ گر از موی سفید۔

حاکم لاہوری جب لاہور سے ایک بار دہلی آرہا تھا تو اس کے استاد شاہ آفریں نے ایک خط بنام خاں آرزو اسے دیا تھا تاکہ وہ دہلی میں ان کو دیدے حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ جب اس نے یہ خط خان آرزو کو دیا تو بہت گرم جوشی سے اس سے ملا اور یہ بات کہی کہ میں ان کے (شاہ آفریں) اخلاص کا معتقد ہوں۔

"اول دہلہ بہ او برخوردم و خط شاہ آفریں مرحوم کے حوالہ احقر فرمودہ
بودند، رسانیدم بہ گرمیٔ بسیار پیش آمد و می گفت کہ من متعقد
خلاص فدا ایتم[2]"

مندرجہ بالا خط کی روشنی میں یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ آفریں لاہوری کے گہرے دوستانہ تعلقات آرزو سے تھے واآلہ داغستانی کا بیان ہے کہ آرزو کا تعلق گوالیار سے تھا اور ۱۱۶۱ھ میں وہ دہلی میں مقیم تھا ارکان سلطنت اس کی

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۸ [2] مردم دیدہ ص ۶۰

نہایت تعظیم و تکریم کرتے تھے اور وہ بہت بے تعلقی سے زندگی بسر کرتا تھا خصائل حمیدہ مثلاً بذلہ گوئی بدیہہ سنجی اور حسن ادا میں زمانہ میں شہرت رکھتا تھا۔[1] امیر حسن دہلوی نے بھی خان آرزو کے محاسن کی بڑی تعریف کی ہے اس کا بیان ہے کہ امیر خسرو کے بعد ایسا باکمال، پرگو اور خوشگو شاعر پیدا نہ ہوا۔ اس کے اشعار نظیری اور فغانی کے ہم پلہ ہیں۔

"خان مغفرت نشان سرگروہ سخن سنجان استاد استادان ہندوستان جنت نشان چراغ دودمان گفتگو سراج الدین علی خاں آرزو بعد امیر خسرو دہلوی چنیں صاحب کمال، پرگو و خوشگو بہ سامع عالمیان نہ رسیدہ ہفت دیوان دارد کہ ہر یکے پہلو بہ نظیری و فغانی می زند[2]"

تذکروں سے اس بات کا پتہ چلتا ہے کہ آنند رام مخلص کی سفارش سے بادشاہ نے خان آرزو کو ایک عہدہ دیا تھا۔ نجم الدولہ کی جانب سے آرزو کو ڈیڑھ سو روپیہ ہر ماہ بطور وظیفہ ملتے تھے وہ ۱۱۶۸ھ میں لکھنؤ گیا اور نواب شجاع الدولہ نے اس کو تین سو روپے سالانہ کا وظیفہ مرحمت کیا والہ داغستانی نے بھی ایک بار اس کی مدد کی تھی۔ ذیل میں خود خان آرزو کا بیان نقل کیا جاتا ہے

"با وجود آنکہ با فقیر آرزو چنداں اخلاص ندارد، دریں بیکسی ہا کہ ہجوم آوردہ آنقدر عطوفت فرمودہ کہ از حیز تقریر و تحریر بیرون است[3]"

آرزو کی استعداد اور صلاحیت خداداد کا یہ عالم تھا کہ اس نے شیخ محمد علی حزیں لاہجی جیسے باکمال شاعر کے دیوان پر تنقید کیا اور اس کے دیوان پر تقریباً

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۵۱ [2] تذکرہ اردو مطبوعہ ص ۱۲، ۲۷ [3] مجمع النفائس ورق ۵۳۴

پانچ سو نامربوط اور قابل گرفت اشعار نکال کر یکجا کیا اور اس کتاب کا نام تنبیہہ الغافلین رکھا اس نے اس لیے ایسا کیا کیونکہ شیخ حزیں نے اہل ہند کی ہجو اپنے اشعار میں کی تھی۔ ذیل میں ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

نشناس سیرتی است تمنای مردمی ۔۔۔۔ از دیولاخ ہند کہ انساں نداشتہ است

ڈاکٹر داغستانی نے لکھا ہے کہ خان آرزو کے دیوان میں تقریباً تیس ہزار اشعار ہیں آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ آرزو نے ۲۳ ربیع الثانی ۱۱۶۹ھ میں بمقام لکھنؤ رحلت کیا اس کی لاش تھوڑے دنوں تک لکھنؤ میں رکھی گئی بعدہٗ وہ دہلی میں مدفون ہوا اس موقع پر آزاد بلگرامی نے تاریخ وفات کہی تھی۔

سراج الدین علی خاں نادر عصر ۔۔۔۔ ز مرگ او سخن را آبرو رفت
اگر جوید کسے سال وفاتش ۔۔۔۔ بگو آن جان معنی آرزو رفت
۱۱۶۹ھ

تصنیفات خان آرزو :-

(۱) تنبیہہ الغافلین
(۲) شرح گل گشتی میر نجات
(۳) شرح مختصر المعانی
(۴) جواب اعتراضات منیر
(۵) غرائب اللغات
(۶) شرح قصائد عرفی
(۷) شرح سکندر نامہ
(۸) خیابان
(۹) موہبت عظمیٰ
(۱۰) عطیۂ کبریٰ
(۱۱) چراغ ہدایت
(۱۲) سراج اللغۃ
(۱۳) دیوان
(۱۴) مجمع النفائس

میر شمس الدین فقیر عباسی

میر شمس الدین نام اور فقیر تخلص تھا۔ والہ داغستانی کے ذیل کے شعر سے بھی اس کے نام کا پتہ چلتا ہے۔

میر شمس الدین فقیر دہلوی   ہست نام نامی آن مہرباں[1]

تذکروں میں لکھا ہے کہ فقیر دہلوی کا نسب نامہ والد کی جانب سے حضرت عباسؓ سے جاملتا ہے اور والدہ محترمہ کی جانب سے وہ سادات میں سے تھا۔ آزاد[2] بلگرامی، مصحفی[3] اور والہ[4] داغستانی نے اس کو عباسی لکھا ہے۔ سارے تذکروں میں یہ مرقوم ہے کہ اس کی ولادت شاہجہاں آباد (دہلی) میں ہوئی تھی والہ[5] داغستانی، بھگوان داس ہندی[6] اور قدرت[7] اللہ نے بھی لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۱۵ھ میں اس کی ولادت ہوئی تھی۔ خان آرزو رقمطراز ہے کہ اول اس کا تخلص مفتون تھا بعد میں اس نے فقیر تخلص اختیار کیا تھا اس نے اس کی نہایت تعریف کی ہے چند سطریں ذیل میں نقل کی جاتی ہیں ـــــ

"...... کثیر الاخلاق ...... بر فقیر آرزو مہربان است خداش سلامت دارد کہ امروز مثل او در ہند نیست ...... مشق سخن و صفائی زبان را بجائے رسانده کہ اہل زبان از و حساب بری دارند بلکہ بعضی دم از تلمذش می زنند در فضل و کمال و شعر و انشاء و فنون دیگر مثل عروض

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۱۳۱۳ ب [2] خزانہ عامرہ [3] عقد ثریا [4] ریاض الشعراء [5] ریاض الشعراء [6] سفینہ ہندی [7] نتائج الافکار

وقافیہ و معانی و بیان و بدیع یکتای روزگار و منتخب لیل و نہار است"[1]

کسی تذکرہ سے اس بات کا ثبوت نہیں ملتا ہے کہ فقیر دہلوی کی ملاقات اس عہد کے نامور شاعر شاہ آفریں لاہوری سے ہوئی تھی یا نہیں لیکن شاہ آفریں لاہوری کے شاگرد حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ میں فقیر دہلوی کا ذکر کیا ہے اور اس کی نہایت تعریف کی ہے ملاحظہ ہو۔

"الحق دریں وقت بی ہمتا ست و صاحب کمال"[2]

ابوالحسن امیر الدین احمد[3] نے بھی فقیر دہلوی کی بڑی تعریف کی ہے، اس نے لکھا ہے کہ وہ ادرج عرفان کا چمکدار سورج اور نور یزداں کا مکمل مظہر ہے گرچہ تخلص اس کا فقیر ہے لیکن اپنے استعداد کے سبب سے امیروں میں ہے بفضل و کمال، انشاء علم معانی، فن شعر، بیان، بدیع، عروض و قوافی اور زبان دانی میں اپنے عہد میں ممتاز ہے۔

نامور ایرانی تذکرہ نگار لطف علی بیگ آذر نے فقیر سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا اس نے اس کو ذیل کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔

"فقیر منش و شاعرے نیکو روش"[4]

خان آرزو کا بیان ہے کہ تقریباً چونتیس سال سے اس کی ملاقات فقیر دہلوی سے تھی اس نے فقیر کے ایک قصیدہ کی بہت ستائش کی ہے جس میں تمام صنائع شعری کا استعمال کیا گیا ہے خان آرزو کے خیال میں رشید وطواط کے بعد اس نوعیت کا قصیدہ کسی نے نہیں لکھا فقیر دہلوی نے غزلوں میں بابا فغانی کی پیروی کی ہے اور اس کی مثنویاں بھی بہت خوب ہیں اس عہد کے باکمال شاعر اور

---

[1] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص ۸۳ [2] مردم دیدہ ص ۸۲ [3] مسرت افزا [4] آتش کدہ۔

تذکرہ نگار آزاد بلگرامی نے بھی فقیر دہلوی کی بہت تعریف کی ہے ذیل میں ملاحظہ ہو

"در فضل و کمال و شعر و انشاء و معانی و بیانی و بدیع و عروض و قوافی و زباندانی ممتاز اقران"[1]

حاکم لاہوری نے ایک بار فقیر دہلوی کے دولتکدہ پر اس سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا اس نے حاکم لاہوری کو اپنے دیوان سے کچھ اشعار پڑھ کر سنایا تھا اس ملاقات سے قبل حاکم لاہوری نے فقیر کی ایک غزل کے تتبع میں غزل لکھی تھی اور فقیر دہلوی کی خدمت میں بھیجا تھا یہ غزل دراصل نظیری کے تتبع میں دونوں باکمال شعراء نے لکھی تھی فقیر دہلوی نے حاکم لاہوری کی فرستادہ غزل پڑھنے کے بعد ایک رقعہ بہت محبت بھرے الفاظ میں لکھ کر اس کو بھیجا تھا۔[2]

فقیر دہلوی اور والہ داغستانی کے درمیان گہرے دوستانہ تعلقات تھے اور اس دوستی کو دونوں نے آخری دم تک قائم رکھا۔ والہ داغستانی کا بیان ہے کہ فقیر دہلوی سے اس کو ایسی محبت و الفت تھی جس کو بیان کرنے سے قلم عاجز ہے والہ داغستانی اصفہان سے عشق میں ناکام ہو کر ہندوستان آیا تھا اور شب و روز آہ و بکا کرتا تھا۔ فقیر دہلوی نے حق دوستی ادا کیا اور ہر طرح سے اس کا دل بہلایا والہ داغستانی کو ہندوستان آنے کے بعد بھی ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی محبوبہ خدیجہ سلطان کے بغیر زندہ نہیں رہ سکے گا اس کے ذیل کے اشعار سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

در ہند والہ من تپاں آرام جاں در اصفہان	یکسالہ رہ آں درمیاں سلطان کجا و من کجا
من آں بلبل بی نصیبم کہ آخر	نہ شد روزیم سیر باغ خدیجہ
شوم سرخ رو در میان شہیدان	شود خون من گر حنای خدیجہ[3]

---

[1] خزانہ عامرہ ورق ۲۷۵ [2] مردم دیدہ ص ۸۳ [3] دیوان والہ داغستانی رام پور

فقیر دہلوی اور والہ داغستانی دونوں کے دوستانہ تعلقات کا اندازہ والہ داغستانی کی ذیل کی تحریر سے ہوتا ہے۔

"احبابی صادق الولا سیما فاضل تحریر میر شمس الدین فقیر دہلوی عباسی[1]"

والہ داغستانی نے ذیل کے اشعار میں بھی فقیر دہلوی کو یاد کیا ہے۔

دارم از فضل حبیب ذوالمنن	دوستی در خطۂ ہندوستان
نکتہ سنجی کہ بود بی اشتباہ	عاجز از تعریف و توصیفش زبان
میر شمس الدین فقیر دہلوی	ہست نام نامیِ آں مہرباں
من کشیدی از زبانم حرف ہا	جمعشاں می کرد و من غافل ازان
شد مدون عاقبت آں گفتہا	موجب تفضیح احوالم شد آن[2]

والہ داغستانی کا بیان ہے کہ فقیر دہلوی علم کلام، فقہ، حدیث اور تصوف میں یکتائے روزگار تھا لیکن دنیا والوں سے نہایت خاکساری سے ملتا تھا امرائے وقت اس کا بہت احترام کرتے تھے فقیر پرہیزگاری، زہد، تقویٰ و ورع میں بے مثال تھا۔

راقم حروف کا خیال ہے کہ والہ داغستانی نے فقیر کی تعریف میں کچھ مبالغہ سے کام لیا ہے اور یہ عین فطرت کے مطابق ہے کیونکہ وہ اس کا قلبی دوست تھا ظاہر ہے کہ دوست کی تعریف کون نہیں کرتا لیکن اس کا یہ مفہوم نہیں ہے کہ والہ داغستانی نے فقیر دہلوی کی تعریف میں جو کچھ کہا وہ سو فیصدی غلط ہے۔ فقیر دہلوی نے بھی حق دوستی ادا کیا اور والہ داغستانی کے معاشقہ کی داستان کو نظم میں قلمبند کیا جو مثنوی خدیجہ سلطان کے نام سے مشہور ہے اس مثنوی کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں جن سے والہ داغستانی کے مقام کا پتہ چلتا ہے۔

ای در فن عشق بازی استاد	مزدور کمینۂ تو فرہاد

---

[1] ریاض الشعراء [2] ریاض الشعراء

باشوکت او جہاں کم از ہیچ	با ہمتش آسماں کم از ہیچ
با رفعت پایۂ امیری	اندوختہ مایۂ فقیری
آں در فن شاعری یگانہ	در شعر بہ ساحری فسانہ
ای کشور نطق را تو سلطاں	اقلیم سخن ترا بہ فرماں
کیخسرو عرصۂ بیانی	کلک تو درفش کاویانی[1]

علی اکبر مشیر سلیمی نے یہ بات غلط لکھی ہے کہ فقیر دہلوی والہ داغستانی[2] کا شاگرد تھا کیونکہ والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں واضح طور پر لکھ دیا ہے کہ وہ اس کا قلبی دوست تھا۔ فقیر دہلوی نے اپنے وطن ہندوستان کی مدح میں بھی نہایت پرزور اشعار لکھے ہیں۔ راقم حروف چند شعر پر اکتفا کرتے ہیں۔

ہنداست انیس سینہ ریشاں	خاکش درمان دردکیشاں
از ہند آفاق را جمال است	بر روی زمیں بجای خال است
خوباں زمانہ را در وجا ست	مجموعۂ انتخاب دنیاست
در خاک وی است گنج عرفاں	چوں در ظلمات آب حیواں
ہنداست مرجع فضل	ہر شہری از دست مجمع فضل
یوسف زار است خاک دہلی	مصر آمدہ سینہ چاک دہلی[3]

تذکروں سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ فقیر دہلوی نے فریضۂ حج بیت اللہ ادا کیا تھا واپسی میں اس کی کشتی دریائے شور میں غرق ہوگئی اور وہ معبود حقیقی سے جاملا حسین قلی خاں کا بیان ہے کہ یہ واقعہ ۱۱۸۳ھ میں ہوا۔ آزاد بلگرامی اس سانحہ سے بہت متاثر ہوا اور ذیل کی تاریخ کہی جو نہایت دردناک ہے۔

---

[1] عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص ۲۹ [2] زناں سخنوراں جلد اول ص ۲۵
[3] عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص ۷۵، ۷۶ [4] نشتر عشق ورق ۱۳۸۹

رفت از عالم سخنوری شیریں ہای | خوابیدہ بہ خاک شاعری رنگیں ہای
آزاد نوشت مصرعہ تاریخش | گو، آہ فقیر میر شمس الدین ہای
۱۱۸۳ ھ

شاگردانِ فقیر دہلوی :-

(۱) عماد الملک غازی الدین خاں وزیر ہندوستان (۲) مرزا ابو علی ہاتف (۳) طالب علی عاشق (۴) مرزا ایجو (ذرّہ) (۵) گلشن علی جونپوری (۶) میر قمر الدین منت۔

تصنیفات فقیر دہلوی :-

(۱) مثنوی والہ و سلطان (۲) خلاصۃ البدیع (۳) تحفۃ الشباب (۴) در مکنون (۵) وافیہ فی علم العروض و القافیہ (۶) مثنوی شمس الضحیٰ (۷) دیوان

ڈاکٹر عبد الغفار انصاری[۲] نے لکھا ہے کہ اسی مثنوی والہ و سلطان کا ایک قلمی نسخہ تبریز میں آقای جعفر سلطان القرائی کے کتبخانہ میں ملا تھا اس نسخہ کا کاتب محمد رضا ہے جس نے ۱۱۶۰ھ میں شاہجہاں آباد (دہلی) میں کتابت کی تھی۔ اس نسخہ پر والہ داغستانی اور خدیجہ سلطان کی مہریں اور تحریریں ہیں۔ ایک صفحہ پر ذیل کا شعر بھی بہ دست والہ داغستانی مرقوم ہے۔

کہن شد قصۂ مجنوں حدیثِ دردِ من بشنو | بہر افسانہ عمرِ خود مکن ضائع سخن بشنو

نسخہ مذکور میں خدیجہ سلطان کے قلم سے بھی کچھ اشعار ہیں ذیل میں ایک رباعی پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

افسانۂ دردِ من اگر گوش کنی | از لیلی و داستانش خاموش کنی
در قصۂ عشق ایں عجم بشنوی | مجنون و حکایتش فراموش کنی

---

[۱] خزانہ عامرہ [۲] عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص ۴۳

اس نسخہ کے بعض اوراق پر ۱۱۶۰ھ، ۱۱۵۹ھ اور ۱۱۵۸ھ کی خدیجہ سلطان اور اس کے محبوب والہ داغستانی کی مہریں ثبت ہیں۔

مثنوی والہ و سلطان کا مخطوطہ خدا بخش لائبریری میں کیٹلاگ نمبر ۱۲ الم کے تحت ہے کل اوراق ۹۶ ہیں اور ہر صفحہ میں سترہ ۱۷ سطور ہیں۔ مسٹر بلاک مین کا دستخط ۱۸۷۶ء کے ساتھ ثبت ہے اس نسخہ میں تین ہزار دو سو تیس ۳۲۳۰ اشعار ہیں کاتب کا نام اور سال کتابت درج نہیں ہے۔

یہ بات قابل قدر ہے کہ مثنوی والہ و سلطان کا ترجمہ بزبان انگریزی ہو چکا ہے ڈاکٹر عبد الغفار الفاروقی[1] نے لکھا ہے کہ اس کو تہران میں آقای پروفیسر مجتبیٰ مینوی کے کتبخانہ میں بزبان انگریزی ایک مطبوعہ نسخہ ملا تھا جو ۱۹۰۲ء میں لندن میں شائع ہوا تھا یہ نسخہ ایک سو بتیس ۱۳۲ صفحات پر مشتمل ہے۔ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری میں بھی ڈاکٹر مذکور کو ایک نسخہ والہ و سلطان کا بزبان انگریزی ملا تھا جس کا ذکر اس نے اپنی کتاب میں کیا ہے مثنوی والہ و سلطان کا جو ترجمہ انگریزی میں ہوا ہے اس کتاب کا نام The story of valeh and Hadijah ہے

ذیل میں فقیر دہلوی کے کچھ اشعار بطور نمونہ درج کئے جاتے ہیں۔

زصاحب خانہ مہمان را بہ خود مشغول می سازد — تماشا کردہ ام بسیار ایں سقف منقش را

ز آمد آمد قاصد فقیر از خویشتن رفتم — چہ خواہم کرد اگر دلدار گردد ناگہاں پیدا

تا چند فقیر از حرم و دیر بگوئی — خلوت کدہ می حضرت یار است دل ما

نالہ می مرغ قفس می برد از کار مرا — کہ ازیں پیش دلی بود گرفتار مرا

ابوالحسن امیر الدین احمد[2] نے فقیر دہلوی کے ریختہ کا تین شعر اپنے تذکرہ

---

[1] عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص۵ [2] تذکرہ مسرت افزا ص۱۷۱، ۱۷۲۔

میں نقل کیا ہے ملاحظہ ہو۔

ترا منھ دیکھ بلبل گل سیتی بیزار ہو جائے
اگر گل تجھ تلک پہنچے گلے کا ہار ہو جائے

زنخ کی موج آب چشمہ گویا
دم کا لینا حباب ہے گویا

خال تیری بیاض گردن کا
نقطۂ انتخاب ہے گویا

٭

نواب نظام الملک آصف جاہ

نظام الملک کا نام قمر الدین اور آصف جاہ تخلص تھا۔ تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی ولادت ۱۰۸۲ھ میں ہوئی تھی۔ اس کا شمار ہندوستان کے جلیل القدر امیروں اور وزیروں میں ہوتا ہے۔ اس کی تربیت بادشاہ عالمگیر کے محل میں ہوئی تھی اس کا نسب نامہ شیخ شہاب الدین عمر سہروردی تک پہنچتا ہے اس کا دادا عابد خاں تھا۔ جنھوں نے حج بیت اللہ کے عزم سے ہندوستان کا سفر کیا تھا۔ انھوں نے بادشاہ عالمگیر سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا فریضۂ حج بیت اللہ سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ پھر ہندوستان آئے اور بادشاہ عالمگیر نے ان کو ایک بلند منصب پر سرفراز کیا میر شہاب الدین ان کا بیٹا تھا جس نے دکن کی لڑائی میں نہایت بہادری دکھائی تھی بادشاہ نے اس کو خوش ہو کر غازی الدین خاں فیروز جنگ کا خطاب مرحمت کیا تھا بادشاہ عالمگیر مانند شہزادگان اس سے الفت رکھتا تھا اس لئے انھوں نے سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں بادشاہ ہند کی دختر نیک اختر سے اس کی شادی کرائی تھی۔ قمر الدین (آصف جاہ) سعد اللہ خاں

---

[۱] مآثر الامراء جلد سوم ص ۸۷۶ [۲] ریاض الشعراء ورق ۲۷

وزیر کا نواسہ تھا بادشاہ عالمگیر نے اس کو بھی بہت لاڈ پیار سے رکھا جس کی وجہ سے لوگ اس پر رشک کرتے تھے عہد بہادر شاہی میں نظام الملک نے دنیا سے کنارہ کشی کر کے عزلت نشینی اختیار کر لی تھی مگر عہد فرخ سیر میں اس نے پھر دربار میں جگہ پائی اور فرخ سیر ہی نے اس کو نظام الملک کے خطاب سے نوازا تھا۔ بعدہٗ اس کو دکن کی صوبہ داری بھی عطا ہوئی۔ عہد محمد شاہی کے اوائل میں وہ دکن سے دہلی میں اقامت پذیر ہوا۔ محمد شاہ رنگیلے نے اس کو قلمدان وزارت بخشا اور آصف جاہ کے خطاب سے بھی نوازا لیکن دو تین سال ہی تک وزارت کے عہدہ پر رہنے کے بعد وہ دکن میں سکونت پذیر ہوا اس لئے قمر الدین خاں کو وزارت کا منصب عطا ہوا۔ تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سنہ ۱۱۶۱ھ میں وہ دکن میں بر سر اقتدار تھا اس کی صوبہ داری کے عہد میں دکن کے باشندگان فارغ البال اور مرفۃ الحال تھے۔ نظام الملک شریعت کا بہت پابند تھا اور اہل علم و فضل کے لئے اس کا خزانہ کھلا رہتا تھا آزاد بلگرامی کو سفر حج کا خرچ اس نے ہی مرحمت کیا تھا ملت اسلامیہ کے فروغ کے لئے اس کے دل میں بڑا درد تھا۔ امور سلطنت اور اصول حکمرانی میں وہ نہایت ماہر اور عدیم النظیر تھا۔ والہ داغستانی کا بیان ہے کہ خلائق دکن کو کشتیٔ نوحؑ سمجھتی تھی اور درماندہ لوگ اس کی خدمت میں گوہر مراد حاصل کرنے جاتے تھے[1]۔

آزاد بلگرامی کی شخصیت اپنے عصر میں ایک ممتاز شخصیت تھی۔ نظام الملک سے اس کے گہرے تعلقات تھے۔ اور وہ اس کا بہت احترام کرتا تھا اس کا بیان ہے کہ بادشاہ فرخ سیر نے نظام الملک کو سات ہزاری کا عہدہ بخشا تھا علاوہ ازیں مراد آباد اور مالوہ کی حکومت بھی اس کو عنایت ہوئی تھی سنہ ۱۱۵۶ھ میں اس نے ترچناپلی کے قلعہ کو مرہٹوں کے قبضہ سے مغلوں کے قبضہ میں لایا احمد خاں ابدالی سنہ ۱۱۶۱ھ میں دہلی

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۵۵

آنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ نظام الملک نے یہ خبر سننے کے بعد اورنگ آباد سے برہان پور کا سفر کیا۔ بالآخر محمد شاہ بادشاہ نے احمد خاں ابدالی کو شکست دی۔ نظام الملک اس زمانہ میں ایک مرض میں گرفتار ہو گیا اور ۲۷ جمادی الاولیٰ کو اورنگ آباد پہنچا اس نے برہان پور کے ایک خیمہ میں اقامت اختیار کیا اور اس کا مرض روز افزوں بڑھتا گیا یہاں تک کہ وہ جانبر نہ ہو سکا اور ۴ جمادی الآخر سنہ ۱۱۶۱ھ میں بوقت عصر معبود حقیقی سے جا ملا۔ اس کی وفات سے دکن ماتم کدہ بن گیا تھا۔ تذکروں میں مذکور ہے کہ جب نعش اس کا جنازہ لوگوں نے کاندھے پر رکھا خلائق نے ایسی آہ و زاری کی کہ ارض و سما کو زلزلہ آگیا۔ آزاد بلگرامی نے اس موقع پر ذیل کی تاریخ کہی۔

متوجہ بہشت[1]

۱۱۶۱ھ

محمد شاہ بادشاہ اور قمر الدین خاں وزیر بھی اتفاق سے اسی سال عالم باقی کو سدھارے شاہنواز خاں نے ان تینوں کے لئے ذیل کی تاریخ وفات کہی۔

سہ رکن مملکت ہند از جہاں رفتند | فتاد حیف سہ دندانہ از کف دہر
برای رحلت این ہر سہ یافتم تاریخ | نہ ماند شاہ زماں با وزیر و آصف جاہ

۱۱۶۱ھ

ماثر الامراء میں[2] مرقوم ہے نواب نظام الملک آصف جاہ، حضرت برہان الدین غریب علیہ رحمتہ کی قبر کے نزدیک مدفون ہوا۔ عرب ماوراء النہر، خراسان، عراق اور ہندوستان کے علماء، فضلا اور مشائخ اس کی سخاوت کا شہرہ سن کر دکن آتے تھے۔ اس نے شہر پناہ برہان پور کی چہار دیواری کاروان سرائے، مسجد اور پل بنوایا تھا۔ راقم حروف نے اس مقالہ میں نظام الملک کا ذکر اس لئے مناسب سمجھا کیونکہ وہ شاہ آفریں لاہوری کا ہمعصر تھا اور عمر میں آفریں لاہوری سے تقریباً ۹۔۱۰ سال چھوٹا تھا۔ لیکن کسی تذکرہ سے دونوں کی ملاقات کا ثبوت نہیں ملتا ہے البتہ ایک

---

[1] سرو آزاد مطبوعہ ۱۷۳ [2] ماثر الامراء صہ ۸۸۲ جلد سوم

ایرانی شاعر اور تذکرہ نگار والہ داغستانی نے کئی بار نظام الملک سے ملاقات کی تھی اور اس کی مدح میں ذیل کی رباعیاں بھی کہی تھیں۔

زاں باد کہ از دکھن بہ من می آید | گوئی تو کہ جان مرا بہ تن می آید
خوش آنکہ رسد بہ گوش جانم والہ | ایں مژدہ کہ آصف از دکھن می آید

آصف بہ خدا بدرت نہ جویم ہرگز | جز راہ محبتت نہ پویم ہرگز
جز عطر عنایتت نہ بویم ہرگز | جز مدح تو مدح کس نہ گویم ہرگز[1]

آصف جاہ کے انتقال کے ایک مدت بعد اس کے پوتے عماد الملک غازی الدین خاں نظام نے والہ داغستانی کی بیٹی گنا بیگم سے شادی کی تھی جو اردو اور فارسی میں شعر کہتی تھی[2]۔

والہ داغستانی بھگوان داس ہندی اور قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ نظام الملک کا اوائل میں شاکر تخلص تھا مگر آصف جاہ کا خطاب ملنے کے بعد اس نے اپنا تخلص آصف رکھا۔ والہ داغستانی رقمطراز ہے کہ اس نے جوانی کے اوائل ہی سے شعر کہنا شروع کیا تھا اور اس کا دیوان کافی ضخیم ہے نمونہ کلام ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں

تماشای جمال یار دیدن آرزو دارم | چو اشک خود بکوی او دویدن آرزو دارم
از کوشش بیہودہ میرسید ز شاکر | عمریست کہ می نالد و تاثیر ندارد

آہ درد آلود می باید مرا | نغمۂ داؤد می باید مرا
تارخ آں ماہ تاباں بنگرم | طالع مسعود می باید مرا[3]

---

[1] دیوان والہ داغستانی رامپور ورق ۔ [2] عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص ۲۹

شیخ محمد علی حزیںؔ

تذکروں میں ان کا نام شیخ محمد علی اور حزیںؔ تخلص مرقوم ہے۔ ان کا نسب نامہ شیخ زاہد گیلانی سے اٹھارہویں پشت میں جا ملتا ہے واضح ہو کہ شیخ زاہد گیلانی شیخ صفی الدین کے پیر و مرشد تھے شیخ حزیں کو لاہیجی بھی کہا جاتا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ مدت مدید تک ان کے اسلاف لاہیجان میں سکونت پذیر تھے۔

علی قلی خاں والہ داغستانی کا بیان ہے کہ شیخ حزیں کی ولادت ۱۱۰۳ھ میں ایران کے شہر اصفہان میں ہوئی ان کے جد سوم شیخ [illegible] تھے۔ تذکروں [illegible] سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ شیخ حزیں کے والد محترم کسب علم کے مقصد سے بعمر بیس سال اصفہان آئے تھے اور وہیں ازدواج کر کے مقیم ہو گئے تھے حزیں سے چھوٹے بھی دو بھائی تھے ان کی والدہ نے بھی ان کے پدر بزرگوار کی رحلت کے دو سال بعد وفات پائی۔[1]

شیخ حزیں کے ہمعصر ایرانی تذکرہ نگار اور شاعر والہ داغستانی نے ان کی بڑی تعریف کی ہے یہ بات ظاہر کرنا اس جگہ بے مناسب نہ ہوگا کہ والہ داغستانی شیخ حزیںؔ کا ہموطن اور معتقد تھا اس لئے اس کے بیان کی بہت اہمیت ہے کہ شیخ حزیںؔ مختلف علوم میں قدرت رکھتے تھے۔ فن انشا میں باکمال اور سخندانی میں دنیا میں مشہور تھے۔

"الحق امروز سخندانی مثل او روی زمین وجود نہ دارد، پایۂ سخن

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۱۰۳

را بجائے رسانیدہ کہ شہباز اندیشہ در تصور رفعتش پر میریزد[1]"

حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس کی ملاقات شیخ حزیں سے دو مرتبہ بنارس میں ہوئی تھی اس نے ان کی صحبتوں سے استفادہ کیا تھا اور ان کے ہاں کھایا پیا تھا۔ اس کا بیان ہے کہ شیخ حزیں اس زمانہ میں ہندوستان اور ایران میں شہرت رکھتے تھے اور ان کے مثل کوئی نہ تھا ان کی زبان صاف اور رواں تھی اور نہایت صاحب مذاق تھے۔

"حالات و کمالاتش چہ نویسم کہ در ہندوستان و ایران اشتہار
تمام دارد دریں عصر نظیر خودی نیست، بسیار صاحب مذاق است و
زبانش طرفہ صفا و روانی دارد[2]"

آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ شیخ حزیں فن سخنوری میں مرتبۂ ارجمند اور علوم عقلی و نقلی میں بلند پایہ رکھتے تھے۔ ان کے اشعار لولو کی طرح چکدار اور ان کی زبان آب زلال کی طرح صاف و شفاف تھی اس نے شیراز میں محمد مسیح فسائی سے علم طبیعات، الٰہیات، منطق، سیاست اور حساب پڑھا تھا اور ملا شاہ محمد شیرازی سے کتاب حکمت العین اور احادیث نبوی کا درس لیا تھا۔[3]

منشی غلام حسین خاں کا بیان ہے کہ شیخ حزیں کا چرچا ساری دنیا میں تھا اور ان کی کتابیں دنیا میں شہرت رکھتی ہیں خصوصاً ملک ہندوستان میں اس عہد میں ان کا ثانی کوئی نہ تھا عرب اور عجم کے ناقدوں نے بھی علوم ظاہری و باطنی میں ان کو بے نظیر لکھا ہے۔ ان کو جامع حقائق، معارف نامتناہی اور آیات الٰہی کی نشانی کہا گیا ہے قدرت حافظ اور عدد کہ میں قدما میں بھی شاید کوئی ان کا ہم پایہ ہوگا محمد شاہ رنگیلے نے ان کو قلمدان وزارت سپرد کرنا چاہا تھا لیکن چونکہ وہ جاہ و منصب

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۱۰۳ [2] مردم دیدہ ص ۶۶ [3] خزانہ عامرہ ورق ۱۸۵

سے برطرف رہتے تھے اس لئے انھوں نے انکار کیا تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ عظیم آباد (پٹنہ بھی) کئی بار تشریف لائے تھے ذیل میں منشی غلام حسین کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"عمدۃ العلماء العظام وزبدۃ الحکماء الکرام کاشف الحقائق الخفی والجلی خاتم الحکماء المتہالین دمولانا وشیخنا الحماء المدعو بہ علی المتخلص بہ حزیں اعلی اللہ مقامہ"[1]

بندرابن داس خوشگو نے بنارس میں حزیں سے ایکبار ملاقات کی تھی اس کا بیان ہے کہ شیخ حزیں گویا ایک فرشتہ تھے۔ اور عشق الٰہی میں غرق تھے۔ صوفی اور گوشہ نشین تھے اور کوئی شخص اگر کوئی چیز دیتا تو اسے لینا پسند نہیں کرتے اس لئے عوام میں یہ بات مشہور تھی کہ ان کو دست غیب حاصل تھا سارکان ایران بھی اس عہد میں پیرو مرشد کی مانند ان کی تعظیم کرتے تھے۔ نواب عمدۃ الملک امیر خاں انجام کو بھی ان سے بڑی عقیدت تھی۔[2]

ایرانی تذکرہ نگار رضا قلی خاں ہدایت شیخ حزیں کے بارے میں رقمطراز ہے

"نامش شیخ محمد علی واز احفاد شیخ زاہد گیلانی بہ ہندوستان رفتہ معزز زیست"[3]

ڈاکٹر ذبیح اللہ کی رائے ملاحظہ ہو۔

"سخن او متوسط و مقرون بہ سادگی و روانی و حد فاصلیست بین میان شیوۂ سخن شاعران قدیم و شیوہ ی کہ بسبک ہندی معروف است"[4]

والہ داغستانی اور آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ شیخ حزیں نے ۱۱۴۳ھ میں

---

[1] سیر المتاخرین جلد دوم ص ۶۱۵ [2] سفینۂ خوشگو ص ۲۹۱ [3] مجمع الفصحاء جلد دوم ص ۲۱۰
[4] گنج سخن جلد سوم ص ۱۳۲

فریضۂ حج ادا کیا انھوں نے خراسان، آذربائیجان، عراق اور فارس کا سفر کیا اس کے علاوہ خرم آباد، ہمدان، دزفول، نہاوند، کرمان شاہ، مشہد، بغداد، کردستان، گیلان اور تہران کی بھی سیاحت کی تھی[1]۔ شیخ حزیں نے خود لکھا ہے کہ اس نے سنہ ۱۱۴۶ھ میں سفر ہندوستان کے لیے حرکت کی تھی اور سندھ کے ساحل پر وہ سنہ ۱۱۴۶ھ میں پہنچے تھے۔ بعدہٗ انھوں نے دو مہینے سے زیادہ ٹھٹھہ میں قیام کیا پھر خدا آباد (لڑکانہ) بعد ازاں بھکر میں ایک مہینہ تک رہے۔ اس کے بعد ملتان میں قریباً دو سال تک قیام رہا پھر وہاں سے دہلی، آگرہ اور عظیم آباد میں بھی کچھ دنوں تک مقیم رہے اور آخر میں انھوں نے بنارس میں سکونت اختیار کی تھی آزاد بلگرامی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۴۷ھ میں بمقام بھکر شیخ سے اس نے شرف ملاقات حاصل کی تھی[2]۔ والہ داغستانی کی ملاقات شیخ سے ایران ہی سے تھی اس نے لکھا ہے کہ شیخ لار میں مقیم تھے کہ انھوں نے ولی محمد خاں شاملو کے مقتول ہونے کی خبر سنی جو نادر شاہ منصب دار تھا قصہ یہ ہے کہ شہر مذکور کے کچھ لوگوں نے میرزا باقر کلانتر کی رہنمائی میں بوقت صبح ولی محمد خاں شاملو کو قتل کر دیا تھا لیکن ولی محمد کے قتل کا الزام شیخ حزیں پر لگایا گیا اس لیے محمد تقی خاں مشہدی رضوی بیگلربیگی کو حکم نافذ ہوا کہ وہ شیخ کو گرفتار کرے والہ داغستانی اس موقع پر کرمان میں تھا اس نے کسی طرح حکومت کے ذمہ دار افسروں کو سمجھا کر شیخ کو گرفتار ہونے سے محفوظ رکھا۔ بعدہٗ ان کو اپنے ہمراہ لیتا ہوا بندر عباس پہنچا اور اسی بندرگاہ سے بذریعہ کشتی شیخ ہندوستان کے لیے روانہ ہوئے اور دس دنوں کے بعد سمندری سفر طے کر کے شیخ ٹھٹھہ پہنچے تھے[3]
والہ داغستانی بھی سنہ ۱۱۴۶ھ میں ہندوستان آیا تھا اس نے چونکہ شیخ کی محافظت

---

1. A Literary History of Persia vol IV P. 281

2. خزانہ عامرہ ورق ۱۴۵ 3. ریاض الشعراء ورق ۱۰۳، ۱۰۴

کرمان میں کی تھی اس لئے دونوں کے درمیان الفت اور محبت بڑھ گئی تھی تذکروں میں مذکور ہے کہ بہ عمر سات سال شوکت بخاری کے تتبع میں حزیں نے ایک غزل قلمبند کیا تھا۔ شیخ حزیں نے کم عمری میں محتشم کاشی کے ذیل کے مطلع کے جواب میں شعر کہا تھا۔

ای گردن بلندقباں در کمند تو   رعنای آفریدہ قد بلند تو

حزیں نے جواب میں ذیل کا شعر کہا تھا۔

صید از حرم کشد خم جعد بلند تو   فریاد از تطاول مشکیں کمند تو

مولانا حسن نے خوشی میں اس موقع پر شیخ کی پیشانی کو بوسہ دیا تھا۔ مصحفی نے لکھا ہے کہ شیخ کے پدر بزرگوار نے اسی زمانہ سے ان کو شاعری کرنے کی اجازت دیدی تھی شیخ حزیں کو محمد شاہ رنگیلے نے کسی موقع پر پانچ لاکھ روپئے مرحمت کیا تھا عمدۃ الملک امیر خاں انجام کی سفارش سے محمد شاہ نے چالیس ہزار روپئے کی سالانہ جاگیر شیخ کو عنایت کی تھی۔

۱۱۵۱ھ میں بعہد محمد شاہ نادر شاہ کی آمد کی خبر ہندوستان میں گرم تھی۔ شیخ حزیں اس خبر سے خوفزدہ ہوئے اور لاہور سے دہلی پہنچے اور والہ داغستانی کے دولت کدہ میں روپوش ہو گئے کیونکہ ان کو ڈر تھا کہ کہیں نادر شاہ، ولی محمد خاں شاملو کے قتل کے الزام میں قتل نہ کر ڈالے آزاد بلگرامی نے بھی اپنے تذکرہ میں شیخ کے گوشہ نشین ہونے کا ذکر کیا ہے[1]۔ کچھ دنوں کے بعد نواب زکریا خاں صوبہ دار لاہور نے بھی حزیں کو نقصان پہنچانا چاہا تھا اس موقع پر بھی والہ داغستانی نے شیخ کو دہلی بلوالیا تھا۔ والہ داغستانی کو جیسا کہ قبل بھی راقم تروف نے لکھا ہے کہ شیخ حزیں سے بڑی الفت اور عقیدت تھی اس لئے اس نے اپنے تذکرہ میں ان کی نہایت تعریف کی ہے اور ان کی

---

[1] خزانہ عامرہ ورق ۱۲۶

طرح میں اس کے دیوان میں دو قصیدے بھی ملتے ہیں جن میں شیخ کی بیحد تعریف کی گئی ہے ذیل میں دونوں قصیدہ سے شعر نقل کئے جاتے ہیں۔

از جادوی مخمور تو شرمندہ نرگس در چمن — پیش قد دلجوی تو محجوب سرو نازدن
من والۂ زردی تو ام آشفتہ موی تو ام — کم تر سگ کوی تو ام بر گرد دمم افگن رسن

دوسرے قصیدے کا تین شعر ملاحظہ ہو

ای بہ رخ عزت مہ و خورشید — پیش رویت کم از سہا ناہید
ہم چو مو گشتہ ام ضعیف و نزار — بس کہ جسمم ز دوریت کاہید
ہیچ از دوستاں نہ می پرسی — چند بتیاں ز دشمناں پرسید[1]

ہندوستان کے عوام اور امراء شیخ حزیں کی نہایت عزت اور احترام کرتے تھے لیکن ایک موقع پر شیخ نے یہاں کے امراء اور عوام کے ہجو میں نہایت پست اشعار کہے۔ والہ داغستانی چونکہ بادشاہ کا نمک خوار تھا اس لیئے اس نے شیخ سے ترک تعلق کر لیا۔ اپنے تذکرہ میں والہ داغستانی نے اہل ہندوستان کے اخلاق کی بہت تعریف کی ہے کیونکہ یہاں کے عوام و امراء نے کوئی بدلہ نہیں لیا مگر سراج الدین خاں آرزو نے شیخ کے دیوان سے کافی تعداد میں غلط اشعار جمع کیا اور تنبیہ الغافلین نام کی کتاب میں ان اشعار پر تبصرہ کیا اس طرح خان آرزو نے شیخ کو دانشوروں اور اہل نظر کی نظروں سے گرا دیا۔ آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ اہل ہند کی ہجو نظم کرنے کے بعد شیخ کے لئے دہلی میں رہنا مناسب نہ تھا اس لیئے آگرہ اور پٹنہ کا سفر کرنے کے بعد بنارس میں اقامت پذیر ہوئے حاکم لاہوری نے بنارس ہی میں ان سے شرف ملاقات حاصل کیا تھا۔ آزاد بلگرامی اور غلام حسین کا بیان ہے کہ شیخ نے بنارس ہی میں ۱۱۸۰ھ میں وفات پائی آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق ۱۱ رجمادی الاول ۱۱۸۰ھ کی شب میں

---

[1] عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص ۱۵۱، ۲۰۴/۱۵۲

شیخ معبود ازنی سے جاملے اور جو قبر انھوں نے اپنی زندگی میں اپنے لئے تعمیر کرائی تھی اسی میں دفن کئے گئے آزاد بلگرامی نے اس موقع پر ذیل کی تاریخ کہی تھی۔

علامۂ عصر و شاعر خوب	افسوس کہ از میانہ برخاست
تاریخ وفات او نوشتم	از فوت حزیں حزیں دل ماست

ڈاکٹر عبد الغفار انصاری نے لکھا ہے کہ وہ شیخ حزیں کے مزار پر گیا تھا اور اس نے ان کے لوح مزار پر ذیل کے اشعار مرقوم پایا۔ غلام حسین خاں اور عبد المقتدر کا خیال ہے کہ حزیں نے اپنے دست خاص سے اپنے لوح مزار کے لئے ذیل کے اشعار لکھے۔

زبان دانِ محبت بودہ ام دیگر نمی دانم	ہمیں دانم کہ گوش از دوست پیغامی شنید اینجا
حزیں از پای رہ پیما بسی سرگشتگی دیدم	سر شوریدہ بر بالیں آسائش رسید اینجا
روشن شد از وصال تو شب ہای تار ما	صبح قیامت است چراغ مزار ما

ڈاکٹر عبد الغفار انصاری نے راقم حروف سے کہا کہ شیخ حزیں کی قبر سے متصل نیم کا ایک پرانا درخت ہے جس کا پتہ کھانے پر تلخ نہیں معلوم ہوتا ہے شیخ کی قبر بنارس میں جس جگہ ہے وہ فاطمان کے نام سے مشہور ہے۔

شاگردان شیخ حزیں:۔

(۱) راجہ رام نرائن موزوں صوبہ دار عظیم آباد (پٹنہ) (۲) گلشن علی جونپوری (۳) آغا طاہر شیرازی (۴) ملا باقر شہید

تصنیفات شیخ حزیں:۔

(۱) تین دیوان (۲) تذکرۃ الاحوال مشہور بہ تاریخ ایران حزیں تالیف ۱۱۵۴ھ (۳) تذکرۃ المعاصرین تالیف ۱۱۶۵ھ (۴) رسالہ ابرام در بیان قضا و قدر و خلق اعمال۔

۱؎ خزانہ عامرہ ورق ۱۵۰ ۲؎ عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء ص ۱۷

ذیل میں شیخ کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں۔

درین دریای بی پایان درین طوفان شور افزا ‌ ‌ ‌ دل افگندیم بسم اللہ مجریہا و مرسہا

جنوں را کار ہا باقیست با مشت غبار ما ‌ ‌ ‌ کہ بازی گاہ طفلاں می شود خاک مزار ما

آں بلبلیم کہ می گذرانیم بہ زیر بال ‌ ‌ ‌ ایام شادمانی گلزار خویش را

در باغ کسی نہ کند فہم صفیر ‌ ‌ ‌ ایں زمزمہ آں مرغ شناسد کہ اسیر است

سید محمد میر سوز

سید محمد میر نام اور سوز تخلص تھا اس کے والد کا اسم گرامی میر ضیاء الدین تھا۔ اس کا نسب نامہ شاہ قطب عالم تک پہنچتا ہے تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کے اسلاف کا وطن بخارا تھا لیکن اس کی ولادت دہلی میں ہوئی سال ولادت کا پتہ نہ چل سکا لیکن اندازہ ہے کہ ۱۱۳۳ھ کی حدود میں ولادت ہوئی ہوگی۔ وہ خاندانی طور پر ایک اچھا تیر انداز اور شہسوار تھا ورزش سے اسے بڑی دلچسپی تھی سپہ گری میں بھی مشتاق تھا۔ خوشنویسی میں وہ معاصرین میں ایک بلند مقام رکھتا ہے۔ خط نستعلیق، خط نسخ اور شفیعا میں ماہر تھا تذکروں میں مذکور ہے کہ وہ عہد جوانی میں عاشق مزاج اور رنگین تھا اس کے عہد میں احمد شاہ ابدالی نے کئی بار حملے کیے شاہ عالم بادشاہ کے دور سلطنت میں عوام خستہ حال تھی مگر میر سوز جیسا صوفی منش شاعر نہایت بے فکری اور بے پروائی سے اپنی زندگی گذار رہا تھا۔ گرچہ مالی طور پر پریشان تھا۔

میر سوز ایک پختہ اور کہنہ مشق شاعر تھا۔ عماد الملک غازی الدین خاں نظام

نے اس کی شاعری سے متاثر ہو کر اپنی اہلیہ گنا بیگم کو اس سے اصلاح لینے کا حکم دیا تھا۔[1]

احمد خاں بنگش والیٔ فرخ آباد شعراء کا سرپرست اور مربی تھا۔ احمد شاہ ابدالی کے پیہم حملوں کے باعث دہلی کے لوگ پریشان ہو گئے اور بہت سے شعراء احمد خاں بنگش کے یہاں فرخ آباد چلے گئے میر سوز بھی اس زمانہ میں وہاں چلا گیا تھا۔ نواب مہربان خاں[2] رند احمد خاں بنگش کا دیوان تھا اور اس نے میر سوز کی بہت تعظیم و تکریم کی۔ میر سوز ایک مدت تک فرخ آباد میں رہا بعد ازاں وہ لکھنؤ پہنچا۔ نواب آصف الدولہ میر سوز پر نہایت مہربان ہوا اور اس کی کفالت کی لیکن سوز کی طبیعت وہاں نہیں لگی اس لئے کچھ عرصہ کے بعد وہ مرشد آباد پہنچا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مرشد آباد میں بنگالہ کے نوابوں کا شہرہ تھا مگر وہاں بھی سوز کا دل اداس رہا اس لئے اسی سال وہ لکھنؤ لوٹ گیا۔

تذکروں سے یہ پتہ چلتا ہے کہ نواب آصف الدولہ نے شرف تلمذ حاصل کیا تھا مگر سوز لکھنؤ میں زیادہ مدت تک نہ رہ سکے اور داعی اجل کو لبیک کہا۔ ولیم تامس بیل رقمطراز ہے کہ میر سوز نے بہ عمر اسّی سال ۱۲۱۳ھ میں وفات پائی۔ مگر مصحفی نے لکھا ہے کہ ستر برس کی عمر میں اس نے عالم بقا کی طرف کوچ کیا۔ ناسخ نے اپنے تذکرہ میں سوز کی عمر اسّی برس تحریر کیا ہے اور جائے وفات لکھنؤ بتایا ہے۔

ڈاکٹر محمد قمر الدین نے لکھا ہے کہ سوز نہایت بلند طبع، خلیق، شیریں زبان، ظریف، ملنسار اور وضع دار تھا۔ سوز کے دیوان میں غزلیں، مثنویاں، مخمس اور رباعیاں بھی ہیں اس کی زبان بہت زیادہ سادہ اور تکلف سے خالی ہے اس کے اشعار میں شیرینی کا لطف بھی ملتا ہے وہ زبان اردو کا ایک نامور شاعر تھا اس کے فارسی اشعار دستیاب نہیں ہیں۔ شاید اس نے فارسی میں کچھ نہیں کہا۔ راقم حروف

---

[1] تذکرہ نسوان ص ۱۷۰، تذکرہ شاعرات اردو ص ۱۴۹

[2] احوال و افکار و آثار عماد الملک غازی الدین خاں نظام ص ۲۵۲

نے سوز کا ذکر کرنا اس لئے مناسب سمجھا کیونکہ وہ شاہ آفریں لاہوری کے معاصرین میں سے تھا اگرچہ عمر میں تقریباً پچاس سال چھوٹا تھا سوز کے اشعار میں محاورے کی صفائی اور بے ساختگی بھی ہے۔ دور از کار استعارات، تشبیہات مبالغے اور صنائع بدائع خال خال اس کی شاعری میں ملتے ہیں اس کی زبان میں جو سادگی اور صفائی ہے وہ ہم میر تقی میر کے یہاں پاتے ہیں مگر اس وصف میں سودا اس کے مقابل نہیں۔ سوز کے اشعار میں سودا اور میر کی طرح فارسی ترکیبیں اور فارسی کے الفاظ نہیں ملتے۔ اس کے یہاں ہندی کے سیدھے سادے الفاظ ملتے ہیں اور مکالمہ کا رنگ ملتا ہے۔ چونکہ اس کے اشعار میں بیحد سادگی ہے اس لئے وہ ایک دور قبل کا سخنور معلوم ہوتا ہے اس کے اشعار پڑھنے کا انداز بھی جداگانہ تھا نہایت ترنم اور گہرے درد کے ساتھ اشعار سناتا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ ایکٹنگ بھی کرتا تھا مثلاً ہاتھ، آنکھ، گردن اور کبھی کبھی ناک کو بھی جنبش دیتا تھا مولانا محمد حسین آزاد نے لکھا ہے کہ مشاعرہ میں مندرجہ ذیل قطعہ پڑھنا شروع کیا تو چوتھا مصرع پڑھتے پڑھتے زمین پر لڑھک گیا اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ نقالی کے ساتھ اشعار پڑھنے میں مہارت رکھتا تھا۔

گئے گھر سے جو ہم اپنے سویرے — سلام اللہ خاں صاحب کے ڈیرے
وہاں دیکھے کئی طفل پری رو — ارے رے رے ارے رے رے ارے رے[1]

مرزا علی لطف نے لکھا ہے کہ میر سوز اپنے اشعار میں عاشقانہ رنگ پیدا کرنے میں کمال رکھتا تھا علاوہ ازیں اس کے کلام میں سوز و گداز بھی ملتے ہیں اول اس کا تخلص میر تھا بعد ازاں اس نے سوز تخلص اختیار کیا اس کے مندرجہ ذیل شعر سے اس کے دونوں تخلص کا پتہ چلتا ہے۔

کہتے تھے پہلے میر میر تب نہ ہوئے ہزار حیف — اب جو کہیں ہیں سوز سوز یعنی سدا جلا کرو[2]

---

[1] تاریخ ادب اردو رام بابو سکسینہ، صہ ۱۲۵، ۱۲۶

سوز کا اردو شاعری میں ایک اونچا مقام ہے گرچہ وہ سودا اور میر کا ہم پلہ نہ تھا مگر غزل گوئی میں استاد کا مقام رکھتا تھا اس کا کلام سوز و گداز سے پر ہے اور اس کے شاگردوں کے کلام میں بھی سوز و گداز ملتے ہیں۔ عماد الملک نظام کی بیگم گنا بیگم نے اس سے اصلاح لی تھی جس کا کلام سوز و گداز کا مرقع ہے۔

شب کو طلب میں تیری یہاں ہم بھٹک بھٹک
چوں حلقہ ہم تو رہ گئے سر کو پٹک پٹک

میری بھی مشت خاک کا ٹک پاس ہے ضرور
اے جامہ زیب چلیو نہ دامن جھٹک[1]

شیخ گلشن علی جونپوری

گلشن علی نام اور تخلص بھی گلشن تھا اس کی زندگی کے احوال بہت کمیاب ہیں لچھمی نرائن شفیق نے اپنے تذکرہ میں گلشن کے مختصر حالات قلمبند کیا ہے اس نے لکھا ہے کہ اس کے حالات اس کو میر غلام حیدر سے حاصل ہوئے اور میر مذکور نے گلشن علی کو خط لکھ کر اس کے احوال طلب کیا تھا۔ لچھمی نرائن شفیق کا بیان ہے کہ گلشن علی نسلاً انصاری تھا اور اس کے اسلاف تقریباً سات آٹھ پشت سے جونپور میں سکونت پذیر تھے ۱۱۷۱ھ میں اس نے عالم فانی میں آنکھ کھولی اس حساب سے وہ عمر میں شاہ آفریں لاہوری سے تقریباً چوالیس سال کم تھا۔ اس کے والد کا نام شیخ نظام اللہ تھا اس نے اپنے پدر بزرگوار سے ابتدائی تعلیم پائی۔ اس کے والد فارسی زبان کی اچھی صلاحیت رکھتے تھے اس لئے اس نے اپنے بیٹا کو فارسی زبان کی اچھی تعلیم دی تھی عربی کتابیں میر محمد عسکری سے اس نے پڑھی جو اپنے دور کے ایک جید عالم تھے۔

---

[1] مسرت افزا ص ۲۳۸

گلشن علی اپنی زندگی کے اوائل حصے میں بہ تلاش ملازمت جونپور کے گرد و نواح میں سرگرداں رہا لیکن ۱۱۴۳ھ میں جب کہ اس کی عمر صرف ستائیس [۲۷] سال تھی وہ دہلی چلا گیا وہاں اس نے میر محمد افضل ثابت الہ آبادی سے شرف تلمذ حاصل کیا۔ جب ثابت الہ آبادی نے رحلت کی تو گلشن نے میر شمس الدین فقیر کو اپنا استاد بنایا اور اپنی شاعری میں رنگ، روغن پیدا کیا یہ بات واضح ہو کہ فقیر دہلوی اپنے عصر کا ایک باکمال فارسی شاعر تھا اور جب استاد ایسا مقام رکھتا ہو تو پھر شاگرد کو فیض کیسے نہ حاصل ہو۔ گلشن نے بعدہٗ نواب شیر افگن خاں باسطی کے یہاں چوبیس سال تک ملازمت کی۔ وہ نہایت خوشخط لکھتا تھا اور اس فن کو انھوں نے اپنے عصر کے نامور خطاط شیخ علی حزیں سے سیکھا تھا لہذا اس نے شیخ کے دیوان کو دو بار نقل کیا تھا۔ شیخ حزیں اس کی کتابت سے بہت خوش تھے اس میں کوئی شک نہیں کہ گلشن علی خط نستعلیق اور ثلث میں ماہر تھا اس کے دست خاص سے مرقوم ریاض الشعراء کا ایک نسخہ کیٹلاگ نمبر ۲۲۲ کے تحت خدا بخش لائبریری میں موجود ہے راقم حروف کو اگر موقع ملا تو اس کا عکس ضرور پیش کرے گا۔

گلشن علی نے علی قلی خاں والہ داغستانی کے یہاں چار سال تک ملازمت کی تھی ڈاکٹر ریو نے لکھا ہے کہ والہ داغستانی کی رحلت کے بعد گلشن علی کو دہلی چھوڑنا پڑا اور وطن چلا آیا۔ گلشن علی شاعر بھی تھا اور اس نے ایک مثنوی بنام صورت حال لکھی ہے جو برٹش میوزیم لندن میں موجود ہے راقم حروف کو ہندوستان کے کسی کتبخانہ میں اس کا نسخہ نہیں ملا۔ ڈاکٹر عبد الغفار انصاری نے راقم حروف کو یہ بات بتائی کہ مثنوی صورت حال کا کوئی نسخہ اس کو ایران میں بھی نہیں ملا گلشن علی کی شاعری میں بڑا درد اور سوز پایا جاتا ہے راقم حروف کو اس کا دیوان بھی دستیاب نہیں ہوا اور نہ تو لندن اور ہندوستان کے کسی کتب خانہ میں ہے غالباً وہ صاحب دیوان

نہیں تھا۔ ڈاکٹر عبد الغفار انصاری کو گلشن علی جونپوری کا لکھا ہوا ایک مرثیہ آزاد لائبریری علی گڑھ میں ریاض الشعراء کے اوراق پر لکھا ہوا ملا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی صاحب نے جس کو یہ مرثیہ کہیں ملا تھا اس نے ریاض الشعراء کے صفحات پر لکھ دیا۔ ذیل میں یہ مرثیہ نقل کیا جاتا ہے تاکہ اہل علم کو گلشن علی کے شاعرانہ محاسن کا اندازہ ہو سکے۔

واحسرتا کہ خورشید پنہاں زدیدہ باشد — روی زمیں سیہ گشت پشت فلک دوتا شد

سلطان کشور جاں یعنی علی قلی خاں — خالیست بارگاہش ای دوستاں کجا شد

از چشم جوہر تیغ در ماتمش چکد خوں — کاں شیر بیشہ صید از کف قضا شد

آنکس کہ می زدی جوش دریای دانش از وی — ہمچوں حباب آخر در یک نفس فنا شد

آنکس کہ می نماید خوابش بفرش مخمل — در خاک چوں بیاسود آہ ای چہ ماجرا شد

آنکس کہ بود با ما چوں بلبلاں غزلخواں — ناگہ غبار تن شد ...... بر ہوا شد

دیوان شعر از بس دیوانہ گشت بے او — پر شور ہمچو زنجیر ہر سطر صفحہا شد

ای خاک بندہ اکنوں صد طعن بر سخن زن — ایں رہ کہ در تو پنہاں آں لعل بے بہا شد

سال وصال اور از یں گونہ گفت گلشن — با درد و عشق و الہ از یں جہاں جدا شد

۱۱۷۶ ھ

مرزا محمد رفیع سودا دہلوی

محمد رفیع نام اور سودا تخلص تھا۔ اس کے آباؤ اجداد کابل کے ایک جلیل القدر خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ اس کے پدر بزرگوار مرزا محمد شفیع تجارت کے مقصد سے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت اختیار کی مولانا محمد حسین آزاد کے بیان کے

مطابق سودا کی ولادت ۱۱۲۵ھ میں بمقام دہلی ہوئی اس کے تخلص کے متعلق تذکروں میں مختلف باتیں درج ہیں کسی نے لکھا ہے کہ چونکہ عاشق مزاج تھا اس لیے سودا تخلص رکھا بعض کا خیال ہے کہ اس کے والد سوداگر تھے اس لیے سودا تخلص اختیار کیا راقم حروف کو اس کے تخلص سے کوئی مطلب نہیں ہے کہ کس مقصد سے اس نے سودا تخلص رکھا تھا اصل بات یہ ہے کہ اس کی شاعری کا کیا مقام ہے یہی جاننا ہے رام بابو سکسینہ کا خیال ہے کہ سودا سخنوری کے ملک کا شہنشاہ تھا اور اردو شاعری میں انوری وخاقانی کا ہم پلہ تھا۔ عمر میں وہ شاہ آفریں لاہوری سے تقریباً باون سال چھوٹا تھا کسی تذکرہ سے یہ بات معلوم نہ ہو سکی کہ دونوں میں کبھی ملاقات ہوئی تھی یا نہیں مگر چونکہ دونوں ایک صدی کے شاعر تھے اس لیے راقم حروف نے اپنے مقالہ میں اس کا ذکر کرنا ضروری سمجھا سودا کی شہرت اردو شاعری میں محتاج تعارف نہیں وہ قصیدہ گوئی میں ید طولیٰ رکھتا تھا اور اس فن میں کوئی شاعر اس کا مقابل نہیں مصطفیٰ خاں شیفتہ اور ابوالحسن امیرالدین احمد کا بیان ہے کہ ایک نہایت زوردار قصیدہ عماد الملک نظام کی تعریف میں اس نے کہا تھا کئی تذکروں میں اس قصیدہ کی تعریف لکھی گئی ہے اس کے علاوہ ایک اور قصیدہ بھی اس نے نظام الملک کی مدح میں لکھا تھا بھگوان داس ہندی کا بیان ہے کہ سودا کو عماد الملک نظام نے ایک مناسب منصب بخشا تھا۔

ابوالحسن امیرالدین احمد نے سودا کے ایک قصیدہ کی نہایت تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس نے اس قصیدہ میں ایسی صنعتوں کو پیش کیا ہے کہ اشعار اعجاز کو پہنچ گئے ہیں۔ ذیل میں اس قصیدہ کا مطلع نقل کیا جاتا ہے۔

لے سفینہ ہندی ص ۱۰۵

صبح ہوتے جو گئی آج میری آنکھ جھپک ۔۔۔ دی خوشی نے وہیں آکر دلِ پُردرد کو تک[1]

مصطفیٰ خاں شیفتہ نے بھی قصیدۂ مذکور کی بڑی تعریف کی ہے اس کا بیان ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔

"مرزا رفیع سودا اور اشنا گستر است قصیدہ کافیہ کہ بہ طمطراق تمام در مدح وی گفتہ مشہور بر زبان خاص و عام"[2]

عماد الملک نظام کی تعریف میں سودا نے ایک اور قصیدہ بھی کہا تھا جس کا مطلع ملاحظہ ہو۔

کیسے ہے کاتب دوراں نے منشی تقدیر ۔۔۔ سمجھ کے دفتر قسمت کیا کرا اب تحریر[3]

ولیم ٹامس بیل، نظامی بدایونی، فصیح الدین بلخی اور جمیل احمد نے بھی لکھا ہے کہ عماد الملک نظام کی بیگم گنا بیگم نے شاعری میں سودا سے اصلاح لیا تھا۔ اس سے واضح ہوتا ہے کہ سودا ایک باکمال شاعر تھا ورنہ بھلا وزیر وقت کی اہلیہ محترمہ کا وہ استاد کیوں ہوتا سودا کے متعلق تذکروں میں یہ بات درج ہے کہ اس کی تعلیم و تربیت دہلی میں واقع ہوئی وہ سلیمان قلی خاں وداد کا شاگرد تھا بعد ازاں اس نے شاہ حاتم سے اصلاح لی۔ شاہ حاتم کو ایسے باکمال شاگرد پر فخر تھا سودا نے فارسی کے باکمال شاعر اور تذکرہ نگار خان آرزو سے بھی شرف تلمذ حاصل کیا تھا حقیقت میں سودا اوائل میں فارسی کا شاعر تھا لیکن خان آرزو کے مشورہ پر ریختہ میں شاعری کا آغاز کیا۔ مگر اس کو فارسی شاعری سے زیادہ لگاؤ تھا یہی وجہ ہے کہ ریختہ کا شاعر بن جانے کے بعد بھی فارسی کو بالکل جدا نہیں کیا اور گاہ گاہ کہتا رہا۔ اس کا ثبوت اس کا دیوان ہے جس میں جا بجا فارسی کے اشعار ہیں۔ رام بابو سکسینہ[4] رقمطراز ہے کہ

---

[1] انتخاب کلیات سودا ص ۱۲۰، ۱۲۱ [2] گلشن بے خار ص ۸۹ [3] ایضاً [4] تاریخ ادب اردو ص ۱۲۸

سودا کے اشعار اس قدر پسند کیے گئے کہ گلی گلی پہنچ گئے یہ بات قابل غور ہے کہ اس کو زندگی ہی میں وہ مقام مل گیا جس کے لیے بیشتر شعراء آرزو ہی کرتے رہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ وہ اپنے وقت کا استاد تھا یہی وجہ ہے کہ شاہ عالم بادشاہ نے بھی اس سے شرف تلمذ حاصل کیا وہ آفتاب تخلص کرتا تھا۔ تذکروں میں یہ بات مرقوم ہے کہ شاہ عالم بادشاہ سے کچھ عرصہ کے بعد ان بن ہو گئی اور اس نے قلعہ میں جانا چھوڑ دیا بہت ممکن ہے کہ چونکہ سودا نے عماد الملک وزیر عالمگیر ثانی بادشاہ کی مدح میں قصیدے لکھا تھا اور عماد الملک شاہ عالم ثانی کا دشمن تھا اس لیے بھلا وہ کب اپنے دشمن کے ممدوح سے تعلقات گوارا کرتا اس لیے ترک تعلق ہو گیا ہو گا۔ تاریخ سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عماد الملک ہی نے شاہ عالم ثانی کے والد کو قتل کروایا تھا۔

نواب شجاع الدولہ نے بھی سودا کا شہرہ سن کر اس کو اپنے یہاں طلب کیا تھا بلکہ خرچ سفر بھی بھیجا تھا مگر سودا نے حیلہ حوالہ سے کام لیا اور نہیں گیا۔ ایک زمانہ میں دہلی میں اس کو معاش کی طرف سے تکلیف ہوئی تو وہ نواب احمد خاں بنگش کے یہاں فرخ آباد گیا نواب مذکور نے اس کی بڑی تعظیم و تکریم کی اور اس سے شرف تلمذ بھی حاصل کیا سودا کئی سال تک فرخ آباد میں سکونت پذیر رہا مہرباں خاں کی تعریف میں سودا نے کئی قصیدے کہا ہے نواب احمد خاں بنگش کی وفات ۱۱۸۵ھ میں ہوئی اس کے بعد سودا نے فیض آباد کا رخ کیا اور نواب شجاع الدولہ کے دربار میں ایک منصب پایا۔ چند سال کے بعد لکھنؤ اودھ کا مرکز مقرر کیا گیا سودا بھی لکھنؤ چلا آیا شجاع الدولہ کی موت کے بعد نواب آصف الدولہ صوبہ دار اودھ نے سودا کو ملک الشعراء کا خطاب بخشا اور چھ ہزار روپے سالانہ کا وظیفہ دیا نواب آصف الدولہ اس کا بہت احترام کرتا تھا اور اکثر و بیشتر صحبتیں رہتی تھیں تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ سودا نے لکھنؤ ہی میں ۱۱۹۵ھ میں

وفات پائی۔ ذیل میں قطعہ تاریخ نقل کی جاتی ہے۔

خلد کو جب حضرت سودا گئے — فکر میں تاریخ کی ماہر ہوا

بولے منصف دہ کر بائے عناد — شاعراں ہند کا سرور گیا

سودا اردو قصیدہ گوئی میں نہایت بلند مقام رکھتا ہے اس کے بعض قصیدے عرفی اور خاقانی کے رنگ میں ہیں اور ان میں خیال کی نزاکت پائی جاتی ہے مرثیہ گوئی میں بھی وہ شہرت رکھتا ہے اور ہجو گوئی تو اس کی خاص چیز ہے جس نے اس کو بہت مشہور کیا فن ہجو کو اس نے نہایت بلند مقام پر پہنچایا اور اس طرح اردو زبان میں طنز و مزاح کا نہایت عمدہ سرمایہ مجتمع ہو گیا۔ تذکروں میں لکھا ہے کہ سودا کی طبیعت میں شگفتگی اور زندہ دلی تھی علاوہ ازیں دل بھی اس کا شفاف تھا یہی وجہ ہے کہ ذرا بھی کسی سے کچھ شکایت ہوتی تھی تو وہ فی الفور اس کے متعلق ایک ہجو قلمبند کر لیتا تھا مشکل سے مشکل زمین میں بھی اس نے شاعری کی اس کو زبان پر کامل قدرت حاصل تھی اردو کے نامور ہمعصر شاعر میر تقی میر اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ حالانکہ کوئی شاعر اپنے ہمعصر شاعر کی شاید ہی تعریف کرتا ہے لیکن میر نے اس کی خوب خوب تعریف کی ہے ذیل میں ملاحظہ ہو ۔

"مرزا رفیع متخلص بہ سودا جوانے خوش خلق و خوشگو گرم جوش یار باش شگفتہ رو .... از مغتنمات روزگار است[1]"

تصنیفات و تالیفات سودا دہلوی

(۱) چوبیس مثنویاں (۲) دیوان اردو مکمل (۳) ایک مختصر دیوان فارسی (۴) چند فارسی قصیدے (۵) دو خط بنام میر ایک منظوم اور دوسرا منثور

---

[1] نکات الشعراء بہ حوالہ تاریخ اردو صد ۱۲۱

(۶) ایک رسالہ نثر میں نام اس کا عبرۃ الغافلین (۷) مثنوی شعلۂ عشق از میر تقی میر کا ترجمہ نثر میں (۸) اردو شعراء کا ایک تذکرہ جو نایاب ہے۔

ذیل میں سودا کے ایک قصیدے سے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں تاکہ قارئین کو اس کے شاعرانہ محاسن کا اندازہ ہو۔

کہے ہے کاتب دوراں سے منشی تقدیر	بجھ کے دفتر قسمت کیا کر اب تحریر
گمان عہد نہ کر اب تو بجز دنیا سے	گہر نکالے تو عریاں حباب پہنے حریر
یہ روز و شب تو بنائے گا تا کجا اس طرح	کہ جام مہر میں آتش دے مہ کو کاسہ شیر
نہیں ہے معجزۂ عیسیٰ سے کم تری تدبیر	کیا ہے زندہ سر نو سے جن نے عالمگیر
کرے ہے عرض یہ سودا ہمیشہ عالم کا	لہے تو کارکشا اے امیر ابن امیر[1]

نواب صمصام الدولہ شاہ نواز خاں شہید (خوافی) اورنگ آبادی

آزاد بلگرامی[2] نے لکھا ہے کہ اس کا نام میر عبدالرزاق اور خطاب صمصام الدولہ شاہنواز خان تھا اس کے اسلاف خواف نیشاپور کے ایک معزز سادات خانوادہ سے تھے عہد اکبری میں میر کمال الدین ہندوستان پہنچے اور بادشاہ اکبر نے ایک منصب سے ان کو نوازا۔ میرک حسین ان کا ایک بیٹا تھا جو شاہنواز خاں کا پھر دادا تھا میرک حسین عہد جہانگیری میں ایک منصب پر فائز تھا اس کا بیٹا معین الدین عرف امانت خاں، شاہنواز خاں کا پر دادا تھا۔ شاہ جہاں نے اس کو ایک منصب عنایت کیا تھا امانت خاں عہد عالمگیری میں کشمیر، کابل اور ملتان کا دیوان تھا وہ اورنگ آباد

---

[2] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۲

کاناظم بھی تھا۔ امانت خاں چار بیٹوں میں کاظم خاں ملتان کا دیوان تھا آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ کاظم خاں کا بیٹا امیر حسن علی تھا جو شاہنواز خاں کا باپ تھا۔ آزاد بلگرامی اور شاہنواز خاں دونوں میں قلبی دوستی تھی۔

شاہنواز خاں کے والد نے بہ عمر بیس سال وفات پائی اور اپنے معصوم بیٹا شاہنواز خاں کی پرورش نہ کر سکا۔ آزاد بلگرامی کے بیان کے مطابق شاہنواز خاں کی ولادت ۱۱۱۱ھ میں بہ مقام لاہور ہوئی وہ شاہ آفریں لاہوری سے عمر میں تقریباً اڑتیس ۳۸ سال چھوٹا تھا یہ دونوں چونکہ ہمعصر تھے اس لئے راقم حروف نے اس مقالہ میں شاہنواز خاں کا ذکر کرنا مناسب سمجھا لیکن تذکروں سے یہ بات ثابت نہیں ہے کہ دونوں سے کبھی ملاقات ہوئی تھی۔ حالانکہ ۱۱۱۱ھ میں شاہنواز خاں طفل شیر خوار رہا ہوگا جب کہ اسی لاہور میں شاہ آفریں اقامت پذیر تھے اور ان کی عمر تقریباً اڑتیس سال رہی ہوگی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ شاہنواز خاں جیسا جامع کمالات مشکل سے وجود میں آتا ہے کم عمری سے کمالات اس میں پائے جاتے تھے۔

"مناقب این امیر بی نظیر زیادہ از آں است کہ زبان قلم تحریر تواند کرد...... حقا کہ چشم روزگار امیرے بہ این جامعیت کمالات ندیدہ...... از عنفوان نشوونما آثار رشد از ناصیۂ او پیدا بود"[1]

عالمگیر ثانی نے ۱۱۶۸ھ میں شاہنواز خاں کو تحفہ اور خطاب بھیجا تھا شاہنواز خاں اوائل شباب میں لاہور سے ہجرت کر کے اورنگ آباد آیا نواب نظام الملک نے اس کو ایک منصب دیا تھا بعد ازاں اس کو صوبہ برار کی دیوانی ملی اور وہ اس عہدہ پر عرصۂ دراز تک نہایت حسن و خوبی کے ساتھ کام انجام دیتا رہا محمد شاہ

---

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۱۷

نے ۱۱۵۰ھ میں نظام الملک کو قلمدان وزارت سپرد کیا تھا نظام الملک نے اپنے پسر نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کو دکن کی صوبہ داری کا قائم مقام مقرر کر کے خود دہلی کا سفر کیا تھا۔ مآثر الامراء میں مرقوم ہے کہ شاہنواز خاں ہمیشہ صوبہ دار دکن، نظام الدولہ ناصر جنگ کی صحبتوں میں رہتا تھا نظام الدولہ نے اس کو اپنے صوبہ کا دیوان مقرر کیا تھا آزاد بلگرامی نے اس کی امانت داری اور دیانت داری کی بڑی تعریف کی ہے۔

نواب نظام الملک اور اس کے بیٹا نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کے درمیان کشیدگی ہو گئی تھی کیونکہ نواب نظام الدولہ ناصر جنگ نے اپنے والد بزرگوار کو دکن کی صوبہ داری واپس نہیں کی اس لئے باپ بیٹے میں خانہ جنگی ہوئی اور بیٹا کو شکست ہوئی شاہنواز خاں، نظام الملک کے بیٹا کی ملازمت میں تھا اس لئے اس کو ایک مدت تک نظر بند رکھا گیا گرچہ اس نے نواب نظام الدولہ ناصر جنگ کو بہت سمجھایا تھا کہ وہ دکن کی صوبہ داری اپنے پدر بزرگوار کو واپس کر دے لیکن اس نے اس کی بات نہیں مانی تھی شاہنواز خاں پانچ برس تک نظر بندی کی حالت میں رہا اس نے اپنی مایۂ ناز کتاب مآثر الامراء حراست ہی کے دور میں قلمبند کرنا شروع کیا ۱۱۶۰ھ میں نظام الملک نے اس کو آزاد کیا اور بدستور سابق وہ برار کا دیوان ہوا ۱۱۶۱ھ میں نواب نظام الملک نے وفات پائی اس لئے نواب نظام الدولہ دکن کا صوبہ دار ہوا شاہنواز خاں دوبارہ دکن کا دیوان مقرر ہوا احمد شاہ نے ایک موقع پر نظام الدولہ کو دہلی طلب کیا تھا شاہنواز خاں نے خدا حافظی کرتے وقت اس کو ایک انگوٹھی دی تھی جس پر مہر سلیمانی کندہ تھا ایک مدت کے بعد نواب نظام الدولہ نے شہادت پائی ڈاکٹر محمد قمر الدین[1] نے

---

[1] احوال و آثار و افکار عماد الملک غازی الدین خاں نظام ص ۲۸۹

مآثر الامراء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ نواب مذکور کی[1] شہادت کے بعد دکن کی صوبہ داری نواب میر سید محمد صلابت جنگ امیر الممالک کو تفویض ہوئی شاہنواز خاں سپاہیوں کے ہمراہ تھا بعد ازاں وہ اورنگ آباد آیا شاہنواز خاں تھوڑی مدت تک گوشہ انزوا میں رہا بعدہٗ ۹ رجب ۱۱۶۵ھ میں حیدر آباد گیا نواب امیر الممالک نے اس کو حیدر آباد کی صوبہ داری مرحمت کی آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ کچھ عرصہ کے بعد وہ صوبہ داری سے برطرف کر دیا گیا اس لئے وہ اورنگ آباد میں اقامت پذیر ہوا بعدہٗ نواب امیر الممالک نے شاہنواز خاں کو ۱۲ صفر ۱۱۶۷ھ میں اپنا وکیل مطلق بنایا اور سات ہزاری، سات ہزار سوار اور خلعت کے ساتھ صمصام الدولہ کا خطاب بھی بخشا شاہنواز خاں نے تقریباً چار برس تک وکیل مطلق کے منصب کو نہایت اچھی طرح انجام دیا وہ ۱۱۶۷ھ میں وکیل مطلق کے منصب پر سرفراز ہوا تھا اور اس وقت نواب امیر الممالک کے خزانے کی حالت ناگفتہ بہ تھی اس کے محل کا اسباب بھی فروخت ہو رہا تھا شاہنواز خاں نے نہایت عقلمندی اور دور اندیشی سے مالی حالت درست کرنے کی سعی کی اور رعایا کو بھی اس نے آرام پہنچایا ملک میں انصاف جاری ہوا اور تقریباً چار سال کی مدت میں شاہنواز خاں نے اتنی آمدنی جمع کی جو خرچ کے برابر ہو گئی اسے امید تھی کہ اگلے سال آمدنی کو خرچ کے مقابلہ میں بڑھا سکیگا وہ صاحب قلم تو تھا ہی مگر ایک ماہر سیاستداں اور شجاع بھی تھا اس کی شجاعت اور دلیری کا یہ ثبوت ہے کہ اس نے رگھو بھونسلہ کو شکست فاش دیا اور اس نے نذرانہ کے طور پر پانچ لاکھ روپئے دکن کے خزانہ میں داخل کیا۔ سرپا راؤ زمیندار نیرمل نہایت موذی اور باغی تھا شاہنواز خاں نے

---

[1] مآثر الامراء جلد اول ص ۲۱

اس کو مقید کیا اور اس کے علاقوں کو سرکار دکن میں شامل کیا اس نے سنہ ۱۱۶۸ھ
میں پچاس لاکھ روپیہ میسور کے راجہ سے حاصل کیا راؤ بالاجی پہلے صوبہ دار
دکن کا دشمن تھا لیکن شاہنواز خاں نے سنہ ۱۱۶۹ھ میں ایک موقع پر اس کو مدد دی
تھی اس لئے راؤ بالاجی صوبہ دار دکن کا دوست ہو گیا تھا اس نے رام چندر مرہٹہ
کو بھی زیر نگیں کیا جس نے نظام الملک کو بہت نقصان پہنچایا تھا مگر قدرت اپنے
کھیل کھیلتی رہتی ہے گرچہ وہ نہایت عادل اور رحم دل تھا لیکن صوبہ دار کے
بدخواہوں نے لشکروں کو اس سے یہ کہہ کر بدظن کر دیا کہ تم لوگوں کی تنخواہوں
کا بڑا حصہ سرکار کے یہاں شاہنواز خاں کی وجہ سے ہی باقی ہے اس لئے لشکریوں
نے اپنی بقایہ رقومات کے لئے ہنگامے کا آغاز کیا آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ اس
موقع پر شاہنواز خاں سے غلطی ہوئی کیونکہ وہ دو لاکھ رقم کا نظم کر کے اس
بغاوت کو فرو کر سکتا تھا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس نے سمجھا تھا کہ معاملہ طول
نہیں کھینچے گا سات ذیقعد سنہ ۱۱۷۰ھ میں نواب شجاع الملک بسالت جنگ نے
ابن نظام الملک کو لشکریوں نے نواب امیر الممالک کے روبرو حاضر کیا اور شاہنواز خاں
کو وکیل مطلق کے منصب سے معزول کرا دیا بات یہیں تک نہیں رہی بلکہ ایک
مجمع شاہنواز خاں کے درپے آزار ہوا اور اس کی اقامت گاہ پر یورش
کرنے کا ارادہ کیا۔ اس مجمع کا مطالبہ تھا کہ اس کی تنخواہیں اسی کی وجہ سے باقی
ہیں یہ ہنگامہ شام تک تو رکا رہا اور شب ہو جانے کی وجہ سے وہ لوگ منتشر
ہو گئے مگر شاہنواز خاں کو چین کہاں اس کو خوف تھا کہ صبح میں دوبارہ ہنگامہ
ہو سکتا ہے اس لئے اس نے آدھی رات کو راہِ فرار اختیار کیا ضروری اسباب
کو اس نے گھوڑوں اور ہاتھیوں پر لدوایا اور قلعہ دولت آباد کی جانب حرکت
کی تقریباً پانچ سو دوست احباب اس کے ساتھ تھے بتاریخ ۸ ذیقعدہ

۱۱۷۰ھ میں بوقت صبح وہ دوستوں کے ساتھ دولت آباد بلوائیوں نے صبح میں اس نے دولتکدہ کے قیمتی سامان لوٹ لیے اور بہت سارے اسباب کو سرکار دکن نے اپنے یہاں منگوالیا بات یہیں تک نہیں رہی سرکار دکن نے اپنے لشکریوں سے قلعہ دولت آباد کو گھیر لیا کیونکہ شاہنواز اسی قلعہ میں روپوش تھا آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ ایسے وقت میں کوئی بھی شاہنواز خاں کا پرسانِ حال نہ تھا مگر اس نے (آزاد بلگرامی) حق دوستی ادا کیا اور نواب شجاع الملک کو مصالحت کے لیے آمادہ کیا اس طرح شاہنواز خاں قلعہ دولت آباد سے آزاد ہوا نواب آصف جاہ ثانی نے آزاد بلگرامی کے وسیلہ سے شاہنواز خاں کو راضی کیا پہلی ربیع الاول ۱۱۷۱ھ میں شاہنواز خاں قلعہ دولت آباد سے نکلا اور اسی روز نواب آصف جاہ ثانی اور نواب امیر الممالک کی خدمت میں باریاب ہوا اس موقع پر اس کو انعامات ملے حیدر جنگ نظام الملک کے خاندان کا پرانا دشمن اور جاگیردار تھا حیدر جنگ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ شاہنواز جیسے عاقل اور ایمان دار مصلح کار کے رہتے ہوئے وہ دکن کی صوبہ داری کو حاصل نہیں کر سکتا ہے اصل میں وہ دکن کا صوبہ دار بننا چاہتا تھا اس لیے اس نے نواب امیر الممالک کو اپنی خیر خواہی کا یقین دلایا اس مقصد کے لیے اس نے نواب مذکور کو کئی خط لکھا شاہنواز خاں بھی اس کے فریب میں آگیا حیدر جنگ نے راجہ رام چندر کی طاقت کو کچلنے کے بہانے سے نواب آصف جاہ ثانی اور شاہنواز خاں کو ایک بیکراں فوج کے ساتھ کوچ کرایا اور راستہ میں ایک جگہ خیمہ زن ہو کر دونوں کو جداگانہ طور پر خیمہ میں نظر بند کر دیا نواب آصف جاہ ثانی، حیدر جنگ کی اس حرکت پر مشکوک ہوا اور اس نے خفیہ طور پر اپنے نزدیکیوں سے مشورت کی ادھر دوسرے خیمہ میں شاہنواز خاں بھی مقید تھا ۲ رمضان المبارک ۱۱۷۱ھ میں حیدر جنگ قریباً بارہ بجے آصف جاہ

ثانی کے خیمہ میں وارد ہوا نواب مذکور کے لوگوں نے حیدر جنگ کو پکڑ کر ذبح کر دیا اور نواب گھوڑے پر بیٹھ کر باہر نکل گیا شاہنواز خاں کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا میر عبدالغنی خاں اور یمین الدولہ بھی مقید تھے ان سبھوں نے حیدر جنگ کے مقتول ہونے کی خبر پائی اور سب کے سب بہت گھبرائے۔ شاہنواز خاں قبلہ کی طرف رخ کر کے بیٹھا آزاد بلگرامی کا بیان ہے کہ حیدر جنگ کے مقتول ہونے کے تقریباً چار گھنٹے بعد ایک چھمنان نامی ہندو جو آتش پرستوں کا دوست تھا پہنچا اور سب سے پہلے اس نے شاہنواز خاں کو جام شہادت پلایا بعد ازاں اس کا فرزند میر عبدالغنی خاں اور یمین الدولہ بھی شہید ہوئے گرچہ حیدر جنگ کے پلان کے تحت شاہنواز خاں یمین الدولہ اور میر عبدالغنی خاں شہید کئے گئے لیکن ان حضرات کی شہادت سے پیشتر ہی حیدر جنگ قتل کر دیا گیا تھا شاہنواز خاں اور اس کا بیٹا میر عبدالغنی خاں اپنے آبائی قبرستان میں مدفون ہوئے یہ مقام شاہ نور قدس سرہٗ کی درسگاہ سے متصل ہے اور یمین الدولہ اپنے آبائی قبرستان میں سپرد خاک ہوئے آزاد بلگرامی اس سانحہ عظیم سے بہت متاثر ہوئے اور ذیل کی قطعہ تاریخ کہی۔

رفت صمصام الدولہ ز جہاں — سوم ماہ شریف رمضان[1]
سال ایں واقعہ آں سید نود — گفت ہا کشتہ عبدالرحمان

اس موقع پر آزاد بلگرامی نے ایک رباعی بھی نظم کی تھی۔

صمصام الدولہ آں امیر الادانش آگاہ — ناحق شدہ کشتہ در کمین گاہ وغا و اظلوما
آزاد بہ عرض می رساند تاریخ یاراں شنوید — کردند شہید ناکساں سید را انا للہ[2]

[1، 2] مآثر الامراء جلد اول ص ۳۳، ۳۴

آزاد بلگرامی نے لکھا ہے کہ شاہنواز خاں کے دونوں فرزند میر عبدالحی اور میر عبدالسلام خاں خیمہ سے کہیں نکل گئے تھے اس لئے یہ دونوں شہید ہونے سے بچے محفوظ رہے اس نے شاہنواز خاں کے اوصاف حمیدہ کی نہایت تعریف کی ہے اس کا بیان ہے کہ وہ جامع کمالات اور جملہ علوم سے واقف تھا شعر فہمی میں بے مثال تھا حافظہ اس کا نہایت بہتر تھا مصطلحات زبان فارسی سے اچھی طرح باخبر تھا وہ باکمال منشی اور خطوط نویس تھا مگر جائے تاسف ہے کہ اس کے مکتوبات ضائع ہو گئے۔ تاریخ دانی میں وہ عدیم النظیر تھا جس کا ثبوت اس کی مایۂ ناز کتاب مآثر الامراء ہے اس کا ایک نہایت عمدہ کتب خانہ بھی تھا جس میں اردو فارسی کی نادر کتابیں تھیں مگر جب وہ قلعہ دولت آباد میں پناہ گزیں ہوا اسی وقت بلوائیوں نے لوٹ لیا تھا وہ نہایت وفادار سچا اور حیا کا پتلا تھا ہر ہفتہ وہ دو روز عدالت کرتا تھا اور بعد نماز صبح ہر روز وہ کارہائے حکومت کو انجام دینے میں مشغول رہتا تھا البتہ بارہ بجے قیلولہ کرتا تھا بعد نماز ظہر دوبارہ حکومت کے امور میں مصروف ہو جاتا تھا یہاں تک کہ نصف شب تک کام میں ڈوبا رہتا تھا اس نے مآثر الامراء میں اپنے عصر کے سرداروں اور باکمال شخصیتوں کے احوال کو نہایت تفصیل کے ساتھ قلمبند کیا ہے یہ تاریخی کتاب نہایت ایمانداری کے ساتھ لکھی گئی ہے الفاظ سادہ اور رواں ہیں اس کتاب کے قلمی نسخہ کو اس کے دوست آزاد بلگرامی نے بہت تلاش و جستجو کے بعد حاصل کیا تھا کیونکہ یہ نسخہ بلوائیوں میں سے کسی کے ہاتھ آیا تھا آزاد بلگرامی نے اس تاریخی کتاب میں بعض لوگوں کے حالات کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کیا یہ کتاب اس لائق ہے کہ رہتی دنیا تک ہندوستان اس پر ناز کرے گا۔

اعتماد الدولہ قمرالدین خان بہادر وزیر اعظم ہند

نام میر محمد فاضل اور خطابات اعتماد الدولہ قمرالدین خان بہادر نصرت جنگ تھے اس کے پدر بزرگوار محمد امین خان اعتماد الدولہ بہ عہد عالمگیر بادشاہ توران سے ہجرت کرکے ہندوستان میں اقامت پذیر ہوئے تھے منشی غلام حسین خان نے لکھا ہے کہ عالمگیر بادشاہ کے عہد میں ترقی کرکے امین خان پنج ہزاری منصب پر پہنچے تھے[1] فرخ سیر بادشاہ نے محمد امین خان کو ہفت ہزاری کا عہدہ دیا تھا اور محمد شاہ رنگیلے نے ان کو قلمدان وزارت سپرد کیا تھا محمد امین خان کا بیٹا میر محمد فاضل اپنے والد کی حیات ہی میں بہ عہد محمد شاہ بخشی دوم اور داروغہ غسل خانہ کے منصب پر ممتاز تھا نظام الملک آصف جاہ نے جب وزارت کو ترک کیا تب ۱۱۳۷ھ میں محمد شاہ نے میر محمد فاضل کو وزارت کا منصب بخشا اور اعتماد الدولہ قمرالدین خان بہادر کے خطابات ملے۔

قمرالدین خان وزیر اعظم کے حالات زندگی کے متعلق منشی غلام حسین خان نے لکھا ہے کہ اس نے بہت عیش و آرام کے ساتھ اپنی زندگی بسر کی۔ راقم حروف نے اس مقالہ میں قمرالدین خان کے احوال کو قلمبند کرنا اس لئے لازم سمجھا کیونکہ وہ شاہ آفرین لاہوری کا ہمعصر تھا اور بہت ممکن ہے کہ وہ عمر میں شاہ آفرین سے چھوٹا ہو کیونکہ ۱۱۳۷ھ میں جب قمرالدین خان کو وزارت کا عہدہ ملا اس وقت شاہ آفرین کی عمر تقریباً پچاس سال تھی اس سے اندازہ ہوتا ہے

---

[1] سیر المتاخرین صفحہ ۸۷۰

کہ وہ ضرور شاہ آفریں سے عمر میں کمتر ہوگا بادشاہ محمد شاہ کے دور سلطنت میں اسّی سال سے زیادہ کی عمر میں بہ سال ۱۱۵۴ھ شاہ آفریں نے وفات پائی ان کی رحلت کے سات سال بعد قمرالدین خاں وزیر اعظم نے وفات پائی اس سے روشن ہے کہ شاہ آفریں قمرالدین خاں وزیر اعظم سے اچھی طرح واقف رہا ہوگا لیکن چونکہ شاہ آفریں امراء اور روٴسا سے بالکل نہیں ملتے تھے اس لئے قیاس کیا جاتا ہے کہ دونوں کی ملاقات کبھی نہیں ہوئی ہوگی کسی تذکرہ سے بھی اس بات کا ثبوت نہیں ملتا ہے۔

قمرالدین خاں وزیر اعظم، عمادالملک غازی الدین خاں نظام وزیر اعظم عالمگیر ثانی بادشاہ کا نانا تھا علاوہ ازیں قمرالدین خاں کی پوتی عمدہ بیگم سے عمادالملک کا پہلا نکاح ہوا تھا قمرالدین خاں وزیر اعظم نہایت بہادر اور شجاع تھا اس نے بالاجی راؤ مرہٹہ کے فتنوں کو کچلنے کے لئے اس پر حملہ کیا بالاجی راؤ مرہٹہ بھی ایسا دلیر اور سرکش تھا کہ بار بار مارنے کے باوجود وہ پھر بغاوت کرتا تھا لیکن قمرالدین خاں نے اس کو چار بار شکست دیا اور کبھی اس سے شکست نہیں کھائی انجام کار بالاجی راؤ کو اس سے صلح کرنی پڑی محمد شاہ بادشاہ کو قمرالدین خاں پر بہت اعتماد تھا اس لئے ایک مرتبہ بادشاہ مذکور کے ساتھ علی محمد خاں روہیلہ کی گوشمالی کے لئے روانہ ہوا شاہنواز خاں کا بیان ہے کہ ایک مرتبہ وہ احمد شاہ ابدالی سے لڑنے کے لئے سرہند تک پہنچا تھا اس وقت احمد شاہ بادشاہ شاہزادہ تھا اور اس کے ساتھ تھا۔

شاہنواز خاں[1] نے قمرالدین خاں وزیر اعظم خاں کے خصائل حمیدہ کی نہایت ستائش کی ہے وہ نہایت خوش خلق، مہربان اور سخی تھا امیروں اور اہل دولت پر

---

[1] مآثرالامراء جلد اول ص ۳۵۹

ہی نہیں بلکہ غربا پر بھی وہ مہربان تھا اور کسی کو نقصان پہنچانا اس کی فطرت نہیں
تھی منشی غلام حسین خاں کے بیان کے مطابق قمرالدین خاں وزیراعظم نہایت
عیش و عشرت اور شان و شوکت کی زندگی بسر کرتا تھا اس کے پسر منو کو معین
الملک رستم ہند کا خطاب عطا ہوا تھا معین الملک رستم ہند بعہدۂ لاہور اور
ملتان کا صوبہ دار بھی ہوا اسی معین الملک رستم ہند کی بیٹی عمدہ بیگم سے
عماد الملک غازی الدین نظام کی پہلی شادی معین الملک کی حیات میں ہوئی تھی
اور وہ اس کا ماموں اور خسر بھی تھا مگر رخصتی عمدہ بیگم کی معین الملک کی
رحلت کے بعد سنہ ۱۱۶۷ھ میں ہوئی قمرالدین خاں وزیراعظم ہندوستان کی موت
اس طرح ہوئی کہ احمد شاہ ابدالی کی جنگ میں اس کے توپ کا ایک گولہ اس کو
لگا اور وہ جاں بر نہ ہو سکا شاہنواز خاں نے تاریخ وفات سنہ ۱۱۶۱ھ قلمبند کیا ہے
اس کے بیٹا معین الملک رستم ہند صوبہ دار لاہور اور ملتان کی وفات ناگہانی
درد احشاء کے مرض میں سنہ ۱۱۶۷ھ میں ہوئی اس کی رحلت کے بعد اس کا فرزند
میر مومن لاہور کا صوبہ دار مقرر کیا گیا اور اس کی والدہ کو اس کا وکیل بنایا گیا
کچھ عرصہ گزرنے پر میر مومن نے عالم باقی کو کوچ کیا اور اس کی ماں یعنی بیگم معین الملک
کو لاہور کی صوبہ داری کا عہدہ عطا ہوا ایک مدت بھی نہیں گزری تھی کہ خواجہ
عبداللہ خاں پسر عبدالصمد خاں نے معین الملک کی اہلیہ کو مقید کیا اور بادشاہ
سے لاہور کی صوبہ داری کا طالب ہوا لیکن وہ ناکام رہا معین الملک کی بیگم
قید سے آزاد ہوئی مگر کچھ ہی عرصہ گزرنے کے بعد مرزا خاں نے اس کو مقید کر
لیا آخر دونوں میں صلح ہوئی مگر تھوڑے ہی عرصہ کے بعد عماد الملک نے جو اس

لہ سیر المتاخرین ص ۸۷۰

کا داماد اور بھانجہ بھی تھا اسے نظر بند کر لیا اور لاہور کی صوبہ داری کا عہدہ آدینہ بیگ خاں کو دیا قمر الدین خان وزیر اعظم کا ایک بیٹا اعتماد الدولہ انتظام الدولہ خان خاناں کو بادشاہ احمد شاہ نے صفدر جنگ وزیر اعظم کی معزولی کے بعد وزارت کا منصب دیا تھا لیکن اس کے بھانجہ عماد الملک نے ۱۱۶۷ھ میں اس کو مروا دیا تھا[1]۔ انتظام الدولہ کا بیٹا فخر الدولہ دکن میں مقیم تھا اور نظام الدولہ آصف جاہ کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہا تھا آزاد بلگرامی نے قمر الدین خاں وزیر اعظم کی وفات کے موقع پر قطعہ تاریخ کہی تھی اسی سال محمد شاہ اور نواب نظام الملک نے بھی رحلت کی تھی اس لئے تینوں کی قطعہ تاریخ ایک ہی ساتھ ہے جیسے ذیل میں قلمبند کیا جاتا ہے۔

سہ رکن مملکت ہند از جہاں رفتند	فتاد حیف سہ دُرِّ یگانہ از کف دہر
برائے رحلت ایں ہر سہ یافتم تاریخ	نماند شاہ زماں باوزیر آصف جاہ[2]

علی قلی خاں والہ داغستانی

علی قلی نام اور تخلص والہ تھا اس کے اسلاف داغستان کے باشندہ تھے اس کے ذیل کے شعر سے اس کے نام کا پتہ چلتا ہے۔

چوں نالہ من شنید باہمدم گفت
از دست علی قلی بتنگ آمدہ ام[3]

---

[1] ماثر الامراء جلد دوم ص ۸۵۵ [2] سرو آزاد مطبوعہ ص ۱۷۲ [3] دیوان والہ داغستانی ایڈیشن

میر شمس الدین فقیر دہلوی اس کا قلبی دوست تھا اس نے بھی ذیل کے شعر میں اس کا نام علی قلی بتایا ہے۔

زاں فال سعید نیک انجام آمد او را علی قلی نام[1]

فقیر دہلوی[2]، خان آرزو[3] اور آزاد بلگرامی[4] کا بیان ہے کہ والہ داغستانی کا نسب نامہ حضرت عباسؓ تک پہنچتا ہے خود والہ داغستانی نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کو واضح کیا ہے۔

دارد ز زلف کسوت عباسیاں ببر از دودمان ماست رخ دلستان ما[5]

فرہنگوں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ داغستان اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں گھوڑوں کو داغا جاتا ہے تذکروں سے یہ بات ظاہر ہے کہ والہ داغستانی کی ولادت اصفہان میں صفر المظفر کے مہینے میں ۱۱۲۴ھ میں ہوئی تھی خود اس کا بیان نقل کیا جاتا ہے۔

"تولد ایں فرسودہ نوائب زمان در شہر صفر ۱۱۲۴ھ در دار السلطنت اصفہان واقع شد[6]"

راقم حروف والہ داغستانی کا ذکر کرنا اس مقالہ میں لازم سمجھتا ہے کیونکہ وہ شاہ آفریں لاہوری کا ہمعصر تھا اگرچہ عمر میں ان سے تقریباً پچاس سال چھوٹا تھا لیکن خود اس نے لکھا ہے کہ اس نے شاہ آفریں لاہوری سے بمقام لاہور شرف ملاقات حاصل کیا تھا مگر ملاقات کا واقعہ بھی دلچسپ ہے پہلے جب والہ داغستانی ان سے شرف ملاقات حاصل کرنے ان کے دولت کدہ پر گیا تو انھوں نے ملاقات

۱، ۲ مثنوی والہ و سلطان ۳ مجمع النفائس ۴ خزانہ عامرہ
۵ دیوان والہ داغستانی رامپور ۶ ریاض الشعراء ورق ۷۳ ب

کرنے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ اہلِ دنیا سے گریز کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فقراء کو اہلِ دنیا سے کیا کام۔ آخر اس نے ایک منظوم رقعہ شرفِ ملاقات کی آرزو کے سلسلہ لکھا اور اس رقعہ میں شاہ آفریں سے ذیل کا شعر بھی رقم کیا۔

پژمردہ ایم بی تو بہ فریاد ما برس　　از باغ ما دریغ مدار ای بہار ما

شاہ آفریں والہ داغستانی کے اس رقعہ کو پڑھ کر بہت خوش ہوئے اور خود قدم رنجہ فرما کر والہ داغستانی کے قیام گاہ پر تشریف لے گئے اور چند منٹوں تک صحبت بھی رہی[۱] والہ داغستانی نے خود لکھا ہے کہ وہ جب تک لاہور میں اقامت پذیر رہا اکثر و بیشتر ان کی صحبتوں سے استفادہ کرتا رہا اور ان کی صحبتوں نے والہ داغستانی کے ولولہ اور زور و شور کو اور بھی بڑھا دیا وہ عشق مجازی کا بسمل تو تھا ہی اس پر شاہ آفریں کی صحبتوں نے ایسا اثر ڈالا کہ وہ عشق مجازی سے عشق حقیقی تک جا پہنچا اس کے ذیل کے شعر سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اس کی نگاہیں ہمیشہ باطن کو دیکھنے میں لگی رہتی تھیں شعر ملاحظہ ہو۔

نہ ہر کہ کرد علی نام حیدری داند　　نہ ہر کہ گشت محمد پیمبری داند[۲]
منم منم کہ روم چوں بسوی کعبہ و دیر　　صنم بطاعتم آید حرم باستقبال

والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں شاہ آفریں کی نہایت تعریف کی ہے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"درین شہر بہ سخن سرائی مشہور بود در سنہ ۱۱۴۷ھ کہ راقم حروف وارد بلدۂ مزبور گردید او را طلبیدم چوں ترک آمیزش خلق خصوص اغنیاء و ارباب دنیا کردہ عزلت گزیں بود معذرت نمود۔

۱؎ مردم دیدہ ص۱۰۰　۲؎ دیوان والہ داغستانی رامپور

"...... الحق باین دو دمنزی کم کسی دیده شده عرض تا در لاہور بودم اکثر قدم رنجہ می نموده واثر صحبتش بر ولوله وشورم می افزود[1]"

والہ داغستانی کے چہر دادا الداد خاں شمخال تھے جن کے سب سے چھوٹے بیٹا الخاص میرزا کو شاہ صفی شہنشاہ ایران نے اپنے زیر تربیت رکھا تھا والہ داغستانی کے پردادا (الخاص میرزا) کی تربیت اور تعلیم شہنشاہ ایران کے زیر سایہ ہوئی اور بعدہٗ وہ صفی خاں کے خطاب سے نوازا گیا سلطان نجات بیگم والہ داغستانی کی پردادی تھیں۔ مہر علی خاں اس کے دادا اور محمد علی خاں اس کے والد تھے جو اپنے چار بھائیوں میں سب سے چھوٹے تھے والہ داغستانی نے خود اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس کے چہر دادا الداد خاں بہ مقام داغستان شمخال کے منصب پر مامور تھے شمخال کے معنی خلیفہ اور رئیس کے ہوتے ہیں اس کے دادا مہر علی خاں امیر شکار باشی تھے فتح علی خاں، والہ داغستانی کے چچیرے دادا تھے اور ایران میں وزارت کے عہدہ پر فائز تھے اس کے چچا لطف علی خاں ایران کے سپہ سالار تھے[2]۔

میر شمس الدین فقیر دہلوی، والہ داغستانی کے گہرے دوست تھے اور بارہا دونوں ایک ساتھ رہے اس لئے فقیر دہلوی کے بیان کی بڑی اہمیت ہے کیونکہ اس نے اس کو بارہا دیکھا تھا اور اس کے ساتھ بود و باش کی تھی فقیر دہلوی نے حق دوستی ادا کیا اور جیسا کہ قبل فقیر دہلوی کے حالات میں لکھا جا چکا ہے کہ فقیر نے ۱۱۶۰ھ میں والہ داغستانی کی داستان معاشقہ کو قلمبند کیا تھا اور نام اس کا مثنوی والہ وسلطان رکھا تھا فقیر نے یہ مثنوی اس وقت لکھی

---

[1] ریاض الشعراء ورق ۵۰۵، ۳۰۷، ۵۰۵ [2] خزانہ عامرہ [3] ریاض الشعراء

تھی جب والہ داغستانی حیاتِ تھا اس اعتبار سے والہ داغستانی کے احوال کے سلسلہ میں یہ مثنوی ایک اہم کڑی ہے۔ والہ داغستانی کے کوئی بھائی بہن نہیں تھے وہ اکیلا تھا اس کی ولادت کا جشن نہایت دھوم دھام سے منا گیا تھا اور سائلوں اور حاجتمندوں میں زر لٹائے گئے تھے نجومیوں نے بتایا تھا کہ یہ بچہ بہت نیک ہے مگر اس کی قسمت میں عاشقی لکھی ہوئی ہے اور وہ ہمیشہ پریشان رہے گا فقیر دہلوی نے اپنے ذیل کے شعر میں اس کا اظہار کیا ہے۔

امابود ایں پسر ہمیشہ شوریدہ مزاج و عشق پیشہ[1]

مشیت کو جو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے عام طور سے لوگوں کا یہی خیال ہے والہ داغستانی نے عہد طفلی ہی سے خدیجہ سلطان کا دیوانہ تھا جو اس کی چچازاد بہن تھی، وہ نہایت حسین و جمیل تھی اور دل وجان سے والہ داغستانی کو چاہتی تھی اس لئے کم عمری میں دونوں اپنے اپنے والدین کی رضامندی سے نامزد ہو گئے تھے۔

والہ داغستانی نے خود لکھا ہے کہ اس کے پدر بزرگوار ایروان میں بیگلر بیگ کے عہدہ پر فائز تھے اس کی عمر تین سال ہی کی تھی کہ وہ اپنے والد کے ہمراہ وہاں پہنچا تھا اور فقط دو سال وہاں رہا اس کے والد کو ۱۱۲۶ھ میں بیگلر بیگی کا عہدہ ملا تھا اور ۱۱۲۸ھ میں سپہ سالاری کے عہدہ پر مامور کئے گئے تھے۔

"در ۱۱۲۶ھ کہ بیگلر بیگی گری ایروان بہ والد مغفور تفویض یافتہ بود...... در ۱۱۲۸ھ کہ منصب عظمای سپہ سالاری و حکومت ایروان و آذربایجان و قندھار و ضمیمۂ آں مرجوع شدہ"[2]

---

[1] والہ و سلطان ص ۲۳ ریاض الشعراء ورق ۷۰۴، ۳۷۴

شہنشاہ ایران کی طرف سے ان کے پدر بزرگوار کو افغانوں کی سرکوبی کا حکم ملا تھا اور وہ نخجوان میں اقامت گزیں تھے کہ مرض استسقاء میں رحلت کی وہاں سے ان کی لاش نجف اشرف لائی گئی اور حضرت علیؓ کے مرقد انور سے نزدیک وہ مدفون ہوئے والہ داغستانی اس طرح پانچ ہی سال کی عمر میں یتیم ہوگیا اور یہ صدمہ اس کے لیے بڑا سنگین تھا اس کی تعلیم و تربیت اور پرورش اس کے چچا حسن علی خاں نے اصفہان میں کیا وہ وہاں مطمئن اور خوش و خرم تھا اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کی محبوبہ خدیجہ سلطان بھی وہیں تھی کیونکہ وہ حسن علی خاں کی بیٹی تھی۔ دونوں کے لیے چھ سال کی عمر میں مکتب کی رسم نہایت شان و شوکت کے ساتھ ہوئی اور لائق استاد مقرر کیے گئے فقیر دہلوی کا ذیل کا شعر ملاحظہ ہو۔

والہ چو بہ ہشت رسید سالش   داد فقر بہ درس اشتغالش[1]

خوشگو نے لکھا ہے کہ والہ داغستانی شیخ حزیں کا شاگرد اور مرید تھا لیکن تحقیق سے یہ بات غلط ثابت ہوتی ہے جیسا کہ خود والہ داغستانی کے شعر سے روشن ہے۔

ہیچ از دوستاں نخبر پرسی   چند بتواں ز دشمناں پرسید[2]

والہ داغستانی کا بیان ہے کہ مرزا محمد منشی سے اس نے کلیات نوائی اور منشا کے چند رسالوں کا درس لیا تھا خط نستعلیق بھی انھیں سے سیکھا تھا والہ داغستانی نے اپنے تذکرہ میں کہیں پر یہ نہیں لکھا ہے کہ شیخ حزیں اس کے استاد تھے والہ داغستانی کے پدر بزرگوار خط شکست و خوشنویسی میں استادانہ مہارت رکھتے تھے لیکن وہ اس فن کو اپنے پدر بزرگوار سے نہیں سیکھ سکا کیونکہ وہ

ملے [illegible] ص ۲۰۱ سے دیوان والہ داغستانی لندن

پانچ سال کا طفل ہی تھا کہ اس کے والد نے رحلت کی شاہ آفریں کے عزیز شاگرد حاکم لاہوری نے والہ داغستانی سے کو بار شرف ملاقات حاصل کیا تھا اس کا بیان ہے کہ وہ خط نویسی میں عدیم النظیر تھا اور ایک نہایت کامیاب مقرر بھی تھا یہ بات واضح ہو کہ والہ داغستانی کے بہت سارے رشتہ دار شہنشاہ ایران کے یہاں ملازم تھے مگر محمود افغان ۱۱۳۵ھ میں ایران کا بادشاہ بن بیٹھا اس نے ان سارے لوگوں کو مقید کیا جو سابق سلطنت میں عہدہ دار تھے لہذا والہ داغستانی کے عزیز و رشتہ دار بھی جیل میں رہے ساڑھے سات سال تک ایرانی عوام پریشانیوں میں گھری رہتا اور والہ داغستانی بھی اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا جس کا ذکر راقم حروف کرے گا والہ داغستانی انھیں سیاسی اسباب اور جنون عشق کی وجہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے میں ناکام رہا مرزا غالب نے کیا سچ کہا ہے۔

عشق نے غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھے کام کے

والہ داغستانی نے اپنے ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ علم و دانش کی تحصیل نہایت اچھی شئے ہے لیکن میری فطرت میں عشق کا جنون ہے جس نے مجھے کسب علم کا موقع ہی نہیں دیا۔

تحصیل علم و دانش خوش بود لیک والہ عشق جنون طبیعت فرصت نداد مارا

اگرچہ اس نے اپنی کم علمی کا اعتراف کیا ہے لیکن حاکم لاہوری، خان آرزو، مصحفی، خوشگو، فقیر دہلوی، قدرت اللہ اور مولانا شبلی نے بھی اس کے کمالات علم کی ستائش کی ہے میرزا محمد منشی اس کے استاد تھے جیسا کہ قبل ذکر کیا گیا وہ تیرہ اقسام کے خطوط لکھنے میں ماہر تھے علاوہ ازیں علم حدیث، فقہ، تصوف، حکمت،

سلہ مردم دیدہ ص ۹۸، ۱۰۶

ریاضی، جفر، رمل اور نجوم میں [illegible] استعداد رکھتا تھا۔ نادر شاہ نے انہیں صلاحیتوں کی وجہ سے ان کو خزانہ داری کا منصب دیا تھا۔[1] راقم حروف کا خیال ہے کہ جب بادشاہ کی صلاحیتوں کا یہ عالم ہو تو بھلا شاگرد کیسے نااہل ہو سکتا ہے۔

والہ داغستانی کو قدرت نے شاعری کے اعلیٰ محاسن سے نوازا تھا وہ ایک کامیاب تذکرہ نگار بھی تھا اس کے تذکرہ کی زبان نہایت آسان اور رواں ہے گرچہ وہ ایرانی تھا اس کے باوجود اس کی زبان پیچیدگیوں سے مبرّا ہے فارسی تو فارسی وہ ترکی زبان سے بھی واقف تھا اور اس کے چند اشعار اس زبان میں ملتے ہیں اس کے دیوان میں ایک رباعی بزبان عربی اور ایک ریختہ میں ہے فقیر دہلوی کا بیان ہے کہ وہ نو سال ہی کی عمر میں ہر ایک کمال میں دولتمند ہو گیا تھا۔

زیں سال نہ سال چوں بسر شد — ہر یک ز کمال مایہ ور شد[2]

محمود افغان کا عہد سلطنت والہ داغستانی کے لیے خصوصاً اور ایرانیوں کے لیے عموماً نہایت برا ثابت ہوا محمود افغان کے ایک رفیق کریم داد نے والہ داغستانی کی محبوبہ خدیجہ سلطان سے بجبر شادی کر لی گرچہ اس کے رشتہ داروں کو یہ رشتہ بالکل ناپسند تھا خدیجہ سلطان کے والد کو مقید کر دیا گیا اور اس کی ماں کے شدید انکار کے باوجود کریم داد نے شادی کر لی۔[3] والہ داغستانی اپنی محبوبہ سے جدا ہو گیا اور آہ سرد کھینچنے لگا شادی تو ہو گئی مگر خدیجہ سلطان نے سسرال جانے سے انکار کر دیا تھا اور اپنے محبوبہ والہ سے ملتی رہتی تھی چند سال کے بعد نادر شاہ ایران کے تخت پر جلوہ افروز ہوا دھیرے دھیرے عوام میں یہ بات پھیلنے لگی کہ والہ داغستانی ابھی تک خدیجہ سلطان کا شیدائی ہے اور ملاقاتیں کرتا ہے

۱؎ احوال و افکار و آثار علی قلی والہ داغستانی ۲؎ والہ و سلطان ص ۲۰ مطبوعہ ۳؎ خزانہ عامرہ ورق ۲۴۰

فقیر دہلوی کا بیان ہے کہ دونوں کی محبت ایک پاک محبت تھی والہ داغستانی کو اس بات سے بہت افسوس ہوا کہ عوام میں اس کی عزت کے پرخچے اڑائے جا رہے ہیں اس لیے اس نے سفر ہند کا مصمم عزم کر لیا دوسری وجہ اس کے ہجرت ایران کی یہ بھی ہے کہ وہ نادر شاہ سے بھی ڈرتا تھا والہ داغستانی نے خود ریاض الشعراء کے دیباچہ میں لکھا ہے کہ سنہ ۱۱۴۶ھ میں وہ سمندری راہ سے ٹھٹھہ پہنچا اس نے تھوڑے دنوں تک خدا آباد (لڑکانہ) بھکر، ملتان اور لاہور میں بود و باش اختیار کیا بعدہٗ وہ دہلی پہنچا لاہور ہی میں اس کی ملاقات آزاد بلگرامی اور شاہ آفریں سے ہوئی تھی۔ آزاد بلگرامی لاہور سے دہلی تک والہ داغستانی کے ہمراہ آئے تھے۔ تذکروں سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ والہ داغستانی کی زندگی کے زیادہ دن دہلی میں گذرے مگر ایک دوبار وہ اودھ بھی گیا تھا خود اس نے لکھا ہے کہ محمد شاہ بادشاہ نے اس کو دو ہزار سوار، جاگیر، خدمت میر توزکی اور چار ہزاری منصب مرحمت کیا تھا بادشاہ احمد شاہ نے اس کو چھ ہزاری منصب اور خان زماں بہادر ظفر جنگ کا خطاب عطا کیا تھا[1] بادشاہ عالمگیر ثانی نے اس کو ہفت ہزاری کے عہدہ پر سرفراز کیا تھا۔[2]

والہ داغستانی ہندوستان میں بلند عہدوں پر فائز رہنے کے باوجود اپنی محبوبہ کو نہ بھلا سکا وہ شب و روز آہیں کرتا رہا لیکن آخر سنہ ۱۱۵۰ھ میں اس نے رام جنی نامی طوائف کو خدیجہ سلطان جیسی حسین و جمیل سمجھ کر اس سے شادی کر لی فقیر کے ذیل کے شعر سے تاریخ عروسی نکلتی ہے۔

زیں جشن عروسی سراپا امید   از عیش ابد گوش جان دادہ نوید

۱۔ مردم دیدہ ص ۱۰۰ ۔ ۲۔ نتائج الافکار

کردم چو بیان سال تاریخش	دل گفت وصال مشتری بانا ہید[1]

والہ داغستانی ہندوستان میں رہنے کے باوجود اپنی اصفہانی محبوبہ کو فراموش نہ کر سکا اس کا بیان ہے کہ اس نے اپنے کئی خط بذریعہ قاصد اپنی محبوبہ کی خدمت میں بھیجا تھا لیکن چونکہ وہ ہمیشہ کسی نہ کسی ذی وقار اور بڑی شخصیت کی زوجیت میں رہی اس لیئے کوئی قاصد بھی خط پہنچانے میں کامیاب نہ ہو سکا البتہ سجانہ نامی رقاصہ اور مغنیہ جو گھنانند کی محبوبہ تھی وہ والہ داغستانی کے خط کو خدیجہ سلطان تک پہنچانے میں کامیاب ہو گئی اس کے رقص و نغمہ کی وجہ سے کسی کو اس پر شبہ نہ ہوا اس نے وہاں سے اس کے خط کا جواب بھی لاکر والہ داغستانی کی خدمت میں پیش کیا فقیر دہلوی کے ذیل کے اشعار سے اس بات کا پتہ چلتا ہے۔

چابک پیکی سجانہ نامی	صرصر روشی صبا خرامی
سوی تو روانہ کردہ بودم	جبرش بخدانہ کردہ بودم[2]

والہ داغستانی نے خدیجہ سلطان کے فراق میں ہندوستان میں نہایت دردناک اشعار کہا ہے ذیل میں چند اشعار نقل کیئے جاتے ہیں۔

چہ پرسی برای کہ دیوانہ گشتم	برای خدیجہ برای خدیجہ
خواہم بہ سوی خدیجہ پرواز کنم	اما چہ کنم کہ بال و پر نیست مرا
چوں ہست بہ طالعم جنونی	دیوانۂ او چرا نہ باشم
من آں بلبل بی نصیبم کہ آخر	نہ شد روزیم سیر باغ خدیجہ
شوم سرخرو و بروی شہیدان	شود خون من گر حنائی خدیجہ[3]

فقیر دہلوی نے اپنی مثنوی میں والہ داغستانی کی اس حالت وکیفیت کا بھی

---

[1] کلیات فقیر دہلوی [2] احوال وافکار علی قلی خاں والہ داغستانی [3] دیوان والہ داغستانی رامپور

ذکر کیا ہے جس حال میں وہ خدیجہ سلطان کی شادی کے بعد غرق تھا ایک دن اس نے گدا کا لباس زیب تن کیا اور ہاتھ میں کاسہ لئے خدیجہ سلطان کی گلی میں خیرات عشق طلب کرنے پہنچا خدیجہ سلطان نے اس کی صدا لگانے کی آواز کو شناخت کر لیا اور ملازمہ کو بھیج کر دربار حسن میں طلب کیا فقیر دہلوی کا بیان ہے کہ وہ ساری رات اپنی معشوقہ کے دربار میں ایک ادنیٰ غلام کی طرح کیفیات عشق میں گم رہا اور صبح کے نمودار ہونے کے قبل ہی اپنی محبوبہ کی جوتی چرائی اور بھاگ گیا فقیر دہلوی نے مزید لکھا ہے کہ دونوں کا عشق سچا تھا اس لئے ہوس سے خالی تھا۔

تحقیق کنید کہ ایں گدا کیست　　　　وز ایں ہمہ زاری اش غرض چیست[۲۴]

والہ داغستانی کے کلام میں درد اور سوز اپنے کمال پر ہے عشق کی تلخیوں نے اس کے دل و جگر کو آتشکدہ بنا دیا تھا وہ ایک نامور تذکرہ نگار بھی تھا اس نے اپنے تذکرہ ریاض الشعراء میں تقریباً پچیس سو[۲۵] شعراء کے احوال قلمبند کیا ہے اور بعض ایسی باتیں لکھی ہیں جو اس کی صلاحیتوں پر دال ہیں۔

والہ داغستانی کی ایک بیٹی گنا بیگم کا تذکرہ کتابوں میں ملتا ہے جو فارسی اور اردو کی شاعرہ تھی والہ داغستانی کی وفات کے بعد اس کی شادی عماد الملک غازی الدین خاں وزیر عالمگیر ثانی سے ہوئی تھی وہ نہایت حسین و جمیل تھی۔

حاکم لاہوری، آزاد بلگرامی، اور مصحفی نے لکھا ہے کہ والہ داغستانی نے ۱۱۷۰ھ میں رحلت کی لیکن گلشن علی جونپوری اس کی ملازمت میں تھا اور اس نے اس کی وفات کے موقع پر ایک نہایت دردناک مرثیہ کہا تھا جس کے آخری مصرع سے ۱۱۶۹ھ کی تاریخ نکلتی ہے راقم حروف نے اس مرثیہ کو گلشن علی کے حالات کے باب میں نقل کیا ہے یہاں صرف اس شعر کو نقل کرتا ہے جس کے دوسرے مصرع سے تاریخ وفات نکلتی ہے۔

سال وصال او ازیں گونہ گفت گلشن　　　　با درد و عشق والہ ازیں جہاں جدا شد[۲۶]

---

[۲۶] ریاض الشعراء مخطوطہ حبیب گنج سیکشن علی گڑھ بحوالہ افکار و آثار والہ داغستانی۔ ۱۱۶۹ھ

زمین و آسمان دستِ دعا شد آفرین من ہم
نگہدارد خدا از چشمِ بد عبدالصمد خان را

(شاہ آفریںؔ)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ

شاہ آفریں نے کسی امیر یا وزیر کی مدح میں کوئی قصیدہ نہیں کہا کیونکہ یہ فعل ان کو پسند نہیں تھا قصیدہ گوئی کہ تعمیر چونکہ مبالغہ اور خوشامد پر ہوتی ہے اس لیے وہ اس کو برا سمجھتے تھے انھوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی منقبت میں بھی کوئی قصیدہ نہیں کہا ان کے دیوان میں فقط ایک ہی قصیدہ نعت میں ہے لیکن انھوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مدح میں کئی غزلیں کہی ہیں اور بے پناہ احترام و عقیدت کا اظہار کیا ہے ظاہر ہے آپ کا مقام نہایت بلند و ارفع ہے آپ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپ علم کے شہر ہیں آپ ہی نے در خیبر کو اکھاڑا تھا اور قلعہ خیبر کو فتح کیا تھا آپ کا تعارف محتاج بیان نہیں شاہ آفریں نے آپ کی مدح میں کئی غزلیں لکھی ہیں جن سے کچھ اشعار ذیل میں نقل کئے جاتے ہیں۔

رنگ باطل زدا علی رضا — مرشد حق نما علی رضا

مشکلات دو کون آسان کن — پیر مشکل کشا علی رضا

در گہش فتح باب عرفان است — قفل باطل کشا علی رضا

عاشقم عاشق آفریں دارم — درد دل را شفا علی رضا[1]

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۷

دوسری غزل کے چند اشعار:

تا چند آہ شعلہ کشند یا علی مدد | لرزد زغم چو شمع جسد یا علی مدد
موقوف یک بہار کرم ہیچو عنبر است | شد نامہ ام سیاہ مدد یا علی مدد
برق است پیش من نفس آرمیدہ | بیتابیم رساست مدد یا علی مدد
می نالد از ستمگری چرخ آفریں | جز تو بگو کہ داد دہد یا علی مدد[1]

تیسری غزل کے چند اشعار:

پیر بہ حق محمدؐ مشکل کشا علیؓ | یا مصطفیٰ محمدؐ و یا مرتضیٰ علیؓ
تا ہست کائنات بود خوشہ چین شان | نقل کرم محمدؐ و برگ و نوا علیؓ
امی ابی فدایت من ہم بخاک پاک | یا مصطفیٰ محمدؐ و یا مرتضیٰ علیؓ
از ہیچ درد شکوہ مکن آفریں مکن | ہر جا بود حکیم محمدؐ شفا علیؓ[2]

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی رح

شاہ آفریں مرد عارف اور باکمال صوفی تھے مذہب امامیہ کے پیرو ہونے کے باوجود نہایت احترام و عقیدت کے ساتھ حضرت بڑے پیر علیہ رحمتہ کی مدح میں ایک نہایت پرزور غزل مسلسل لکھی ہے ذیل میں اس غزل کے چند اشعار بطور نذرانہ قارئین کی خدمت میں پیش کیے جاتے ہیں۔

مسند بالغر خطایا غوث اعظم الغیاث
ای دست تو دست خدا یا غوث اعظم الغیاث

[1،2] دیوان شاہ آفریں ورق ۸۷، ۲۴۶

آرائش کون و مکان شمع و چراغ انس و جاں
شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ یا غوث اعظم الغیاث

ہم بحر بی ساحل توئی ہم پای تا سر دل توئی
سر چشمۂ نور خدا یا غوث اعظم الغیاث

گویند گر در مشکلی یادت کند آسان شود
مائیم مشکل ما جرا یا غوث اعظم الغیاث

ای لوح محفوظ خدا محظوظ ملحوظ ترا
ای محی دینِ مصطفیٰ یا غوث اعظم الغیاث

انی کہ دست قدرتت مبرم معلق می کند
خواہم شود فقرم غنا یا غوث اعظم الغیاث

اوتاد پا محکم ز تو اقطاب صاحب دم ز تو
ابطال و ابدالت فدا یا غوث اعظم الغیاث

چون آفریں عمریست تا از نفس کافر ماجرا
دشمن قوی بیچارہ ما یا غوث اعظم الغیاث[1]

نواب عبدالصمد خاں بہادر دلیر جنگ صوبہ دار لاہور

عبدالحکیم حاکم[2] لاہوری نے عبدالصمد خاں بہادر کے حالات زندگی لکھ...

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۸۲ [2] مردم دیدہ ص ۱۶۹

تفصیل سے لکھا ہے اس نے جس وقت اپنا تذکرہ ۱۱۷۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا نواب مغفور رحلت کر چکے تھے اس لیے ان کو نواب مغفرت نشان اور جنت مکان کے القاب سے یاد کیا حاکم لاہوری کے بیان کے مطابق وہ صاحب سیف، اور صاحب علم بھی تھے اس نے اپنے تذکرہ میں ان کی مدح میں دو شعر نقل کیا ہے جسے راقم حروف ذیل میں پیش کرتا ہے۔

بحر دل کوہ حلم کان کرم | در شجاعت بسان تیغ علم
مخزن فضل و قبلہ ابرار | چشم جان نور دیدۂ احرار

حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ ان کے اوصاف حمیدہ اور اخلاق پسندیدہ کو بیان کی حاجت نہیں ہے کیونکہ وہ جمع کمالات، اور جامع حسنات تھے جو سورج کی طرح عیاں ہے۔

حاکم لاہوری نے اگر نواب عبدالصمد خان کی مدح میں اشعار کہا تو کوئی بڑی بات نہیں کیونکہ صوفی گوشہ نشین اور شاعر باکمال شاہ آفریں نے خود ان کی مدح میں اشعار کہے ہیں یہ بات واضح ہو کہ شاہ آفریں نے کسی امیر یا وزیر کی تعریف میں کوئی قصیدہ نہیں لکھا وہ ایک ایسے صوفی اور اہل دل تھے جو دنیا والوں سے بہت کم ملتے تھے مگر اس کے باوجود ان کو نواب عبدالصمد خان سے ایسی محبت ہو گئی تھی کہ مجبوراً ان کو ان کی مدح میں شعر کہنا پڑا ذیل میں وہ اشعار نقل کیے جاتے ہیں جسے انھوں نے نواب مذکور کی مدح میں کہا ہے[1]

گزند عاقبت یارب مبادا دردمنداں را
سپند چشم زخم دردمی سوز نند رندان را

---

[1] دیوان شاہ آفریں ورق ۲۸

پسر ابتر چو گردد از پدر صلاح نپذیرد
کہ نتواند نمودن جمع گل بوی پریشاں را
بیک منعم چو گردی آشنا جیبت پر از در کن
صدف در بحر دارد انتظار ابر نیساں را
زمین و آسمان دست دعا شد آفریں من ہم
نگہ دارد خدا از چشم بد عبد الصمد خاں را

شاہ آفریں کی گوشہ نشینی اور امراء سے نفرت کا یہ عالم تھا کہ نواب عبد الصمد خاں نے جب آدمی بھیجکر اپنے دربار میں ان کو طلب کیا تو انھوں نے جانے سے انکار کر دیا آخر ایک نہایت قریبی عزیز اور مخلص کی تحریک سے انھوں نے نواب مذکور سے ملاقات کی نواب مرحوم نے ان کی نہایت تعظیم و تکریم کی اور ان کو اپنی مسند کے نزدیک بیٹھنے کے لئے جگہ عنایت کیا اور ایک روپیہ روزانہ ان کا وظیفہ مقرر کیا گیا۔

"نواب عبد الصمد خاں سیف الدولہ مرحوم مقرر خواہش دید نش کرد وکس بہ طلبش فرستاد' ابا نمود۔ آخر بہ تحریک عزیز عمدہ کہ از مخلصان صمیمش بود بنا بر پاس خاطرش با نواب مرحوم ملاقات کرد نواب مذکور خیلی تعظیم و توقیرش بجا آوردہ نزدیک بہ مسند خود جا داد و یک روپیہ یومیہ مقرر کرد۔"[1]

آج سے تقریباً ڈھائی سو سال قبل آفریں کو نواب مذکور کی طرف سے ایک روپیہ یومیہ کا وظیفہ مقرر تھا جو اس زمانہ میں کئی سو روپیے روزانہ کے

---

[1] مردم دیدہ ص ۲۰

برابر ہوتا ہے اس سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانہ میں کسی شخص کو تیس روپیہ ماہانہ کا وظیفہ ملنا معمولی عزت اور توقیر کی بات نہیں تھی اسلئے بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ جس کا نمک کھایا تھا ان کی مدح میں ایک شعر بھی نہ کہتے۔

نواب عبدالصمد خاں کے والد کا نام خواجہ عبدالکریم تھا ان کا خاندانی سلسلہ والد کی طرف سے قطب الواصلین خواجہ عبداللہ احرار قدس سرہٗ اور والدہ محترمہ کی طرف سے قطب عالم حضرت مخدوم اعظم قدس سرہٗ سے جا ملتا ہے الغرض نواب مذکور صحیح النسب سید تھے گرچہ ان کے آباؤ اجداد سمرقند کے رہنے والے تھے لیکن ان کی جائے پیدائش اکبرآباد (آگرہ) ہے حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ نواب مذکور دو تین سال ہی کی عمر میں اپنے والد کے ساتھ سمرقند چلے گئے تھے انھوں نے وہیں نشو ونما اور کسب علم کیا تھا اپنے والد کی وفات کے بعد انھوں نے سبحان قلی خاں بادشاہ توران سے تعلق پیدا کر لیا تھا اور دربار میں آتے جاتے تھے بعدہٗ وہ عہد عالمگیری میں ہندوستان آئے سب سے پہلے ان کو چھ صدی کا عہدہ ملا اور رفتہ رفتہ پندرہ سو صدی کے عہدہ پر پہنچے عبدالصمد خانی کا خطاب بھی ملا بادشاہ نے ان کو تنخواہ کے علاوہ جاگیر بھی عنایت کی تھی شاہی خلعت اور سرپیچ بھی بادشاہ نے ان کو عنایت کیا تھا جو کم ہی امراء کو اس زمانہ میں ملتے تھے نواب محمد امین خاں بہادر کے ہم زلف تھے اور اس وقت صدرالصدور کے عہدہ پر فائز تھے اکثر و بیشتر اوقات نواب عبدالصمد خاں کے ان کی صحبت میں گزرتے تھے مرہٹوں کی جنگ میں نواب مذکور نے کارہائے نمایاں انجام دیا تھا اس سے واضح ہوتا ہے کہ وہ ایک لائق سپہ سالار بھی تھے بادشاہ نے ان کو اس موقع پر انعامات سے نوازا تھا عالمگیر بادشاہ کی وفات کے بعد عہد بہادر شاہی میں انھوں نے اپنے آپ کو دربار سے الگ رکھا تھا بعدہٗ محمد معزالدین بادشاہ

اور ان کے بھائیوں کے درمیان جو جنگ واقع ہوئی اس میں انھوں نے رستم
کی طرح تکالیف اٹھا کر معاملات کو درست کیا بادشاہ مذکور نے ان کو فتح
و نصرت کے بعد ہفت ہزاری منصب اور غالب جنگ کا خطاب عنایت کیا
نواب عبدالصمد خاں کے بیٹے زکریا خاں کو اس موقع پر پنج ہزاری منصب اور
حاکم لاہوری کے والد شادمان خاں کو چار ہزاری منصب پر سرفراز کیا گیا تھا عہد
فرخ سیر میں نواب عبدالصمد خاں کو سات ہزاری منصب اور لاہور کی صوبہ داری
ملی تھی وہ اپنے امور کو انجام دینے کے لئے لاہور میں اقامت پذیر ہوگئے تھے
فرخ سیر بادشاہ نے تخت نشین ہونے کے بعد ان کو نہایت اعزاز اور الطاف
بیکراں سے نوازا اور دلیر جنگ کا خطاب بخشا تھا محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں
ان کو ملتان کی صوبہ داری عنایت ہوئی اور سیف الدولہ کے خطاب سے بھی سرفراز
ہوئے محمد شاہ نے ان کے بیٹے زکریا خاں کو لاہور کی صوبہ داری اور اعزالدولہ
ہزبر جنگ کا خطاب عنایت کیا تھا وہ ایک مدت تک اس عہدہ پر رہا نواب
عبدالصمد خاں کی وفات کے بعد ان کے بیٹے زکریا خاں کو لاہور اور ملتان کی
صوبہ داری کا منصب ملا تھا۔

مسرت کی بات ہے کہ نواب عبدالصمد خاں کے احوال راقم حروف کو
حاکم لاہوری کے تذکرہ سے بہت تفصیل سے مل گئے۔ حاکم لاہوری رقمطراز
ہے کہ نواب مذکور اور ان کے والد کے درمیان دوستی اور شفقت بدرجہ اتم
تھی۔ ہر روز آدھی رات تک دونوں سرگرم صحبت رہتے تھے شادماں خاں کی
وفات کے بعد نواب مذکور نے ان کے بیٹے حاکم لاہوری کے ساتھ نہایت

۱؎ مردم دیدہ ص ۱۷۹

مہربانی کا سلوک کیا اور وہ اس کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھتا تھا حاکم لاہوری اکثر و بیشتر ان سے ملتا رہتا تھا اور ایک سفر میں جب کہ بادشاہ بھی ان کے ساتھ تھا وہ بھی شریک سفر تھا حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ ایک بار نواب مذکور کے بیٹا زکریا خاں بہادر نے اس کی جاگیر جو واقع صوبہ لاہور کے مضاف میں تھی ضبط کر لیا تھا یہ بات اس نے نواب مذکور سے کہی اور سفارش کی درخواست کی تھی نواب مذکور نے فوراً اپنے بیٹا زکریا خاں کو میر منشی سے اس کے متعلق خط لکھوایا اور حاکم کے حوالہ کیا حاکم نے نواب مذکور سے عرض کیا کہ وہ بھی اپنے دست مبارک سے چند سطر لکھ دیں تاکہ اس کا کام بن جائے یہ سن کر نواب مذکور مسکرائے اور خط کے حاشیہ پر لکھ دیا راقم حروف ذیل میں نواب مذکور کے ان سطور کو نقل کرتا ہے جسے انھوں نے حاکم لاہوری کے خط پر لکھا تھا تاکہ قاری کو نواب مذکور کی شخصیت اور علم دانی کا اندازہ ہو سکے۔

"نور چشم من، جان من چوں روح شادماں خاں مرحوم درمیان است رعایت اینہا ضرور و واجب این ہا چنیں دانستہ اند کہ نوشتن این جانب بآں نور چشم اثر خواہد بخشید بجدّ می شوند کہ باید نوشت وازیں خبر ندارند کہ نوشتن این جانب بہ شما موجب خلل کار اینہا است۔"

حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ مذکورہ بالا خط کے پہنچتے ہی نواب زکریا خاں نے اس کی جاگیر بحال کر دیا اور فوجدار نے جو رقم روک رکھی تھی وہ بھی اس کو عنایت کی گئی حاکم لاہوری کا خیال ہے کہ ایسی شفقت اور مہربانی جیسی کہ نواب عبد الصمد خاں نے اس کے ساتھ کی تھی باپ بھی بیٹوں کے ساتھ نہیں کرتے ہیں۔

حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ نواب عبدالصمد خاں صفات ستودہ میں اپنے زمانہ میں بے نظیر اور یکتا تھے وہ تین چار سو لوگوں کی جماعت میں پنجگانہ نماز ادا کرتے تھے اور روزانہ سورہ احزاب اور نماز تہجد کبھی بھی ان سے ناغہ نہ ہوتی وہ روزانہ دو سو سے بھی زیادہ لوگوں کو کھانا کھلاتے تھے اپنے دسترخوان کے بچے ہوئے کھانے کو بھی اپنے ہاتھوں سے وہ تقسیم کرتے تھے سال میں ایک بار بزرگوں اور عزیزوں میں عیدین اور جاڑے کے موقع پر تین ہزار عمدہ خلعت تقسیم کرتے تھے نواب ممدوح کے محل میں ہندوستان، ایران اور توران کے شرفاء علماء اور اکابر حاضر ہوتے تھے اور اکثر و بیشتر وہاں قال اللہ وقال الرسول کا درس ہوتا تھا۔ وہ تمام حضار مجلس کو اپنے الطاف بیکراں سے اکثر و بیشتر نوازتے تھے ظہر اور عصر کے درمیان محفل مشاعرہ گرم ہوتی تھی اور وہ دیوان میرزا صائب کے بعض معنی خیز اشعار کو حل کرتے تھے حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ گرچہ اس نے نواب اعتماد الدولہ وزیر سابق اور نواب صفدر جنگ وزیر لاحق کی مجلس سے استفادہ کیا تھا لیکن جس آداب مجلس کا مشاہدہ نواب عبدالصمد خاں کی مجلس میں اس کو ہوا تھا وہ کہیں نہیں ہوا بلاشبہ نواب عبدالصمد خاں شعراء علماء فضلا اور دانشوروں کے سرپرست تھے انھوں نے جس فراخ دلی سے اہل علم و سخن کی سرپرستی کی اس کا اندازہ قاری کو سطور بالا سے ہوا ہوگا حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ تقریباً سولہ سال تک وہ نواب مغفور کی صحبتوں سے فیضیاب ہوتا رہا اس کے علاوہ سیکڑوں اہل علم اور دانشوروں نے ان کی علم پروری اور بخشش و الطاف سے استفادہ کیا

سلہ مردم دیدہ ص ۱۷۱

ایک روز نواب مذکور نے حاکم لاہوری سے فرمایا کہ اپنا کوئی شعر پڑھیے حاکم نے ذیل کا شعر پڑھا۔

ہر چند بہ روشن دلی ام جائے سخن نیست
چوں آئینہ غماز شدن شیوۂ من نیست [1]

نواب مذکور نے اس شعر پر اعتراض کیا کہ جو روشن ہے وہ غماز ہے حاکم [2] نے جواب دیا کہ بے شبہ ہر روشن شے غماز ہے لیکن میں باوجود روشن دلی غماز نہیں ہوں اس نے ایسے ہی نکتہ کے لئے شوکت کے ذیل کا مصرع پڑھا۔

کافور ما کسے کہ خورد مردمی شود

نواب عبدالصمد خاں یہ سن کر محظوظ ہوئے اور تعریف کی۔

نواب عبدالصمد خاں کی طبیعت میں بلندی اور مشکل پسندی تھی اس لئے ہر شعر کو وہ کسی اور ہی رنگ میں دیکھنا چاہتے تھے جب وہ دکن میں تھے کبھی کبھی کوئی غزل اور شعر بھی کہتے تھے ذیل میں ان کا ایک شعر نقل کیا جاتا ہے۔

تا عیب کسے بر رو نہ گویم چوں آئینہ از صفا گذشتیم

نواب مذکور نے ایک بار مجلس میں فرمایا کہ انسان اپنی زندگی میں کسی نہ کسی چیز کی تلاش میں ہمیشہ غرق رہتا ہے خواہ وہ بیٹھا ہو، کھا رہا ہو، چل رہا ہو یا سو رہا ہو لیکن جب اس کی موت ہو جاتی ہے اس کو آرام مل جاتا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ کاروبار دنیا اور اس کی مصروفیات سے تھک گئے تھے اور موت کے متلاشی تھے۔

مرزا محمد بیرنگ نے نواب مذکور کی مدح میں ایک قصیدہ کہا تھا جس کے

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۷۲ مطبوعہ [2] مردم دیدہ ص ۱۷۳

چند اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں۔

خامہ را ہر گاہ می پرسم کہ ممدوح تو کیست
نام سیف اللہ، عبدالصمد خاں می برد
آں دلیر عرصۂ جنگ آں بہادر روز بزم
آنکہ تیغش رنگ از روئے ہزبراں می برد
قدر دانا قدر من نشناخت کس از ناکساں
حیف کس آئینہ را در شہر کوراں می برد
برامید قدردانی آمدم در حضرتت
خود سخن صاحب سخن پیش سخنداں می برد[1]

حاکم[2] لاہوری نے لکھا ہے کہ ایک روز ملتان میں نواب عبدالصمد خاں نے اس سے پوچھا کہ منصف کے اشعار اچھے ہیں یا شاہ آفریں کے؟ حاکم نے جواب دیا شاہ آفریں را چہ نسبت با منصف است یعنی آفریں بھلا منصف کا کیا مقابلہ کریں گے حاکم نے ایسا اس لئے کہا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ نواب مذکور کو منصف سے زیادہ تعلق ہے نواب یہ جواب سن کر واقعی خوش ہوئے۔ لیکن حاکم کا خیال ہے کہ آفریں سے منصف کا کیا مقابلہ ہو سکتا ہے۔

...... اشعار منصف مرحوم بہتر است یا افکار شاہ آفریں؟
احقر نظر بر اخلاص و اعتقاد ایشاں گفتم: شاہ آفریں را چہ
نسبت با منصف است ازیں خیلی مزاج مبارک نواب
خوش شد ...... بر اہل سخن معلوم است کہ منصف

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۵۷ [2] مردم دیدہ ص ۹۲

را بہ شاہ آفریں چہ مناسبت لیکن بنابر پاس خاطر مبارک نواب مغفور حرفی گفتم و ایشاں را خوش کردم[1]۔"

حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ نواب ممدوح نے نادر شاہ کی آمد سے ایک سال قبل ۱۱۵۰ھ میں وفات پائی۔ کسی نے تاریخ وفات میں ذیل کا مصرع کہا تھا۔

"زہے وصل عبدالصمد خاں بحق"

ابوالبرکات خاں صوفی نے بھی اس موقع پر تاریخ کہی تھی ملاحظہ ہو۔

احرار دوم رفت[2]ھ

---

[1] مردم دیدہ ص۹۳ [2] مردم دیدہ ص۱۷۲،۱۷۱

باب نہم
شاگردان شاہ آفرین لاہوری

کردم فرامش از دل شعر اسیر و صائب
تا خواندہ ام فصاحت دیوانِ آفریں را

ملا نتھو فصاحت
شاگردِ شاہ آفریں

شاہ عبدالحکیم حاکم لاہوری

عبدالحکیم کے نام سے مشہور ہے اور حاکم تخلص تھا لیکن چند تذکروں میں ان کو حکیم بیگ خاں کہا گیا ہے خوشگو[1] نے لکھا ہے کہ اس کے والد کا نام شادماں خاں تھا اور وہ لاہور کا صوبہ دار تھا حاکم کا بیان ہے کہ بہ عہد اورنگ زیب اس کے والد بلخ سے دکن میں اقامت پذیر ہوئے تھے عالمگیر بادشاہ نے اس کو ایک ممتاز منصب عنایت کیا تھا عالمگیر بادشاہ کی وفات کے بعد شادماں خاں نے مراد آباد میں سکونت اختیار کیا تھا حاکم لاہوری اپنے بیان کے مطابق ۱۱۲۰ھ میں مراد آباد میں پیدا ہوا عالمگیر بادشاہ نے پچاس سال ذو ماہ اور ۲۸ دن حکومت کی تھی لیکن اس کے بعد بہادر شاہ اور جہاندار شاہ بہت کم مدت تک بادشاہ رہے اس عہد میں حکومت کے امراء کے درمیان بہت جھگڑے رہے اور خانہ جنگی ہوتی رہی اس لئے شادماں خاں ان دنوں مراد آباد میں مقیم تھے لیکن فرخ سیر بادشاہ جب تخت نشین ہوا اور ملک میں امن و امان قائم ہوا تو حاکم لاہوری کے والد نے اپنے خاندان کے لوگوں

---

[1] سفینۂ خوشگو ص ۲۶۷

کے ساتھ لاہور میں بود و باش اختیار کیا عبدالحکیم حاکم کو تذکروں میں لاہوری کہا گیا ہے لیکن اصل میں اس کو مرادآبادی کہنا چاہیے کیونکہ اس کی ولادت مرادآباد میں ہوئی تھی اس کی تعلیم و تربیت اس زمانہ کے نامور علماء کے زیر سایہ ہوئی اس کو کتابوں کے مطالعہ کا بہت شوق تھا وہ اکثر و بیشتر قدیم شاعروں کے دیوان کو بھی پڑھتا تھا اس کے والد نے لاہور میں وفات پائی اس وقت وہ پندرہ سال کا تھا اسی وقت سے اس نے اپنی شاعری کا آغاز کیا تھا اس نے فن شاعری میں اس عہد کے نامور صوفی شاعر شاہ آفریں سے اصلاح لی تھی۔ شاہ آفریں اس کی بہت عزت کرتے تھے اور کمال محبت سے پیش آتے تھے فارسی شعراء نے کثرت سے حُبِّ زر میں قصیدے کہے ہیں اور ممدوح کی تعریف میں مبالغہ سے کام لیا ہے لیکن شاہ آفریں نے کسی کی مدح میں قصیدہ نہیں لکھا۔ مگر اپنے شاگرد حاکم لاہوری کی شادی کے موقعہ پر بطور مبارکباد ایک غزل کہی تھی جس کے چند اشعار ذیل میں نقل کیے جاتے ہیں جس سے یہ بات واضح ہو گی کہ شاہ آفریں کو اپنے شاگرد حاکم لاہوری سے کتنی محبت اور الفت تھی اس کی مثال حضرت نظام الدین اولیاء اور حضرت امیر خسرو کی محبت و الفت سے پیش کی جا سکتی ہے شاہ آفریں کی دعاؤں کی وجہ سے حاکم لاہوری کا نام فارسی شعراء اور تذکرہ نگاروں کی فہرست میں روشن ستارہ کی طرح چمک رہا ہے۔

بگو بہ حاکم ما ای صبا مبارکباد	ترا ز مادر ارض و سما مبارکباد[1]
ز بس دعای تو در د زباں پاکانست	کند فرشتہ بدست دعا مبارکباد

---

[1] دیوان آفریں مخطوطہ برٹش میوزیم ورق ۱۲۷

مدام منزل عیش تراز بلبل و گل | ہزار قافلہ برگ و نوا مبارکباد
چنیں کہ صورت و معنی ز تست ای حاکم | ز آفریں و ہم از اولیا مبارکباد

حاکم لاہوری آفریں کا شاگرد تھا جیسا کہ خود اس کے ذیل کے بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

"گاہ گاہے مصرعے بیتے موزوں می کردم تا آنکہ بخدمت مخدومی شاہ آفریں مستفید شدم، و اصلاح از ایشاں می گرفتم[1]"

حاکم کو اس زمانہ کے باکمال صوفی مولانا فخر الدین فخر جہاں علیہ الرحمہ سے بھی گہری عقیدت تھی اس نے خود اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ اس نے ان سے چند وظیفے اور دعائیں بھی سیکھی تھیں یہاں پر یہ بات بھی واضح کر دینا مناسب ہو گا کہ مولانا فخر الدین کی بزرگی سے متاثر ہو کر عماد الملک نظام نے بھی ان سے شرف بیعت حاصل کیا تھا ذیل میں حاکم لاہوری خود رقمطراز ہے۔

"میر فخر الدین حق آگاہ عارف باللہ جامع الکمالات، مجمع الحسنات کوہ حلم و تمکین .... در علوم ظاہر و باطن آراستہ .... فقیر اکثر در خدمت ایشاں سعادت حاصل میکند .... بر فقیر بسیار شفقت و توجہات می فرمایند، چیزے ارشاد فرمودہ اند انشاء اللہ تعالیٰ بوطن رسیدہ بہ عمل خواہم آورد امید دارم کہ اثرے بہ بخشد[2]"

حاکم لاہوری اس عہد کے جلیل القدر بزرگ حاجی محمد شریف قدس سرہٗ کا مرید تھا دادی محترمہ کی طرف سے وہ حسینی سید تھا اس کی دادی

---

[1] مردم دیدہ صفحہ ۱۹۲ [2] مردم دیدہ صفحہ ۱۸۰

محترمہ قاضی میر یوسف کی دختر تھیں عہد محمد شاہی میں حاکمؔ لاہوری ایک بلند عہدہ پر جلوہ افروز تھا لیکن اپنی حیات کے اواخر میں ترک دنیا اختیار کیا تھا اور معتکف ہو گیا تھا اس نے خود لکھا ہے کہ اس کی زندگی کے کچھ ایام کشمیر اور دہلی میں گذرے وہ اپنے عہد کا ایک صوفی اور نہایت پرہیز گار انسان تھا اس نے بہت خوشی اور خرمی کے ساتھ زیارت حرمین اور حج بھی کیا تھا اس نے مکہ معظمہ میں اس موقعہ پر جو اشعار قلم بند کیا تھا ان میں سے چند اشعار تبرکاً پیش کرتا ہوں۔

زہے چاہ زمزم خوشا آب او	کہ از لوح عصیاں کند شستن و شو
حرم مسجد خانۂ کعبہ است	سرم ماجد خانہ کعبہ است
بود صحن آں صحن خلد بریں	منور بہ نور حق آمد یقیں
یکے باب عمر داست ثانی سلام	بہ باب خلیلش سیم نیک تمام
کشد بیشتر دل بہ باب نبیؐ	کہ ہستم سگے از جناب نبیؐ [1]

تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حاکمؔ لاہوری کو صوفیوں، شاعروں اور عالموں سے ملنے کا اشتیاق تھا۔ نور العین واقفؔ سے اس کے رفیقانہ تعلقات تھے اور ۱۱۶۸ھ میں اورنگ آباد کے سفر میں وہ اس کے ساتھ تھا آزاد بلگرامی سے بھی اس کی ملاقات اورنگ آباد ہی میں ہوئی تھی [2] اس نے لکھا ہے کہ اس کی ملاقات چند بار اس دور کے نامور تذکرہ نگار اور شاعر علی قلی خاں والہؔ داغستانی سے بھی ہوئی تھی۔ خود اس کا بیان ہے کہ اس کے والد عالمگیر بادشاہ کے دور سلطنت

---

[1] دیباچہ مردم دیدہ ص ۱۰،۱۱ [2] خزانہ عامرہ ص ۲۰۱ [3] مردم دیدہ ص ۱۰۱

میں ہفت صدی کے عہدہ پر تھے عہد فرخ سیر میں اسد کے والد تین ہزاری اور دور محمد شاہی میں پانچ ہزاری کے عہدہ پر ممتاز تھے اپنے استاد شاہ آفریں کی وفات پر اس نے تاریخ کہی تھی جسے ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

رفت نقاد معنی از عالم[1]

قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ حاکم لاہوری کی شاعری میں بلاغت اور فصاحت ہے تذکروں کے مطالعہ سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس نے اس عہد کے ایک ایرانی شاعر والہ داغستانی کی صحبتوں سے بھی استفادہ کیا تھا ایک دن وہ جب والہ داغستانی سے ملنے گیا تو اس وقت وہ محو غزل گوئی تھا جس کا ایک شعر یہ ہے۔

آب حیات دکیمیا عمر دوبارہ و وفا
ایں ہمہ می رسد بہم یار بہم نمی رسد

والہ داغستانی کے اصرار پر حاکم لاہوری نے بھی اسی رنگ میں ایک غزل کہی جس کے دو اشعار قلمبند کئے جاتے ہیں

یاد زمانہ ی کہ من گل بہ خزاں بہ چیدی
موسم گل بہ بیں کنوں خار بہم نمی رسد
صبر و قرار جان و دل مصرع داہم ربود
ایں ہمہ می رسد بہم یار بہم نمی رسد

حاکم نے لکھا ہے کہ والہ داغستانی نے اس کے مندرجہ بالا اشعار سن کر

---

[1] خزانہ عامرہ ص ۲۸

بہت خوشی کا اظہار کیا اس کو والہ داغستانی سے دلی تعلق تھا اس لئے اس کے انتقال پر اس نے تاریخ وفات کہی تھی ملاحظہ ہو۔

پیوست بہ رحمت والہ

حاکم لاہوری کو مولانا روم سے انتہائی عقیدت تھی اور وہ بیشتر اوقات مثنوی معنوی کا مطالعہ کرتا تھا راقم حروف کا خیال ہے کہ مثنوی معنوی کے مطالعہ نے اس کو صوفی بنا دیا تھا کیونکہ مولانا روم کا یہ دعوی غلط نہیں ہے۔

ہر کہ زیں بری رود آید بہ بام   سر زبان آسمانی است ایں کلام

وہ ۱۱۷۱ھ میں بمقام رائے بریلی معتکف ہوگیا تھا تذکروں سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ حاکم نے اول اپنے تذکرہ "مردم دیدہ" کا نام تحفۃ المجالس مقرر کیا تھا لیکن مولانا آزاد بلگرامی کی صلاح سے اس نے اس کا نام "مردم دیدہ" رکھا اس کا یہ تذکرہ اپنے عہد کا ایک اہم تذکرہ ہے جسے اس نے ۱۱۷۵ھ میں پایۂ تکمیل کو پہنچایا تھا راقم حروف کو باوجود تلاش و جستجو کے اس کی رحلت کی تاریخ دستیاب نہ ہو سکی اس لئے یہ لکھنا مشکل ہے کہ کب اس نے وفات پائی اس کے بیان سے صرف اتنا علم ہو سکا کہ ۱۱۷۵ھ میں وہ "تکیہ شاہ محمود" میں گوشۂ تنہائی میں تھا اس لئے یہ بات قرین قیاس ہے کہ ۱۱۷۵ھ کے بعد ہی وہ معبود حقیقی سے جا ملا ہوگا ذیل میں اس کے چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں تاکہ اہل نظر اس کی شاعری کے مقام سے واقف ہوں۔

آں بے وفا اگر خبر از حال ما گرفت
روزے خبر گرفت کہ آمد عزا گرفت

کار من تنہا ز درد دل نہ از دل ما گذشت
درد اگر ایں است می باید مرا از جاں گذشت

جان شیریں را فدائے یار چوں فرہاد کرد
بے ستوں از درد تنہائی مرا فریاد کرد

در گلستانت کہ جز من بلبل زارے نہ بود
بود گل صد رنگ اما قسمتم خارے نہ بود

حاکم لاہوری نے شاہ آفریں کے ایک اور شاگرد کا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا ہے جو عنقا کے نام سے مشہور تھا وہ بہت عالی فطرت تھا اور عالمگیر بادشاہی کے دور سلطنت میں اس نے وفات پائی دوسرے تذکروں میں اس کے حالات نہیں ملتے راقم حروف کو اس کا ذکر کرنا لازم تھا کیونکہ وہ شاہ آفریں کا شاگرد تھا حاکم لاہوری نے اس کے چند اشعار نقل کئے ہیں جسے یہ کمترین ذیل میں قلمبند کرتا ہے۔

ہیچ کس را نہ بود تاب جوابت
بشکند حرف تو دندان اویس قرنی (رضؓ)

در نعت

در انگشت خاتم بود عار او — سلیمانؑ بود مہر بردار او

در منقبت

علیؓ ولی شاہ مرداں لقب — زند نعرہ ای گر زند از غضب
بہ لرزد زمیں چوں کف روی آب — سر آسماں بشکند چوں حباب

میر معصوم وجدآن

میر معصوم نام اور تخلص وجدآن تھا وہ عالی نسب خاں کے نام سے مشہور تھا۔ سراج الدین علی خان آرزو[1]، بھگوان داس ہندی[2] اور قدرت اللہ[3] نے لکھا ہے کہ وہ میر محمد زمان راسخ کا بیٹا تھا عبدالحکیم حاکم لاہوری سے اس کی ملاقات لاہور میں ہوئی تھی اس لیے حاکم لاہوری کے بیان کو زیادہ اہمیت ہے اس کا بیان ہے کہ میر معصوم وجدآن حضرت سید میر کلال قدس سرہٗ کی اولاد میں سے تھے جن کا خاندانی سلسلہ سادات سہرند سے جاملتا ہے اور وجدان شاہ آفریں کا شاگرد تھا۔

"میر معصوم وجدآن از اولاد حضرت سید میر کلال است
قدس سرہٗ از سادات سہرند است در عہد فرخ میر برفاقت
میر جملہ مرحوم بہ لاہور رسیدہ ویک دو دفتر مثنوی معنوی نزد
شاہ آفریں گذرانید قدری اصلاح شعر ہم گرفتہ[4]"

خان آرزو نے لکھا ہے کہ میر معصوم وجدآن میر محمد علی رائج، مرزا عبدالقادر بیدل، شاہ ناصر علی اور فقیر اللہ آفریں نے شاعری میں ایک ہی روش کو اختیار کیا تھا۔ ہندی[5] نے بھی آفریں اور وجدان کے کلام کو اسی طرح کہا ہے۔ خان آرزو ہندی، اور قدرت اللہ نے بھی لکھا ہے کہ وجدان مدت مدید تک نواب سیف اللہ

۱؎ ۲؎ ۳؎ نتائج الافکار ص ۷۷۹ ... سفینۂ ہندی ص ۲۲۲، ۵؎ بحوالہ مردم دیدہ ص ۱۰۶، ۷۷

عبدالصمد خاں بہادر صوبہ دار لاہور و ملتان کا رفیق رہا اور نواب مذکور کی وفات کے بعد اس کے بیٹا نواب زکریا خاں بہادر نے اس کی کفالت کی حاکم لاہوری کا بیان ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

"بعد فوت ایشاں زکریا خاں بہادر نیز ہماں مدد خرچ بحال داشت[1]"

خان آرزو[2] اور ہندی[3] کا بیان ہے کہ جو کچھ وظیفہ صوبہ دار لاہور و ملتان سے ملتا تھا اس کو وہ جلد خرچ کر دیتا تھا اس لئے مقروض رہتا تھا سیف الدولہ عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور خرچ معاش کے علاوہ دیگر اخراجات کے لئے بھی اس کو رقم دیتا تھا۔

حاکم لاہوری[4] نے لکھا ہے کہ وجدان عہد بادشاہ فرخ سیر میں میر جملہ مرحوم کے ساتھ لاہور آیا تھا اور اس نے مثنوی معنوی کی ایک یا دو جلد شاہ آفریں کو ھدیۃً پیش کیا تھا اس نے ایک موقعہ پر حاکم لاہوری سے یہ کہا تھا کہ وہ بھی اس کے استاد (آفریں) کا شاگرد ہے۔

"نزد ایں فقیر اظہار ایں معنی نمودہ کہ من ہم شاگرد استاد شمایم[5]"

خواجہ سنگین مخاطب بہ غلام محی الدین نے بھی ایک زمانہ میں اس کی رفاقت کی تھی مولوی شرف الدین کی وساطت سے وجدان کو نواب عبدالصمد خاں کے یہاں ملازمت مل گئی تھی مولوی شرف الدین کشمیری اس زمانہ میں نائب نواب تھا وہ بہت شاعر نواز شعر فہم اور مخلص تھا

۱، ۴، ۵ مردم دیدہ ص ۱۰۶، ۱۰۸ ۳ سفینۂ ہندی ص ۲۲۳

اس نے وجدان کے سارے اخراجات کا ذمہ لیا اور [illegible] چند برس تک
اس زمانہ میں ہر روز عصر سے قبل مولوی شرف الدین کشمیری کی سرپرستی میں مشاعرہ ہوتا تھا اور وجدان محفل مشاعرہ کا ناظم ہوتا تھا حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ چند سال کے بعد اس کے اور وجدان کے درمیان گہرا اتحاد اور اخلاص ہوگیا تھا اور ایک مدت تک نورالعین واقف وجدان، میر زین العابدین عاطر اور حاکم لاہوری مجالس غزل گوئی کی صحبت میں لاہور میں رہے حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وجدان بہت صاحب قدرت اور صاحب تلاش تھا اس کے اشعار میں بہت شوخی اور رنگینی پائی جاتی ہے وہ نئے نئے مضامین کو شاعری کے قالب میں ڈھالتا تھا اور سنگلاخ زمینوں میں بھی اس نے اشعار کہے ہیں۔ اس کے ایک قصیدہ کا مطلع پیش کیا جاتا ہے جو نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور کی مدح میں ہے۔

مرادے است کہ باشد بدرد کارش و خندد
چو غنچہ کہ بود جا بہ نیش خارش و خندد

وجدان کے دیوان میں تقریباً بیس ہزار اشعار ہیں غزلوں کے علاوہ قصائد اور مثنویاں بھی اس نے کہی ہیں وہ اکثر حاکم لاہوری کے مکان پر جاتا تھا اور صحبتیں گرم رہتی تھیں وہ اپنے عہد کا ایک مسلم الثبوت استاد تھا۔ حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وجدان ایک روز نواب عبدالصمد خاں صوبہ دار لاہور کی خدمت میں ایسے وقت میں پہنچا کہ دو آدمی کے علاوہ کوئی نہ تھا نواب مذکور نے ناشتہ کے لئے نان، خربوزہ، اور پنیر منگوایا اور ایک

۱،۲،۳؎ مردم دیدہ صفحہ ۱۰۱

[illegible] اور پنیر دیا لیکن
وجدان کو نان اور خربوزہ ملا اس نے از راہ مذاق کہا کہ بندہ کو بھی لوگ
اس شغل میں شیعہ سمجھتے ہیں اس لئے آپ مجھے پنیر کیوں نہیں دیتے
ہیں اس لطیفہ سے نواب مذکور بہت خوش ہوئے اور نہایت مہربانی
اور خوشی کے ساتھ پنیر اس کو عنایت کیا نواب کے مصاحبوں میں سے
بعض نے رشک و حسد کی وجہ سے وجدان کو شیعہ مشہور کر دیا تھا حالانکہ
وہ سنّی تھا نواب عبدالصمد خاں کی وفات کے بعد مجلس مشاعرہ برہم ہو گئی
کیونکہ ان کے بیٹا زکریا خاں کو محفل مشاعرہ سے دلچسپی نہ تھی بعدہٗ نواب
زکریا خاں کے بیٹے میر یحییٰ خاں و شاہ نواز خاں کے درمیان جنگ ہوئی اور
وجدان نے اسی زمانہ میں فالج یا لقوہ کے مرض میں جمادی الثانی سنہ ۱۱۶۱ھ
میں لاہور میں ساٹھ سال سے زیادہ کی عمر میں انتقال کیا ذیل میں اس کے
چند اشعار نقل کئے جاتے ہیں۔

دلے بیا و رو بہ میخانہ عاشقانہ در آ
بگو کہ شیشہ فروشم بایں بہانہ در آ

نیامدی و شب آمد نہ بے حواسی ہا   گہے زمیں نگرم گاہ آسماں تنہا

چشم در راہ طلب ہرچند می داند مرا
نامہ ہای خواند آں شوخ و نمی خواند مرا

زبسکہ از لب او گشتہ شرمگیں یاقوت
بقصد خانہ نشینی شود نگیں یاقوت

جان حاضر ست بستاں، دل میکنی طلب، نیست
یک شیشہ بود بشکست پہلوی من حلب نیست

پس از مردن مرا آں سرو قامت بر مزار آمد
قیامت آمد امّا بعد چندیں انتظار آمد

مرزا محمد بیرنگ

تذکروں میں عام طور سے بیرنگ کے حالات نہیں ملتے بھگوان داس ہندی، لطف علی بیگ آذر، قدرت اللہ اور رضا قلی خاں ہدایت سے بھی اس کے متعلق ایک لفظ نہیں لکھا عبد الحکیم حاکم لاہوری نے ایک بار اس کے مکان پر اس سے ملاقات کی تھی وہ اس سے نہایت تپاک سے ملا تھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اپنے مکان کے اندر لے گیا تھا اس نے حاکم لاہوری کو اپنی چند غزلیں اور ایک دو قصیدے منقبت میں سنایا تھا اس سے واضح ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان گہرے تعلقات تھے اسی ملاقات میں بیرنگ نے شاہ آفریں کا ذکر نہایت تعظیم کے ساتھ کیا اور کہا کہ اس عہد میں شاہ آفریں اور میر محمد علی رائج استاد ہیں اور ان کی ہستی بہت غنیمت ہے۔

حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ بیرنگ مرد فاضل، حکیم اور شاعر تھا وہ لاہور میں اقامت پذیر تھا نواب عبد الصمد خاں کے منصب داروں میں سعادت قلی خاں بیرنگ کا رفیق تھا بعدہٗ نواب مذکور نے اس کو ایک ملازمت عنایت کی تھی اور اس نے نواب کے مصاحبوں کا درجہ حاصل کر لیا تھا بیرنگ کے تعلقات نواب سے اتنے بڑھے کہ
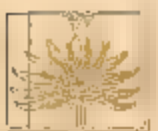
اس نے اس کی مدح میں ایک شاندار قصیدہ بھی کہا اور صلہ میں خلعت اور انعامات ملے ذیل میں اس قصیدہ کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

خامہ را ہر گاہ می پرسم کہ ممدوح تو کیست
نام صیف الدولہ عبد الصمد خاں می برد
آں دلیر عرصۂ جنگ، آں بہادر روز رزم
آنکہ تیغش زنگ از روئے ہزبراں ہی برد
قدر دانا قدر من نشناخت کس از ناکساں
حیف کس آئینہ را در شہر کوراں می برد
بر امید قدر دانی آمدم در حضرتت
خود سخن صاحب سخن پیش سخنداں می برد

بیرنگ نے شاعری میں استاد کا مقام اپنی حیات میں حاصل کر لیا تھا اور وہ محمد نظام معجز اور میر عبد الصمد سخن کا ہم مشق تھا اس کو میرزا جلال اسیر اور عبد اللطیف خاں تنہا کا طرز پسند تھا اور انھیں کے تتبع میں شعر کہتا تھا بیرنگ نے لکھا ہے کہ جب ہم لوگ نو مشق تھے اس وقت شاہ آفریں اور میر محمد علی رائج نے شاعری کو درجۂ نہایت پر پہنچا دیا تھا۔ حاکم لاہوری نے ایک روز بیرنگ اور وجدان کو ملتان میں ایک باغ میں دیکھا تھا بیرنگ اور وجدان دونوں میں ہنسی مذاق ہو رہا تھا۔ وجدان بیرنگ کے ساتھ عزیزوں جیسا سلوک کرتا تھا بیرنگ نہایت صاحب علم و حلم تھا اس وقت اس کی عمر ساٹھ سے زیادہ تھی حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ بیرنگ اور رائج نے ایک ہی دن چند گھنٹہ کے فاصلہ سے لاہور میں وفات پائی بیرنگ کے شاگرد خیر اللہ فدا نے ذیل کی تاریخ

وفات کہی جس میں ایک عدد زیادہ ہے۔

"باقی باللہ شد بیرنگ در بزم بقا"

واضح ہو کہ حضرت خواجہ باقی باللہ کا تخلص بھی بیرنگ تھا مرزا محمد بیرنگ حضرت خواجہ باقی باللہ کا ہم تخلص تھا شاید اسی وجہ سے مرزا محمد کو زیادہ شہرت نہ مل سکی بیرنگ کے دیوان میں تقریباً چار ہزار اشعار ہیں اس نے قصیدے، نعت، منقبت اور مثنوی بھی کہی ہے اس میں شبہہ نہیں کہ وہ اپنے زمانہ کا ایک نامور شاعر تھا لیکن افسوس کی بات ہے کہ اس کی زندگی کے بعض اہم حالات معلوم نہ ہو سکے اگر حاکم لاہوری نے "تذکرہ مردم دیدہ" نہ لکھا ہوتا تو شاید اتنا بھی معلوم نہ ہو سکتا جتنا کہ راقم حروف نے قلمبند کیا ہے ذیل میں بیرنگ کے چند اشعار لکھے جاتے ہیں جن سے اس کی شاعری کے معیار کا اندازہ ہوگا۔

بادام، ز چشم او مزن دم — اے جستہ تراچہ درد ماعت

ایں زندگی بلاست ز سر وا نمی شود

سر بارہا بہ تیغ بریدیم ہم چو شمع

الفت آموختی دل مارا — سوختی سوختی دل مارا

میر محمد زمان مفتون

مفتون کے حالات بالکل نایاب ہیں، بھگوان داس ہندی[1] اور قدرت اللہ[2]

---

[1] سفینۂ ہندی [2] نتائج الافکار

نے بھی مفتون کا ذکر تک نہیں کیا عبدالحکیم حاکم لاہوری کا "تذکرہ مردم دیدہ"
ہی واحد تذکرہ ہے جس میں مفتون کا کچھ ذکر ہے مگر نہایت تشنہ ہے۔
حاکم لاہوری[1] کی پہلی ملاقات مفتون سے اس کے استاد شاہ آفریں
لاہوری کے دولت کدہ پر ہوئی تھی بعدہ وہ اکثر و بیشتر حاکم لاہوری سے
ملتا رہا لیکن باوجود اس کے حاکم لاہوری نے اس کے احوال کو تفصیلی طور پر
نہیں لکھا ہے اس نے یہ بھی نہیں لکھا کہ اس کے والد کون تھے اور کہاں
کے رہنے والے تھے صرف اتنا لکھا ہے کہ اس کا نام میر محمد زمان اور تخلص
مفتون تھا اس نے شاعری میں شاہ آفریں سے اصلاح لی تھی اور ان دنوں
وہ لاہور ہی میں اقامت پذیر تھا وہ پختہ شاعر نہیں تھا کیونکہ کبھی کبھی فکر
شعر کرتا تھا حاکم لاہوری کو اس کے اشعار بھی دستیاب نہ ہو سکے اس
لیے اس نے اس کا صرف ایک ہی شعر اپنے تذکرہ میں نقل کیا ہے وہ شعر
ذیل میں نقل کیا جاتا ہے۔

چاک پیراہن کہ یوسف راگل عصمت شگفت
یک الف باشد ردائے دوشِ رسوائیٔ ترا

حاکم لاہوری[2] نے اپنے تذکرہ میں ایک دوسرے مفتون کا بھی ذکر کیا
ہے جس کا نام رحیم بیگ تھا اس کے والد کابل سے آئے تھے ہندی[3] نے
ایک تیسرے مفتون کا ذکر اپنے تذکرہ میں کیا ہے جس کا نام محمد
لطف اللہ تھا اور وہ محمد نعیم نثار کا چھوٹا بھائی تھا جو بیس[24] سال
ہی کی عمر میں اس نے وفات پائی۔

[1،2] مردم دیدہ [3] سفینۂ ہندی ص ۲۰۳

ملاّ نتھو فصاحت

فصاحت کا ذکر فارسی تذکروں میں نایاب ہے راقم حروف کو صرف "مردم دیدہ" ہی میں اس کے کچھ حالات ملے لیکن دو سطر سے زیادہ نہیں۔ ایسی صورت میں ظاہر ہے کہ اس کے متعلق کیا لکھا جائے لیکن چونکہ وہ شاہ آفریں کا شاگرد تھا اس لیے اس کے حالات کی جستجو لازمی تھی۔ عبدالحکیم حاکم لاہوری[1] نے لکھا ہے کہ ملاّ نتھو جس کا تخلص فصاحت تھا شاہ آفریں لاہوری کا شاگرد تھا۔ جوانی ہی میں اس نے انتقال کیا چند سالوں تک وہ حاکم لاہوری کا رفیق رہا بہت تلاش اور جستجو کے باوجود فصاحت کا صرف ایک ہی شعر مل سکا لیکن اس شعر سے اس بات کا اظہار ہوتا ہے کہ فصاحت اسیر اور صائب جیسے باکمال شعراء کے اشعار پر شاہ آفریں کے اشعار کو ترجیح دیتا تھا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کو اپنے استاد شاہ آفریں سے ایسی شیفتگی اور عشق تھا کہ اس کے مقابلے میں مرزا صائب اصفہانی جیسے نامور شاعر کے اشعار کم نظر آتے تھے ذیل میں فصاحت کا وہ شعر قلمبند کیا جاتا ہے۔

کردم فراموش از دل شعر اسیر و صائب
تا خواندہ ام فصاحت دیوان آفریں را

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۷۹

حاجی بیگ ہنر

حاجی بیگ نام اور ہنر تخلص تھا اس کے والد بھی شاعر تھے اور تاجی تخلص کرتے تھے لیکن افسوس کہ ہنر کے احوال بھی تفصیل سے نہیں مل سکے۔ فارسی تذکروں میں اس کے حالات نہیں ملتے البتہ حاکم لاہوری سے اس کے دوستانہ تعلقات تھے اور وہ اکثر و بیشتر حاکم لاہوری کے مکان پر جاتا تھا۔ اس لئے اس نے اپنے تذکرہ میں ہنر کا ایک مختصر ذکر کیا ہے۔ اس نے لکھا ہے کہ وہ شاہ آفریں کا شاگرد تھا وہ خواجہ عبدالقہار کے والد خواجہ عبدالجبار کے قدیم دوستوں میں سے تھا خواجہ عبدالجبار کا خاندانی سلسلہ حضرت مخدوم آدم سے جا ملتا ہے زکریا قلی خاں پسر سعید قلی خان جو نواب دلیر جنگ کا بخشی تھا اس نے ہنر کے ساتھ مہربانی اور کفالت کی تھی حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ ہنر ہر فن میں صاحب سلیقہ تھا خصوصاً تیر اندازی اور فن انشا میں کمال رکھتا تھا وہ بہت زود گو شاعر تھا اس نے تھوڑے ہی دنوں میں اپنا دیوان مرتب کر لیا تھا جو آسان نہیں ہے حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ میں اس کے دیوان سے ایک شعر نقل کیا ہے جسے اس کے استاد شاہ آفریں نے بھی پسند کیا تھا ذیل میں وہ شعر لکھا جاتا ہے۔

از طرز خرام تو سراپا روش اعجاز   ہر گرد کہ برخاست زجا کبک دری بود

حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ ہنر نے محمد شاہ کے دور سلطنت کے اواخر میں انتقال کیا۔

۱۔ مردم دیدہ ص ۱۹۰

مرزا نصر اللہ بیگ یتیمؔ

نام مرزا نصر اللہ بیگ اور یتیمؔ تخلص تھا اگر حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر نہیں کیا ہوتا تو شعراء کی فہرست سے وہ ناپید ہو جاتا چونکہ وہ شاہ آفریں کا شاگرد تھا اس لئے اس نے اپنے تذکرہ میں اس کا ذکر کرنا مناسب سمجھا حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ یتیمؔ اکثر و بیشتر اس کے ساتھ رہتا تھا اور مشق سخن کرتا تھا اس کے والد منعم بیگ، زبردست خاں صوبہ دار لاہور کے ملازموں میں سے تھے اپنے والد کی وفات کے بعد شاہ آفریں کی صحبت اختیار کی تھی اور ان سے اصلاح لیتا تھا وہ اس وقت جوان، صاحب تلاش، بہت خوش فکر اور شجاع تھا لیکن اتفاق کی بات ہے کہ آخر عمر اس کو جنون کا عارضہ ہو گیا جس کا انجام یہ ہوا کہ وہ گلیوں میں سر و پا برہنہ پھرنے لگا تھوڑے دنوں کے بعد اس نے وفات پائی اگر وہ زندہ رہتا تو حاکم لاہوری کا بیان ہے کہ استاد کے مقام پر پہنچتا لیکن اس کی عمر نے وفا نہیں کی وہ بہت اشعار کہتا تھا ذیل میں دو شعر پر اکتفا کیا جاتا ہے[۱]

بہ شوق لعل لبش با شراب می سازم
دگر نہ من بہ یکے جام بنگ شہبازم

بے بر گیم چوں آئینہ بر خلق روشن است
قالغ بہ نان خشک زدہ مہمان ما

---

[۱] مردم دیدہ ص ۱۹۱

نور العین واقف

نور العین نام اور واقفؔ تخلص تھا اس کا شمار پنجاب کے شرفاء میں ہوتا تھا اس کے والد اور دادا بٹالہ کے قاضی تھے یہ بٹالہ لاہور کا ایک قصبہ ہے قدرت اللہ[1] نے اس کے والد کا نام قاضی امانت اللہ لکھا ہے خان آرزو کا بیان ہے کہ واقفؔ مختلف علوم و فنون میں دستگاہ رکھتا تھا اور اس نے نامور شعراء کے تتبع میں اشعار کہے ہیں اس نے خان آرزو کو بھی خط لکھا تھا اور اپنے اشعار کی اصلاح کی درخواست کی تھی لیکن خان آرزو نے انکار کیا تھا کہ وہ اس لائق نہیں ہے کہ اس کے اشعار کی اصلاح کرے لیکن اس کے باوجود واقفؔ نے اپنے کچھ اشعار اصلاح کی غرض سے خان آرزو کی خدمت میں بھیجے تھے خان آرزو کو اس کے اشعار دیکھ کر بہت خوشی ہوئی تھی اور اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر وہ اسی طرح مشق سخن کرتا رہے گا تو ایک دن بلند مقام پر پہنچے گا خان آرزو نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے کہ واقفؔ کی شخصیت اس دور میں غنیمت تھی[2]۔

بھگوان داس ہندی نے لکھا ہے کہ واقفؔ نے اوائل میں بندرابن داس خوشگو سے اصلاح لی تھی اور بعدہٗ شاہ آفریں لاہوری کی شاگردی میں داخل ہوا تھا لیکن اس کو ان دو استادوں سے تشفی نہیں ہوئی اس لیے

---

[1] نتائج الافکار ص۷۵۷ [2] مجمع النفائس بحوالہ مردم دیدہ ص۱۱۲ مطبوعہ

اس نے شیخ سعدی اور امیر خسرو کے دیوان کو اپنا رہنما بنا لیا تھا اور اسی روشنی میں شعر کہتا تھا ہندی سے اکثر و بیشتر اس کی ملاقاتیں ہوتی رہیں جیسا کہ خود ہندی نے اپنے تذکرہ میں لکھا ہے ہندی کے بیان سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ واقف بھی شاہ آفریں کے شاگردوں میں تھا اسی لیئے راقم حروف نے اس کی زندگی کے احوال قلمبند کرنا لازم سمجھا لیکن شاہ آفریں کے شاگرد حاکم لاہوری نے اپنے تذکرہ میں یہ بات نہیں لکھی ہے کہ واقف شاہ آفریں کا شاگرد تھا اس نے یہ ضرور لکھا ہے کہ اس کی پہلی ملاقات شاہ آفریں کے دولتکدہ پر ہوئی تھی بعدہٗ حاکم نے دعویٰ کیا ہے کہ واقف سے اس کے تعلقات کو اس وقت تک تیئس سال ہو چکے تھے جس وقت کہ اس نے اپنا تذکرہ ۱۱۶۶ھ میں تالیف کیا تھا کبھی کبھی واقف اس کے غریب خانہ پر بھی آتا تھا اور اسی طرح روز بروز دونوں کے درمیان اخلاص اور محبت بڑھتی گئی اور اکثر و بیشتر یہ دونوں ایک ساتھ بیٹھ کر مشق سخن کرتے تھے حاکم نے اس کے خصائل حمیدہ کی بھی بڑی تعریف کی ہے اور لکھا ہے کہ اس کے بیان سے قلم قاصر ہے اس کو علم و فضل ورثے میں ملا تھا اس کے اشعار میں افکار کی چمک اثر اور درد ہے اس نے بلند معانی، شستہ الفاظ اور پاکیزہ خیالات اپنے کلام میں باندھا ہے سلاست اور فصاحت بھی درجہ کمال پر ہے حاکم لاہوری نے[1] لکھا ہے کہ ایسے اشعار کہنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے خان آرزو نے اپنے تذکرہ مجمع النفائس میں میر شمس الدین فقیر

---

[1] مردم دیدہ

کی بہت تعریف کی ہے لیکن انصاف کی بات یہ ہے کہ واقفؔ کا مقابلہ فقیر دہلوی سے کیا جاسکتا ہے اور اس کو پنجاب کا شمس الدین کہنا چاہیئے۔

"از اوصاف حمیدہ و اخلاق او چہ بیان نماید کہ زبان قاصر است۔ حاصل کلام علم و فضل ارث خاندان اوست۔۔
۔۔۔۔۔ افکار آب دارش خیلی مؤثر و بہ درد است، معانی بلند و پاکیزہ و الفاظ شستہ و روانی کلامش روان را تازگی می بخشد بالفعل بایں طور شعر گفتن خاصہ اوست حد دیگرے نیست۔۔۔۔۔۔ لیکن انصاف ایں است کہ ایں عزیز روشن دل پنجاب است[1]"

قدرت اللہ نے بھی واقفؔ کی شاعری کی بہت تعریف کی ہے اس نے لکھا ہے کہ اس کے اشعار آبدار ہیں اور لولوئے شاہوار کی طرح ان میں چمک دمک پائی جاتی ہے اس کے کلام میں نزاکت خیال، دل پذیری، سوز و گداز، فصاحت اور بلاغت پائی جاتی ہے۔

"اشعار آبدارش قدر لولوئے شاہوار را کاستہ و خیالات نزاکت آیاتش گلشن گفتار را بہ رنگ تازہ آراستہ کلام دل پذیرش یکسر سوز و گداز است و افکار بے نظیرش بہ فصاحت و بلاغت[2]"

حاکمؔ لاہوری کا بیان ہے کہ واقفؔ کے دیوان میں قریباً چھ سات ہزار اشعار ہوں گے اس نے قصیدے بھی کہے ہیں اس کی ترجیع بند

---

[1] مردم دیدہ [2] نتائج الافکار ص ۷۵۷
۳۷۸

فصاحت اور درد کے کمال پر ہے۔ ایسی ترجیع بند قدماء میں سے کم ہی لوگوں نے کہی ہے غزل تو اس کی خاص چیز ہے اس نے رباعیاں بھی بہت خوب کہی ہیں اس کے اشعار ایسے ہیں جو قاری کے دل پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہتے اس کے کلام کی پختگی اور استادی درجۂ کمال پر ہے اس نے خود ذیل کے شعر میں اس بات کا اظہار کیا ہے کہ اس کی شاعری نہیں بلکہ نالے اور آہیں ہیں ظاہر ہے جس شاعر کا دل جتنا زیادہ غمناک اور پُرجوش ہوگا اس کی شاعری میں اسی قدر بلندی، اثر اور لطف پایا جائے گا۔

نالۂ چند کردہ ام موزوں　　　　نہ غزل نے قصیدہ دارم[1]

حاکم لاہوری رقمطراز ہے کہ واقف نہایت پرہیزگار اور سنت نبوی کی دل و جان سے پیروی کرنے والا تھا وہ لوگوں سے کم ملتا تھا مگر غرور سے خالی تھا اس کی شخصیت میں بے نیازی، آزادی اور دل کی امیری پائی جاتی ہے اپنے عہد میں وہ دوستی اور خلوص میں ممتاز تھا اس کی باتوں میں نرمی اور کم گوئی اس کی خاص صفت ہے حالانکہ ان کے عزیزوں اور رشتہ داروں کے خصائل ایسے نہیں تھے حاکم لاہوری نے لکھا ہے کہ وہ اس کے اعلیٰ اخلاق اور اخلاص کی وجہ سے اس کا غلام ہوگیا تھا واقف حاکم لاہوری کے دکن اور سورت کے سفر میں ساتھ تھا اور سورت ہی سے حاکم فریضۂ حج کے لئے روانہ ہوگیا تھا حاکم نے اس موقع پر واقف کو اپنے دل میں دعاء سے یاد کیا تھا کہ اللہ اس کو سلامتی

---

[1] مردم دیدہ ص ۱۱۵

کے ساتھ وطن پہنچائے اور اس کو بھی خانہ کعبہ اور حضور صلی اللہ علیہ و آلہ وسلم کے روضہ مبارک کی زیارت سے نوازے قدرت اللہ نے اپنے تذکرہ میں بھی حاکم لاہوری اور واقف کے سفر دکن اور سورت کا ذکر کیا ہے ہندی نے لکھا ہے کہ واقف کے دیوان میں قریباً دس ہزار اشعار ہوں گے قدرت اللہ نے لکھا ہے کہ واقف نے ۱۱۹۵ھ میں وفات پائی[1]۔

قبل اس کے کہ واقف کے کلام کا نمونہ نقل کیا جائے لازم ہے کہ ایک دوسرے واقف کا بھی مختصراً ذکر کر دیا جائے۔ ابوالحسن امیر الدین[2] نے لکھا ہے کہ واقف تخلص اور شاہ محمد نام تھا اس کے وطن کا علم مؤلف کو نہیں ہو سکا لیکن وہ اردو کا شاعر تھا ذیل میں نورالعین واقف کے چند اشعار نقل کیے جاتے ہیں۔

سیہ کرد از تغافل بسکہ چشمش روزگار ما
چو گرد سرمہ خیزد تیرہ در محشر غبار ما

بر سر وجد است دل تا تیغ او شد جلوہ گر
شور افزوں می شود از ماہ نو دیوانہ را

در قفس بسیار ناشادیم ما
از فراموشان صیادیم ما

ملک ما شد کوہ درد و دشت غم
وارث مجنون و فرہادیم ما

واقف ز دہان و کمر یار چہ پرسی
از ہیچ خبر نیست من ہیچ مداں را

---

[1] نتائج الافکار ص ۵۹ [2] مسرت افزا ص ۲۵۱

از اہل جہاں وضع جدائی دارم
عیش دگر از فیض خدائی دارم
شرمندۂ یک قطرہ نیم زیں دریا
مانند صدف رزق ہوائی دارم

عشق آمد و سینۂ مرا پر خوں کرد
ہوش از سر و صبر از دلم بیروں کرد
معذورم اگر ترا بگویم لیلےٰ
جانا چکنم غرض مرا مجنوں کرد

باب دہم

انتخابِ اشعار شاہ آفریںؔ لاہوری

(از مخطوطہ برٹش میوزیم)

کند ز اہل حسد کلکم آفریں فریاد
فغان زاغ بہ این کبک ہم نشیمن شد

(شاہ آفریںؔ)

خداوندا نگین کن دور بزم قدس نامم را
چو سطر آه عاشق سوز مضمون و کلامم را

نی کلکم نوایش پرده عغوز گوش غافل کن
ز انشکاری دل پخته گردان فکر خامم را

شکست کاسه اوج نشه اقبال مجنونست
و به شکن بشکن ستانهٔ بنواز جامم را

چه شبها سر نخسپ آرزو ماندم نومیدانی
مگردان خالی از فیض قبول خود سلامم را

بچشم نیکبختان چون الف بر تخته مستی
همایون فال گردان کبک کلک خوشخرامم را

شبان فقر را پروای چاوشی نمی باشد
که از من نفرت خلق است کافی اهتمامم را

دو عالم بوی گل بگرفت نشنیدم من غافل
شفای ده مزاجم را علاجی کن زکامم را

صفای وقت خواہم آب کشم از سیہ بختے
چو شبنم غوطہ دہ در چشمۂ خورشید شامم را
بہ رنگِ کوہکن بجز از محبت خود در چشم بد
کہ بخشند آفرین انجامِ سعی ناتمامم را

زد غوطہ پیش آں در دندان علن در آب
زاں لعل چوں عقیق ز غیرت بمن در آب
زاناں کہ جاں بتیغ تو مستانہ میزنند
لب تشنہ ماہی نزند خویشتن در آب
چوں شمع از جلال و جمال تو کار ماست
افروختن در آتش و وا سوختن در آب
چشم تر و بہار خیال تو دید نیست
گلبار موج جلوہ چو عکس چمن در آب
نا آشنا بحسن حقیقت شد آفریں
آموخت از حباب سفر در وطن در آب
ساقی عنب است در شرب مدام آفتاب
از کجا خالی شود لبریز جام آفتاب
در خمارم ماند و مستانہ از من بگذرد
آنکہ گرداند پئے ہر ذرہ جام آفتاب
داغ سودائے کلی دارم کہ از تمکین حسن
شبنم با غش نمیگیرد سلام آفتاب

شیر مست فیض عام او بود ذرات دهر
از کواکب زاں بلند افتاد نام آفتاب
هستی موهوم چوں برخاست معشوق است بس
رفتن صبح است پنداری سلام آفتاب
برق اهم شبنمی نگذاشت در گلزار دهر
مدتی شد زنجمن خالیست دام آفتاب
حبذا جوش صفائی وقت عالی فطرتاں
سیر دارد آفریں مهتاب بام آفتاب

زبیمهری دلم از کاوش غم ایمن است
داغ من چوں ماه نو کم کشتهٔ زیر ناخن است
ساز بی رنگت وحدت مختلف آهنگ اوست
یکصدا در خنده شادی گشت و غم در شیون است
مور را اقبال استغنا سلیمان میکند
نقش روی خاتم ما دل ز دنیا کندن است
سست وارد دست کبریائی تجرد مرد را
گل بجیب ما همیں دامن ز دنیا چیدن است
شد ز حرف سرد واعظ شعلهٔ شوقم بلند
آب چوں گل در مزاج آتش ما روغن است
میتواند کرد وا بند قبایت آفریں
سر بدقت بسته هر چند مضمون روشن است

از هجوم جلوه چون خورشید روپوش خوداست
شیشهٔ این باده پنداری کف جوش خوداست

باده ماکی میکند صرف رقیبان بشنود
قدر حسن خود نمیداند فراموش خوداست

دارد از خط بر کمین چون خنده چندین بسته خضر
چشمهٔ آب بقا از لعل نوش خوداست

بسکه وحشت شیوه ذاتیست در آئین حسن
شوخ من دائم زکاکل دام بر دوش خوداست

غنچه شد از تحفهٔ گلبانگ هم آواز خویش
بلبل ما بند دماغ از طبع خاموش خوداست

از فروغ حسن چون خورشید دارد پیرهن
او در آغوشی نمی آید هم آغوش خوداست

آفرین قدر جواهر خانهٔ صورت شکست
هر کرا از معنی روشن در گوش خوداست

حرف حق با مردم دنیا عبث باشد عبث
توتیای چشم نابینا عبث باشد عبث

نیست اگر در قرب صاحب مشربان اکثر فیض
قطره را آمیزش دریا عبث باشد عبث

مدعا فهم شکوه عالم افتاده کیست
ورنه سیر عالم بالا عبث باشد عبث

نیست در بازار دنیا حاصلی غیر از زیان
چون ندارد سود این سودا عبث باشد عبث
بی تکلف آفرین هر چند صحرا دلکشست
تا نباشد نشئه زین سودا عبث باشد عبث

گلشن خزان شد و دارد هنوز کین چه علاج
لبش ز سبزهٔ خط بر زد آستین چه علاج

خیال زلف تو چون سرنوشت جزو تن است
کجا روم ز کمند خط جبین چه علاج

فغان که خط بر خش تنگ کرد جای نگاه
فتاد کار چراغم بآستین چه علاج

ز جود قریب ترے رائی شناسے کیست
نداده اند ترا چشم پیش بین چه علاج

سیاه غمزه کله کج بتان شهر آشوب
گرفته اند حصار دل آفرین چه علاج

بر هستی موهوم خروش من و ما هیچ
کین بحث بود لاشئ و این چون و چرا هیچ

سودای تو پوچ است و لیلا من و ما هیچ
کین بود متاعیست خیالی و بها هیچ

سودا رسد از آئینه بهر وجه محال است
جز صدق نمی آید از اصحاب صفا هیچ

نااهل توانگر شده صاحب نظرا
چون قحبه که بسیار بزیبست و حیا هیچ

از نحس چه بینم آفرین از سعد چه حاصل
چون عاقبت کار بود چند و چها هیچ

مید هد فیض دگر مصحف رخسارهٔ صبح
سورهٔ نور بخوانید ز سیپارهٔ صبح

جز حقیقت نبود حاصل سودای مجاز
ره بخورشید برد هر که شد آوارهٔ صبح

رنج روشنگهر از ما نبود هیچ علاج
بخیه هرگز نپذیرد جگر پارهٔ صبح

آفتابیست خیال تو که دل مشرق اوست
سینه چاک من خون شده انگارهٔ صبح

حسن گل خواب فراموش کن چون شبنم
آفرین بہر کہ شود محو نظارۂ صبح

زموج رنگ شد از لبس رخ گلستان سرخ
زلالہ چون لب پان خوردہ شد خیابان سرخ
نہی زمستی شوق تو روی مستان سرخ
چنانکہ گل ز بہار و ز گل گلستان سرخ
دمی کہ سبز کند مقدمی نو بخت رقیب
زخون دیدہ کنم جیب تا بدامان سرخ
زتاب روی تو ہر قطرۂ عرق شفقی است
کہ دیدہ است پری خانۂ سلیمان سرخ
چو مستقیم شوی نقد آبرو از تست
کند ثبات قدم روی جنگجویان سرخ
سحر بجانہ گلگون رسید بستہ نگار
کف از حنا و رخ از بادہ و لب از پان سرخ
زشوق آن لب مے گون چنیں کہ میگویم
شود برنگ رگ لعل خارہ مژگان سرخ
زخاک تیرہ بحشر سفید رو خیزد
بخون آز و طمع ہر کہ کرد دندان سرخ
چہ مرشدانہ سخن گفت آفریں صائب
کہ عاقبت رگ گردن کند گریبان سرخ

تا چند آه شعله کشد یا علی مدد | ریزد ز هم چو شمع جسد یا علی مدد
موقوف یک بهار کرم ہیچو عنبر است | شد نامه ام سیاه مدد یا علی مدد
حسرت تمام چشم بدار الشفای تست | در دو لم یکی شده صد یا علی مدد
بر قست پیش من نفسے آرمیده | بیتابیم رساست مدد یا علی مدد

می نالد از ستمگری چرخ آفریں
جز تو بگو که داد دہد یا علی مدد

گر پذیرد رقمی از غم ہجراں کاغذ
موج سیماب شود با کف طوفاں کاغذ
می نوشتم غم دل ناله بفریاد آمد
گشت چوں پنبه ندافِ پریشاں کاغذ
پیر نیا نرا نرسد شعله در آغوش کشد
رقم شوق پذیرد بچه عنوان کاغذ
نامه ات آب نزد شعلهٔ سودای مرا
زده بر آتش مشتاق تو داماں کاغذ
جز طاؤس بود نامهٔ واکردهٔ ما
رنگ وصف تو زبس کرده گلستاں کاغذ
آفریں شکن دگر ناچه غبارا میگیرد
میکند زردی رنگ نور زافشاں کاغذ

دل زگرد غم برون آید بساماں غم مخور | میدہد بر تخم زیر خاک پنہاں غم مخور

مہربان خواہد شدن آن غمزہ نمرودکیش | بر خلیل دل شود آتش گلستان غم مخور
کربلا یعنی سرِ آنکو باقبال نیاز | میشود دار الشفای دردمندان غم مخور
گر بہار عمر باشد از نسیم وصل دوست | خار خار آرزو گردد گلستان غم مخور

آفریں دیدے چناں بگذشت ایام وصال
ہمچنیں روزی شام ہجراں غم مخور

گرچہ بی پرواست از تعمیر دلہا خضر خط
میکند کار مسیحا چشم بیمارش ہنوز
در شبہا زنگاہ کوئی او ہما بیگانہ است
تیغ بازی میکند ہر خار دیوارش ہنوز
گل کہ در خوبی سر آمد شد ز سبزان چمن
خواہد از بلبل دعا، از شوق دستارش ہنوز
نقد ہوش از مردم صاحب نظر چوں دزد شب
می برد در پردہ خط رخسارش ہنوز
آمد از خط حسن در خمیازۂ مستی بجاست
دیدن آئینہ باشد جام نیازش ہنوز
از شکنج حلقہ ہر مور خط عارضش
صبح صادقہا ست پنہاں در شب تارش ہنوز
دلنشیں تر سرو رعنائیش بود از حرف راست
میزند ناخن بدل پیچ ماندہ دستارش ہنوز

ہمچناں سودای دارد نہ تنہا آفریں | صائب بیدل بود از جان خریدارش ہنوز

محو عشقم وصل و ہجراں از من مجنوں مپرس
ماجرای درد و درماں از من مجنوں مپرس

مرکز پرکار شود اگر خال او مرا
قصهٔ مور و سلیماں از من مجنوں مپرس

دل طپیدن بیتو دائم یک سوار اشک و آه
سرگذشت برق و باراں از من مجنوں مپرس

لعل میگوں سرمه سا چشمی ز ہوشم برده است
از بدخشاں و صفاہاں از من مجنوں مپرس

نقد جاں و دل برند از دست بر ایماں زنند
دستبرد ناز خوباں از من مجنوں مپرس

ہمچو بلبل باعث فریاد ناگفتنی است
چوں گل از چاک گریباں از من مجنوں مپرس

زہر قاتل گر بدست افتد شکر پنداشتن
از معاش تلخکاماں از من مجنوں مپرس

آفریں نیک و بد امکاں چه داند مست عشق
از گل و خار گلستاں از من مجنوں مپرس

بیتو در بزم شب از بسکه درآیم بخروش
شمع از شعله سر انگشت گذارد در گوش

دم زدن پیش بزرگاں کل رسوائیہاست
در سحر شمع ہماں به که بماند خاموش

دم تواند زدن از حلقۂ اہل تجرید
باشد آنکس کہ بآئین گمان خانہ بدوش
خوش قمار لبست محبت بشہادت سوگند
مفت آن بسمل دل زندہ کہ سر باخت و ہوش
جز تغافل سرے سرکشی ماکس بست
آفریں کرد چو برخاست زجا چشم ہوش

زمیٔ زمستی شوقتوانس وجاں در رقص
زجام وجد وسماع تو قدسیاں در رقص
چناں بمہر ووفاتو عاشقاں در وجد
کہ آورند چو ذرات کاروان در رقص
بدیر چوں شوم از شوق دوست زمزمہ ساز
چہ جای پیر مغاں آدم بتاں در رقص
ہزار صورت دیوار را بوجد آرند
دمی کہ دست برآرند صوفیاں در رقص
بیا کہ جوشش دخردشش بہار تماشاست
زبسکہ شاخ بشاخ اند بلبلاں در رقص
زشوق تیغ تو ہر جاست طائری شد
برنگ ذرۂ روزن در آشیاں در رقص
بود چو ذرہ در آغوشش بر تو خورشید
زمقدم تو چو طاؤس بوستاں در رقص

زبسکه نظم تو رعنا ست آفرین دارد
طپیدن ز غصه حسودان و دوستان در رقص

کرم طبیب نشاطون بود بدیدن نبض
سزد که سنگ فلاخن کند طپیدن نبض

اشاره ایست که نظم زمانه از ضعفاست
چو عنکبوت بدیوار تن تنیدن نبض

میان ما و تو قاصد همین طپش کافیست
طبیب را خبری میدهد طپیدن نبض

ادب بود که پامال نیشتر سازد
ز شاه راه عدالت برون دویدن نبض

جهان زیاری عشاق آفرین برپاست
بلی فسرده شود خون ز آرمیدن نبض

نصیب روی نیکو شد بد روزگار خط — بیاض صبح شد همه پامال غبار خط
نباشد چاره جز تسلیم چون دشمن قوی افتد — عبث کار نیست با تیغ آمدن در کارزار خط
بود هر حلقه مو بر رخش چشم نگهبانی — مبادا حسن بیرون پا گذارد از حصار خط
پدید آمد تماشا ماده بالادست گردارد — برادران بیاض چهره افزود اعتبار خط
چراغ ناتوانی برفروزد ای گل که می آید — هجوم ناخوش آئین بی اثر تا ناگوار خط
بموسم نخل می بندد ثمر هر چند میدانم — بفریادم رسی ای بید رد پیش نوبهار خط
ز دام ناکساران حسن نتواند شدن وحشی — چو خون عاشق ناحق بود کبر اعتبار خط

گل شب بوی عیش زود باید آفرین چیدن
ز آمد بیشتر دارد گذشتن نوبهار خط

راه جعی که زند جلوهٔ مستانه لفظ | نقد معنی نستانند به بیگانه لفظ
زهر قاتل پی نافهم بود شهد سخن | نقط زنبور سیاه است بکاشانه لفظ
بوی دل سوختگی از سخنم می آید | ز آتش شوق بر شتد مگر دانهٔ لفظ
تا بمعنی رسد از خویش مسافر شده است | هر که مجنون شود از سیر پریخانهٔ لفظ
چون زند معنی پاکم ز نهان موج ظهور | در دایں صاف بود معنیٔ بیگانهٔ لفظ
شکوه یوسف صفت از سیلی اخوان دارد | گوهر معنیم از کرد سیمانهٔ لفظ
دام بر دوش بصیادیٔ معنی باشد | عرق آلود فقط جلوه مستانهٔ لفظ

آفریں طرز سخن داغ سراغم دارد
لفظ اگر خانهٔ معنی است کجا خانهٔ لفظ

کفر را ایمان کند اقبال شب بیدار شمع | از هجوم گریه آخر سبحه شد زنار شمع
سوختن افروختن بگریستن خندانشدن | یاد میگیرد ز مارندی ز خود بیزار شمع
گر همه پروانه باشم بیتو بر جاں میزند | شعله کوں نیش بظلم هیچا بار بار شمع
عشق سرگرم طلب سازد دل افسرده را | ناخن آتش کشاید عقده از رفتار شمع
حرف سوز شوق بزم او چو بنویسم جهد | آتش از هر سطر مکتوبم برنگ نار شمع

روز و شب چوں سایه دارد تیره روزم آفریں
میکند شوخی که انوار سیما کار شمع

با سوز ما مباد شود آشنا چراغ | بیتاب تر ز برق طپید در هوا چراغ
آتش نفس ز شعله وژولیده موز دود | در بزم تست کاسه بکف چو گدا چراغ
روشندلان ز خصم حذر بیش میکنند | در موج لرزه است ز بیم صبا چراغ
دود از تو بزم قالب بیجان شود مباد | دست دعا است از پر پروانها چراغ
تادیو ظلمت نکشد نور زهر وان | در پیش راه دار برای خدا چراغ

سالک نه دگر نه برافروخته است عشق — از نقش پای کرم روان جای چراغ
داماں فته آفت: هر هر چه میکند — آنرا که برفروخته از کبریا چراغ
نسیم صبح چوں نشود ماهتاب صبح — در بزم او چگونه شود خود نما چراغ
همدوش جلوه حسن کند عشق آفرین
پروانه حاضر است بود هر کجا چراغ

باذوق خلد غافلی از کوی یار حیف
قانع شدی بخس چمن از بهار حیف
تن پروریست مانع تعظیم جان ترا
غافل بهشت کرد شدی از سوار حیف
ظلم است رنج سعی چو ناکامی آورد
خون شد ترا اندیده دل از انتظار حیف
از بریت نفس شده سست و غافلی
فرسوده گشت دام و نکردی شکار حیف
فرسود پای سعی تو گر آفرین چه سود
کاری نساختی که بیاید بکار حیف

در هوای دوست ناشق تولا کرد عشق — یک قلم از ماسوا اول تبرا کرد عشق
با دو زلف عنبریں دامن کشان میرفت دوش — نشهٔ سودای مشتاقان دو بالا کرد عشق
ناله فرهاد و مجنوں همچناں بر میزند — بوالعجب هنگامها در کوه و صحرا کرد عشق
عینک از دیر و حرم مجو کیں جلوه الیست — هر کرا از سرمهٔ توفیق بینا کرد عشق
عالمی زیر و زبر گردید و یک محرم نداشت — درس غمهای ترا با خود آشنا کرد عشق

جلوه مشتاق تا بود آئینه پیدا کرد عشق　　هر چه پنهان داشت غرض ما کرد عشق
عقده ام نکشود حیرانم چه حکمت دیده است　　ورنه در یک لحظه حل صد معما عشق

مرده را گر زنده میکردی مسیحا آفرین
از زمین مرده احیای مسیحا کرد عشق

آستین بالد اگر آه من دل دردناک
چون عرق انجم ز روی چرخ خواهد کرد پاک
میکند گر این چنین تب جوشی شوقم هلاک
چون عرق از جسم بیرون آبها جوشد ز خاک
میکنم تار رگ یاقوت صرف بخیه اش
تیغ موج خنده آن لعل دل را کرد چاک
میخورد گر این چنین وحشت غزال از من
آسمانها را برنگ دام برچیند ز خاک
بسکه آزار آمد شد درد تو از رفته اینست
عضو عضو آفرین باشد دل اندیشه ناک

نزهٔ تو بود باعث ملال خیال　　که نیست دامن دیدن تو دست مال خیال
مآل رفعت دنیا تاسف آمد و بس　　دگر کسی که ثمر چیند از نهال خیال
خیال خانهٔ هستی فنا در آغوش است　　که لحظ لحظ خیالست پایمال خیال
ز سنگ تفرقه ایمن بود رسیدهٔ دوست　　که صبح وصل بود محشر زوال خیال
دل حلاوت باطن ز ما سوا بپرهیز　　ز گرد غیر مکدر مکن زلال خیال

تر دامن شوریده آفرین چکند
بحیرتی که نگنجد در آنجا ال خیال

ز چشم نشئهٔ بدمست نگاه آرزو دارم
خدنگ غمزه از مژگان سیاهی آرزو دارم
زکوٰة گنج بی پایان خوبی بوسه زان لب
اگر دایم نباشد گاه گاهی آرزو دارم
چراغ داغم از هر شعله جز خورشید نفروزد
چو شبنم شاهد زرین کلاهی آرزو دارم
نه در دل خطبهٔ داغ جنون بی سکه داغی
خراب افتاده ملکم بادشاهی آرزو دارم
سخن در قبضهٔ بی جمعیت خاطر نمی آید
پیٔ تسخیر این کشور سپاهی آرزو دارم
کجاست کشش قاصد شود شوقم که از غیرت
ز خود هم سوی او پنهان نگاهی آرزو دارم

چراغ انجمن مرتضا حسین و حسن — سرور سینهٔ خیر النساء حسین و حسن
صفای باطن ایمان ضیای دیدهٔ دین — صفای وقت رسول خدا حسین و حسن
بهار فیض و دم صبح هستی کونین — خمیر مایهٔ نشو و نما حسین و حسن
جفای عشق که نقد آزمای طاقتهاست — ندیده است کم از انبیا حسین و حسن
نفس بآئینه باد صبا بگل نکند — کشید آنچه ز دونان جفا حسین و حسن

هوای آل نبی آفرین دوائی تو بس
تو دردمندی و دار الشفای حسین و حسن

خوشا رندی که باشد صرف یزداں جان و مال او
بذکر نام حق چوں سبحہ گردد ماہ و سال او
شفق بر تجلی طرفہ گلگوں عارضی دیدم
نقشہا بر لب آتش آتش است از رنگ آل او
خوشا رندی کہ پوشد جامۂ پوشیدہ حالی را
زجیب دزد سر بروں نمی آرد زلال او
ترقیہای دونان با تنزل میزند چشمک
بد اختر چوں شرر باشد عروج او وبال او
نباشد در تجلی گاہ شوخی زہرۂ شیراں
سیاہے میکند دیدۂ ادیٔ ایمن غزال او
ندارد جام جم اقبال فیض آثار درویشے
شود زہر آب حسرت آبجواں در سفال او
بلاگرداں شوم قرباں روم گرد سرت گردم
ندارد آفریں الا ترا جمی بجال او

خواب گراں شد کن بیدارم باللہ باللہ
مستیٔ غفلت برد زکارم باللہ باللہ
صبح کہ اشکم سبحہ شمار ذ جسم بجود مہر تو کارد
بانگ برآرد نالۂ زارم باللہ باللہ
دشت سفید است از کف جو شم نیست حدے خاں
اشتر مست گشت مہارم باللہ باللہ

ہم تو رفیقم ہم تو شفیقم جز تو نباشد یار و رفیقم
خوار و نزارم بیدل زارم باللہ باللہ

نقد جہل بر باد نمودم ہی ہی بیداد نمودم
تخم نکشتم رفت بہارم باللہ باللہ

سعی فتوت پای ندارد ناخن ہمت دست ندارد
ہم تو کشای عقدۂ کارم باللہ باللہ

آفرین آمد از تو خطایم صرف تو باد اشیب و شبابم
غیر کہ باشد نہ بکہ آرم باللہ باللہ

ای جنس گراں قیمت دکان خدائے
سودائے تو شد سلسلہ جنبان خدائے

بی سایہ کند جلوہ نہانی کہ تو دارے
چو معنی باللفظ بہ بستان خدائے

ہر وحدت ذات بود معبود گواہ است
تصدیق تو شد حجت ایمان خدائے

نہ قصر فلک چون نشود یک پر طاؤس
نہ تیغ تو بود شمۂ ایوان خدائے

نکشود دری ہر دست بر دل تنگم
ہر چند زدم دست بدامان خدائے

برآفرین از فیض عنایت نظری کن
ای سرمہ کش دیدۂ کوران الٰہی

کتابیات

کتابیات

(۱) نشترِ عشق خدا بخش لائبریری پٹنہ
(۲) آتشکدہ مطبوعہ حاجی لطف علی بیگ آذر نولکشور
(۳) مخزن الغرائب قلمی حصہ اول علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی
(۴) مخزن الغرائب قلمی حصہ دوم علی احمد خاں ہاشمی سندیلوی
(۵) گل رعنا قلمی لچھمی نرائن شفیق خدا بخش لائبریری پٹنہ
(۶) عقد ثریا مطبوعہ مصحفی گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ
(۷) ماہنامہ نگار اگست ۱۹۶۲ء
(۸) مردم دیدہ مطبوعہ عبد الحکیم حاکم لاہوری چاپ دانشگاہ پنجاب
(۹) نتائج الافکار مطبوعہ محمد قدرت اللہ گوپاموی چاپ بمبئی
(۱۰) سفینۂ ہندی مطبوعہ بھگوان داس ہندی عطا کاکوی
(۱۱) ریاض العارفین از رضا قلی خاں ہدایت چاپ ایران
(۱۲) دیوان والہ داغستانی مسلم یونیورسٹی حبیب گنج سیکشن علی گڑھ
(۱۳) تواریخ اودھ مطبوعہ سید کمال الدین حیدر لکھنؤ یونیورسٹی
(۱۴) تذکرہ شعرائے اردو مطبوعہ امیر حسن دہلوی
(۱۵) مغل اور اردو مطبوعہ نصیر حسین خاں خیال
(۱۶) مجمع النفائس قلمی سراج الدین خاں آرزو خدا بخش لائبریری
(۱۷) سفینۂ خوشگو مطبوعہ بندرابن داس خوشگو مرتبہ عطا کاکوی
(۱۸) مقالات شبلی جلد پنجم مطبوعہ معارف اعظم گڑھ
(۱۹) تذکرہ بے نظیر مطبوعہ عبد الوہاب مطبوعہ الہ آباد

(۲۰) ید بیضا مطبوعہ آزاد بلگرامی	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۲۱) سرو آزاد مطبوعہ آزاد بلگرامی	گورنمنٹ اردو لائبریری	پٹنہ
(۲۲) تذکرہ ریاض الشعراء قلمی ۲۲۲ھ	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۲۳) دیوان خاقانی شیروانی	چاپ	تہران
(۲۴) کٹلاگ کتابخانہ مجلس شوری ملی		تہران
(۲۵) کٹلاگ کتابخانہ آقای جعفر سلطان القرائی		تبریز
(۲۶) کٹلاگ کتابخانہ دانشکدہ ادبیات		تہران
(۲۷) کٹلاگ کتابخانہ ،،		تہران
(۲۸) کٹلاگ کتابخانہ حاج ملک		تہران
(۲۹) دیوان آصف	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۳۰) دیوان فقیر	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۳۱) دیوان مشتاق	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۳۲) دیوان آزاد بلگرامی	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۳۳) دیوان آرزو	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۳۴) دیوان آذر	خدابخش لائبریری	پٹنہ
(۳۵) کلیات انوری مطبوعہ		نولکشور
(۳۶) دیوان اوحدی مراغہ ای		چاپ تہران
(۳۷) قصائد حکیم قاآنی مطبوعہ انوار احمدی پریس		الہ آباد
(۳۸) بیان خسرو مطبوعہ		لکھنؤ
(۳۹) دیوان ظہیر فاریابی		تہران
(۴۰) کلیات صائب مطبوعہ		تہران
(۴۱) دیوان حافظ مطبوعہ		مطبع نامی لکھنؤ
(۴۲) کٹلاگ بوڈلین لائبریری ۱۱۸۲ھ		خدابخش لائبریری

(۴۳) کلیات حزیں مطبوعہ — خدابخش لائبریری
(۴۴) مثنوی صورت حال قلمی گلشن علی جونپوری — برٹش میوزیم
(۴۵) انتخاب دیوان آقا محمد کاظم والہ — مطبوعہ اصفہان
(۴۶) تاریخ ادبیات ایران مترجم سید مبارز الدین رفعت ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
(۴۷) مرزا نامہ قلمی سید محمد والہ موسوی
(۴۸) دستور النظم قلمی سید محمد والہ موسوی — پٹنہ یونیورسٹی لائبریری
(۴۹) نجم الہدیٰ سید محمد والہ موسوی — ایشیاٹک سوسائٹی آف بنگال
(۵۰) تذکرہ صبح وطن سراج الدولہ اعظم مطبوعہ — مدراس
(۵۱) نگارستان سخن سید نورالحسن — لکھنؤ یونیورسٹی
(۵۲) دیوان والہ ہروی قلمی — خدابخش لائبریری
(۵۳) فرہنگ رشیدی ملا عبدالرشید — چاپ تہران
(۵۴) نگارستان فارس — مولانا محمد حسین آزاد
(۵۵) عہد اسلامی کا ہندوستان — ریاست علی ندوی
(۵۶) تاریخ ادبیات ایران در عہد جدید مترجم وہاج الدین کنتوری مطبوعہ انجمن ترقی اردو دہلی
(۵۷) گنج سخن جلد سوم ڈاکٹر ذبیح اللہ صفا — مطبوعہ تہران
(۵۸) تاریخ ایران — حزیں
(۵۹) تذکرۃ الاحوال شیخ حزیں — مطبوعہ لندن خدابخش
(۶۰) صنادید عجم مہدی حسین ناصری
(۶۱) گھنانند اور سوچھند کادیا دیا دھارا (بزبان ہندی) — مطبوعہ کاشی
(۶۲) دانشمند آذربائیجان محمد علی تربیت — مطبوعہ تہران
(۶۳) سفرنامہ ابن بطوطہ اردو مترجم رئیس احمد جعفری
(۶۴) تذکرہ روز روشن — مطبوعہ تہران
(۶۵) دلی کا دبستان شاعری ڈاکٹر نورالحسن ہاشمی — مطبوعہ لکھنؤ

(۶۶) گلشن گفتار مطبوعہ سید محمد ایم - اے

(۶۷) چمنستان شعراء مطبوعہ

(۶۸) گلشن بیخار مطبوعہ مصطفیٰ خاں شیفتہ

(۶۹) تذکرہ خوش نویساں مطبوعہ مولانا غلام محمد ہفت قلمی دہلوی

(۷۰) شعر فارسی و سلاطین و امراء مطبوعہ

(۷۱) تاریخ عماد الملک قلمی عبدالقادر خاں خدا بخش لائبریری

(۷۲) تاریخ عماد السعادت مطبوعہ غلام علی نقوی لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

(۷۳) تذکرہ شاعرات اردو - جمیل احمد ایم - اے

(۷۴) زنان سخنور جلد دوم مطبوعہ تہران علی اکبر مشیر سلیمی پٹنہ یونیورسٹی لائبریری

(۷۵) طبقات سخن محی الدین مبتلا فوٹو اسٹیٹ کاپی

(۷۶) خزانۂ عامرہ مطبوعہ آزاد بلگرامی پٹنہ یونیورسٹی لائبریری

(۷۷) تاریخ اودھ جلد اول و دوم مطبوعہ نجم الغنی خاں نولکشور

(۷۸) تاریخ مظفری محمد علی لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

(۷۹) بیگمات اودھ تصدق حسین لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

(۸۰) سب رس ریڈیو نمبر جنوری ۱۹۴۱ء

(۸۱) قاموس المشاہیر جلد اول - دوم مطبوعہ نظامی بدایونی ٹی۔ان۔بی کالج لائبریری

(۸۲) تذکرہ ہندی مطبوعہ مصحفی ہمدانی گورنمنٹ اردو لائبریری پٹنہ

(۸۳) صبح گلشن مطبوعہ سید علی حسن خدا بخش لائبریری

(۸۴) تاریخ فرخ آباد مطبوعہ مسٹر ولیم اروین مترجم حسین بخش لکھنؤ یونیورسٹی لائبریری

(۸۵) سالنامہ نگار ۱۹۶۴ء تذکروں کا تذکرہ نمبر

(۸۶) کلیات عرفی شیرازی چاپ تہران

(۸۷) شعر العجم فی الہند مطبوعہ ملتان

(۸۸) کلیات خسرو نولکشور پریس

(۸۹) دیوان بابافغانی — تہران

(۹۰) دیوان شفائی — تہران

(۹۱) دیوان کمال اسمٰعیل — تہران

(۹۲) سخن شعراء — مطبوعہ

(۹۳) تذکرہ نسوان ہند — مطبوعہ فصیح الدین بلخی

(۹۴) تذکرہ حزیں اردو — منشی غلام حسین آفاقی بنارسی

(۹۵) نزہتہ القلوب — مطبوعہ ہولینڈ سنہ ۱۹۱۳ء خدابخش

(۹۶) فرہنگ لغات عامیانہ — سید محمد علی جمالزادہ

(۹۷) فرہنگ عمید حسن عمید — چاپ تہران

(۹۸) فرہنگ آنند راج

(۹۹) حالات حزیں — حبیب الرحمن شیروانی

(۱۰۰) تحولات فکری در ایران ابوذر صداقت — مطبوعہ تہران

(۱۰۱) تاریخ ایران دوم تالیف ژنرال سرپرسی سایکس
ترجمہ سید محمد تقی فخر داعی گیلانی — مطبوعہ تہران

(۱۰۲) کٹلاگ بوہار سیکشن نیشنل لائبریری — کلکتہ جلد اول

(۱۰۳) تذکرہ نویسی فارسی در ہند و پاکستان ڈاکٹر سید علی رضا نقوی

(۱۰۴) مجلہ دانشکدہ ادبیات مشہد شمارہ ۵ سنہ ۱۳۴۳ھ خورشیدی

(۱۰۵) رباعیات ابوسعید ابوالخیر — مطبوعہ لاہور

(۱۰۶) رباعیات عمر خیام — مطبوعہ نولکشور

(۱۰۷) دیوان عرفی شیرازی — مطبوعہ نولکشور

(۱۰۸) دیوان فیضی — مطبوعہ نولکشور

(۱۰۹) دیوان حزیں — مطبوعہ تہران

(۱۱۰) دیوان کامل امیر خسرو — مطبوعہ تہران

(۱۱۱) دیوان صائب — مطبوعہ تہران

(۱۱۲) دیوان امیر خسرو وسط الحیوۃ — مطبوعہ نولکشور

(۱۱۳) کلیات سعدی — مطبوعہ

(۱۱۴) دیوان حافظ — مطبوعہ نولکشور پریس

(۱۱۵) دیوان حافظ عکسی — مطبوعہ تہران

(۱۱۶) خلاصۂ شعر العجم جلد اول تا پنجم

(۱۱۷) شعر العجم جلد اول تا پنجم

(۱۱۸) دیوان غالب

(۱۱۹) دیوان صحائف شرائف — محمد عسکری بلگرامی

(۱۲۰) خلاصۃ الافکار قلمی ابو طالب — خدابخش لائبریری

(۱۲۱) تذکرہ حسینی قلمی و مطبوعہ حسین دوست — خدابخش لائبریری

(۱۲۲) مجمع الفصحاء اول۔ دوم رضا قلی خاں — ہدایت مطبوعہ

(۱۲۳) مجمع الفصحاء اول۔ دوم رضا قلی خاں — ہدایت مطبوعہ گیلان

(۱۲۴) رہنمائے دہلی مطبوعہ — خدابخش لائبریری

(۱۲۵) تاریخ محمد شاہی قلمی محمد بخش کوکلتاش آشوب

(۱۲۶) مثنوی والہ و سلطان قلمی فقیر دہلوی — خدابخش لائبریری

(۱۲۷) ریحانۃ الادب جلد چہارم از محمد علی تبریزی چاپ ایران دانشگاہ پٹنہ

(۱۲۸) سفینۃ المحمود از محمود میرزا قاچار چاپ تبریز کتابخانہ پروفیسر سید حسن

(۱۲۹) تذکرہ اختر از احمد گرجی اختر چاپ تبریز کتابخانہ پروفیسر سید حسن

(۱۳۰) نگارستان دارا از عبد الرزاق مفتون چاپ تبریز کتابخانہ پروفیسر سید حسن

(۱۳۱) مصطبہ خراب از احمد قاچار خراب چاپ تبریز کتابخانہ پروفیسر سید حسن

(۱۳۲) مجلہ ارمغان شمارہ پنجم مرداد ماہ ۱۳۵۱ — چاپ تہران

(۱۳۳) منتخبات اشعار والہ اصفہانی کتابخانہ مجلس شوری ملی — تہران

(۱۳۴) دیوان آقا محمد کاظم والہ اصفہانی پروفیسر ہمائی — چاپ اصفہان

(۱۳۵) مآثر الامراء جلد اول تا چہارم شاہنواز خاں — ٹی۔این۔بی کالج بھاگلپور

(۱۳۶) احوال وافکار و آثار علی قلی خان والہ داغستانی — ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

(۱۳۷) احوال وافکار و آثار آقا محمد کاظم والہ اصفہانی — ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

(۱۳۸) احوال وافکار و آثار میر شمس الدین فقیر عباسی دہلوی — ڈاکٹر محمد شہاب الدین

(۱۳۹) گلچینی از دیوان آقا محمد کاظم والہ اصفہانی مطبوعہ مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

(۱۴۰) عہد محمد شاہی کے چند فارسی شعراء مطبوعہ مرتبہ ڈاکٹر عبدالغفار انصاری

(۱۴۱) انتخاب کلیات سودا دہلوی — مطبوعہ سنہ ۱۹۲۶ء ٹی۔ان۔بی کالج بھاگلپور

(۱۴۲) تاریخ ادب اردو — مطبوعہ رام بابو سکسینہ

(۱۴۳) سیر المتاخرین مطبوعہ منشی غلام حسین خان طباطبائی ٹی۔ان۔بی کالج بھاگلپور

(۱۴۴) تذکرہ مسرت افزا اردو ترجمہ مطبوعہ مترجم ڈاکٹر مجیب قریشی

(۱۴۵) ہماری آزادی کی کہانی مطبوعہ لاہور — عشرت رحمانی

(۱۴۶) دیوان شاہ آفریں — برٹش میوزیم لندن (عکسی)

Cat. The British Museum vol. I Dr. Rieu (۱۴۷)

Cat. The British Museum vol. II Dr. Rieu (۱۴۸)

Cat. The British Museum vol III Dr. Rieu (۱۴۹)

Cat. The Kings of oudh Library Dr. Sprenger (۱۵۰)

Cat. Khuda Bukhsh oriental Library - A. Muqtadir (۱۵۱)

Cat. India office Library vol. I Dr. Ethe (۱۵۲)

The first two Nawabs of oudh - Dr. A. Lall (۱۵۳)

The Cambridge History of India (۱۵۴)

A Literary History of Persia by E. G. Browne I-IV (۱۵۵)

The fall of Mughal Empire. (۱۵۶)

The oriental biographical dictionary by T. W. Beale, London, 1894 (۱۵۷)

شناسنامۂ مؤلف

نام: ڈاکٹر محمد عرفان
والد کا نام: حاجی عبدالرحمٰن مرحوم و مغفور بن شیخ عظیم اللہ مرحوم و مغفور
والدہ کا نام: بی بی قائلہ خاتون
تاریخ پیدائش و جائے ولادت: ۹ر جنوری ۱۹۴۱ء بمقام موضع چک نتھو بھانہ سنہولہ ضلع بھاگل پور (بہار)
تعلیم ابتدائی: اردو پرائمری اسکول چک نتھو میں ابتدائی تعلیم اپنے چچا محترم محمد تاج الدین مرحوم و مغفور اور ماسٹر محی الدین سے درجہ پنجم تک۔
بعدہٗ مدرسہ شمسیہ گرگاواں میں وسطانیہ اوّل سے فوقانیہ تک۔ مندرجہ ذیل استادوں سے وہاں استفادہ کیا:
(۱) مولانا رمضان علی مرحوم و مغفور (۲) الحاج مولانا عبدالمجید مرحوم و مغفور (۳) مولوی شمس الحق لوچنی (۴) مولوی عبدالرشید کدمہ اور (۵) مولوی اشفاق گرگاواں۔
میٹرکولیشن: ہائی اسکول پرسا، سنتھال پرگنہ سے ۱۹۵۸ء میں فرسٹ ڈویژن سے۔
آئی۔ اے: ٹی۔ این۔ جے کالج بھاگل پور سے ۱۹۶۰ء میں سکنڈ ڈویژن سے۔
بی۔ اے آنرز فارسی: ٹی۔ این۔ بی کالج بھاگل پور سے ۱۹۶۲ء میں فرسٹ کلاس فرسٹ (گولڈ میڈلسٹ)

ایم۔ اے فارسی: پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۴ء میں فرسٹ کلاس میں تھرڈ پوزیشن۔
پی۔ایچ۔ڈی: بھاگل پور یونیورسٹی سے زیر نگرانی ڈاکٹر عبدالغفار انصاری صدر شعبۂ فارسی، بھاگل پور یونیورسٹی، مئی ۱۹۸۱ء میں۔
عنوان: احوال و افکار و آثار شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری۔
ازدواج: بی بی نسیمہ خاتون بنت ماسٹر کرامت حسین موضع انجنا تھانہ میرگاؤں ضلع گڈّا (سنتھال پرگنہ)
اولاد: محمد شاہد رضوان وحید، عذرا خاتون، محمد مجاہد رضوان، محمد خالد رضوان، بے بی ناز بیگم، گلشن آرا، رضوانہ خاتون اور ریحانہ خاتون۔
ملازمت: ۵ر اگست ۱۹۶۴ء سے ۱۹۶۶ء تک ہائی اسکول پرسا میں بحیثیت ٹیچر۔
لکچرار: شعبۂ فارسی ٹی۔این۔بی کالج بھاگل پور میں فقط تین ماہ Leave vacancy پر۔
لکچرار: ملت کالج پرسا میں بحیثیت لکچرار فارسی ۱۹۶۸ء تا ۱۹۷۱ء (مجوزہ ملت کالج پرسا تا انٹرمیڈیٹ)
۱۹۷۱ء تا ۱۹۷۴ء بھاگل پور یونیورسٹی سنڈیکیٹ سے منظور شدہ انٹر کالج (ملت کالج پرسا) میں ۱۹۷۴ء تا ۱۹۷۹ء بہار سرکار سے منظور شدہ انٹر کالج (ملت کالج پرسا) میں۔
۱۹۷۹ء تا ۱۰ر نومبر ۱۹۸۵ء ڈگری کالج افیلیٹڈ (ملت کالج پرسا) میں۔
۱۱ر نومبر ۱۹۸۵ء سے تا حال ملت کالج پرسا میں جو بھاگل پور یونیورسٹی کا ایک کنسٹی ٹیوٹ (Constitute) کالج ہے۔

مختصر احوال زندگی

راقم حروف نے کالج کی تعلیم ٹی۔ این۔ جے اور ٹی۔ این۔ بی کالج شہر بھاگل پور میں حاصل کی۔ جناب پروفیسر سید صدر الدین احمد مرحوم سابق صدر شعبۂ فارسی ٹی۔ این۔ بی کالج اور سابق پرنسپل انچارج ٹی۔ این۔ بی کالج اور ڈاکٹر عبد الغفار انصاری صدر شعبۂ فارسی بھاگل پور یونیورسٹی سے فارسی کی تعلیم حاصل کی۔ جناب پروفیسر عبد الاحد مرحوم سابق صدر شعبۂ اردو ٹی۔ این۔ بی کالج اور ایکٹنگ پرنسپل ٹی۔ این۔ بی کالج سے اور الحاج ڈاکٹر احمد حسن سے اردو کی کتابیں پڑھیں۔ جناب پروفیسر ابو نصر سابق صدر شعبۂ انگریزی ٹی۔ این۔ بی کالج اور جناب پروفیسر ڈاکٹر محمد قمر التوحید سابق لکچرار و سابق ریڈر شعبۂ انگریزی و سابق وائس چانسلر بھاگل پور یونیورسٹی اور میتھلا یونیورسٹی سے انگریزی میں اکتساب علم کیا۔

یونیورسٹی کی تعلیم: میں نے پٹنہ یونیورسٹی سے ۱۹۶۴ء میں فارسی میں ایم۔ اے کیا۔ اس وقت جناب پروفیسر سید شاہ عطاء الرحمٰن عطا کاکوی صدر شعبہ تھے بعدہٗ پروفیسر سید حسن صدر شعبہ ہوئے۔ ان دونوں حضرات کے علاوہ راقم حروف نے پروفیسر افسر الدولہ فیاض الدین حیدر اور ڈاکٹر زبیر احمد قمر سے بھی کتابیں پڑھیں

میرے والد محترم مجھے مدرسہ عزیزیہ بہار شریف میں مدرسہ کی اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل کرانا چاہتے تھے لیکن میرے بہنوئی محترم ڈاکٹر ممتاز نے میرا اور میرے چچازاد بھائی رفیق کا داخلہ ہائی اسکول برسائیں کرادیا۔ میں نے اسی اسکول سے میٹریکولیشن پاس کیا۔ یہاں مجیب الحق ہیڈ ماسٹر، الحاج ماسٹر محمد تمیز الدین، شری بینائک چودھری، جوتش پرشاد مصر اور مولوی قطب الدین سے میں نے پڑھا۔

میری والدہ محترمہ اور بڑی بہن بی بی فاطمہ خاتون نے کالج کی تعلیم کے دوران میری بڑی حوصلہ افزائی کی اور مجھ پر نگاہ کرم رکھی۔ ۱۹۵۹ء سے میری تعلیم کی ذمہ داری میرے بڑے بھائی عبدالکریم اسلم پر آگئی کیونکہ والد محترم کی آمدنی مختصر تھی! دوران تعلیم پٹنہ میں میرا قیام اقبال ہوسٹل میں تھا جہاں پروفیسر ڈاکٹر مطیع الرحمن سپرنٹنڈنٹ تھے۔ ڈاکٹر سوید رجسٹرار بھاگل پور، یونیورسٹی بھی اقبال ہوسٹل میں تھے۔

ملت کالج پرسا میں بحیثیت پرنسپل ۹ر جولائی ۱۹۷۲ء سے ہوں اور میں نے اس کالج کی تعمیر و ترقی کے لئے بڑی تگ و دو کی ہے۔ کالج کی موجودہ عمارت چندہ حاصل کرکے میری نگرانی میں بنائی گئی ہے۔ اس کالج کو افیلیئیٹڈ (Affiliated) اور کنسٹی ٹیوٹ (Constitute) کرانے میں ہر طرح کی قربانی دی ہے۔ مجھے دوسرے اچھے کالجوں میں لکچرار کی جگہ مل سکتی تھی لیکن میں نے اس کالج کی ترقی کے لئے سب کچھ فراموش کیا۔ اس کالج کی ترقی کے لئے، کالج کی ترقی و بہبودی کو میں نے اپنی ذاتی ترقی سمجھ لیا تھا کیونکہ یہ میرے علاقے اور گاؤں کا کالج ہے۔ لیکن ایک ایسا موقع بھی میری زندگی میں آیا کہ بعض لوگوں نے مجھے بدنام کرنے کی کوشش کی تب میں نے سمجھا کہ کالج کی ترقی کے لئے جو خون جگر میں نے دئیے ہیں اس کا یہی صلہ ہے۔

ہمیں معلوم ہے خدمت میں بدنامی بھی ہوتی ہے
کہ اس میں خوبیوں کے ساتھ یہ خامی بھی ہوتی ہے
مگر میری نظر ہے عاقبت کی کامیابی پر!
یہ دنیا ہے، یہاں مقصد میں ناکامی بھی ہوتی ہے

مجھے امید ہے کہ آنے والی نسل ضرور میری محنتوں اور کوششوں کو یاد کرے گی ——!

میرے طلباء کی تعداد ہزاروں پر مشتمل ہے اور اُن میں سے بہت سے لوگ کسی نہ کسی عہدہ پر کام کر رہے ہیں۔ میرے مخصوص شاگردوں کے نام یہ ہیں :

(۱) اشفاق احمد، لکچرار ملت کالج پرسا (سنتھال پرگنہ) ________

(۲) راجندر پرشاد ساہ، ملّت کالج پرسا (سنتھال پرگنہ) ________

(۳) محمد سلیم، ________ ملّت کالج پرسا (سنتھال پرگنہ) ________

(۴) تنویر عالم انجینیر (۵) وحید الزماں انجینیر (۶) لیسین انجینیر (۷) اظہر انجینیر (۸) اختر انجینیر (۹) ایوب انجینیر (۱۰) ضیاء الحق انجینیر (۱۱) ہلال الدین انجینیر (۱۲) ڈاکٹر خلیل (۱۳) ڈاکٹر افتخار (۱۴) ڈاکٹر رام جی بھگت (۱۵) طاہر حسین لکچرار۔

ڈاکٹر پروفیسر قمر التوحید۔ مولانا ثمین الدین ایم پی مرحوم و مغفور اور ڈاکٹر مظفر اقبال صدر شعبۂ اردو بھاگل پور یونیورسٹی، ہمارے کالج کے سکریٹری رہ چکے ہیں اور ان حضرات کے ساتھ کام کرنے کا مجھے موقع ملا ہے۔ اس کالج کی تعمیر و ترقی میں جن حضرات نے معاونت کی ہے میں ان کا تہہِ دل سے مشکور ہوں۔

میں ۱۹۷۵ء کے وسط میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے بہت بے چین اور متفکر تھا۔ اس سلسلے میں، میں نے استاد محترم ڈاکٹر عبد الغفار انصاری سے ملاقات کی اور مقصد کا اظہار کیا۔ انھوں نے ڈانٹ کر مجھے کہا کہ آپ اتنی مدت سے کہاں تھے۔ آج نیند ٹوٹی ہے؟ میں نے بہت ادب سے کہا کہ واقعی بہت سال گذر گئے لیکن اب پی۔ ایچ۔ ڈی کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ بہرحال، انھوں نے مجھ پر بڑا کرم کیا کہ مقالہ کی رہنمائی و نگرانی کے لیے راضی ہو گئے! اللہ کا شکر ہے کہ ۱۹۸۱ء کے مئی میں مجھے بھاگل پور یونیورسٹی نے شاہ فقیر اللہ آفریں لاہوری پر پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری عطا کی جو کتابی شکل میں آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

تھا ضبط بہت مشکل اس سیلِ معانی کا
کہہ ڈالے قلندر نے اسرارِ کتاب آخر

(علامہ اقبالؒ)

Life and Works

OF

SHAH FAQUIRULLAH AFRIN LAHORI

By

Dr. MOHAMMAD IRFAN
M. A; Ph. D.
PRINCIPAL MILLAT COLLEGE
PARSA
Santhal Pargana (BIHAR)

Price Rs. 75-00

NIKHAR PUBLICATIONS
MAUNATH BHANJAN (U.P.) 275101